Contribution of Abdul Sattar Dalvi in the Academic, Literary and Linguistic Works

Thesis

Submitted to the University of Hyderabad in partial fulfillment of requirements for the award of the degree of Doctor of Philosophy in Urdu

June 2018

Submitted by

RAYEESA BEGUM

M.A. (Integrated), M.Phil

Supervised by

Dr. NISHATH AHMED

Assistant Professor

Department of Urdu

University of Hyderabad

DEPARTMENT OF URDU

SCHOOL OF HUMANITIES

UNIVERSITY OF HYDERABAD

HYDERABAD-500046

عبدالستار دلوی کی علمی وادبی ولسانی خدمات

مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی (اُردو)

جون 2018ء

مقالہ نگار

رئیسہ بیگم

ایم۔اے (انٹی گریٹیڈ) ایم۔فل

نگران

ڈاکٹر نشاط احمد

اسسٹنٹ پروفیسر

شعبۂ اُردو، یونی ورسٹی آف حیدرآباد

شعبۂ اُردو

اسکول آف ہیومانیٹیز

یونی ورسٹی آف حیدرآباد۔۵۰۰۰۴۶

پروفیسر عبدالستار دلوی

فہرست ابواب

	حرف آغاز	3-9
باب اول	: شہر ممبئی کا مجموعی پس منظر	10-27
باب دوم	: عبدالستار دلوی: حیات، شخصیت اور ماحول	28-63
باب سوم	: عبدالستار دلوی کی علمی خدمات	64-112
باب چہارم	: عبدالستار دلوی کی ادبی خدمات	113-351
باب پنجم	: عبدالستار دلوی کی لسانی خدمات	352-412
	ماحصل	413-421
	مطالعہ جاتی کتب	422-445

حرف آغاز

الحمداللہ! کہ میرا تحقیقی مقالہ مکمل ہوگیا۔ دراصل تحقیق ایک صبر آزما اور محنت طلب کام ہے اور اس کام کو انجام دینے کے لیے محقق کو بھی صابر، محنتی اور غیر روادار جیسے اوصاف کا حامل ہونا پڑتا ہے جو محقق کو دوران تحقیق دشوار گذار مراحل میں ثابت قدم رہتے ہوئے تحقیق کو مکمل کرنے میں مدد دیتے ہیں اور تکمیل کے بعد جب محقق اپنی تحقیق کو دیکھتا ہے تو اس کی مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا، لہٰذا اس وقت مجھے بھی بے انتہا مسرت ہورہی ہے کہ میری ڈاکٹر کہلانے کی خواہش عنقریب پوری ہونے کو ہے۔

کسی بھی انسان کی زندگی میں ایک ایسا موڑ آتا ہے جہاں سے اس کی زندگی ایک نئی سمت لے لیتی ہے اور میری زندگی کا یہ موڑ اپنے لیے انٹی گریٹیڈ ماسٹر پروگرام (پانچ سالہ کورس) کا انتخاب ہے، اس کورس میں مجھے نئے نئے مضامین(Subjects)جیسے Linguistics, Comparative Literature, Environmental Science, IT اورTranslation پڑھائے گئے جن سے میرے علم میں اضافہ ہوا اور میری سوچ میں وسعت پیدا ہوئی لیکن کورس کے دوران دشواریاں بھی آئیں، مگر ہمارے کورس کوآرڈینیٹر اُستادِ محترم پروفیسر مظفر علی شہ میری نے مجھے ہمیشہ حوصلہ اور ہمت دی، ثابت قدم رہنے کی تلقین کی کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ اس مخصوص کورس کی تکمیل تک مجھ میں کتنی صلاحیتیں اور خود اعتمادی جنم لے چکی ہونگی لیکن وہ استاد ہیں اسی لیے اپنی دوررس نگاہوں سے میرا روشن مستقبل دیکھ رہے تھے اور میں اپنی محدود فکر وسوچ کے چلتے صرف اور صرف موجودہ دشواریوں سے راہ فرار تلاش کر رہی تھی، ان چند دشواریوں کے باوجود میں نے اپنا کورس امتیازی نشانات سے کامیاب کرکے ''یونی ورسٹی میڈل'' حاصل کرلیا تو میرے اندر خود اعتمادی اور اُردو ادب سے دلچسپی پیدا ہوچکی تھی اور اسی خود اعتمادی اور ادب سے دلچسپی نے مجھے تحقیق کی طرف متوجہ کیا، لہٰذا مجھے ایم۔فل اُردو کے لیے ہونے والے انٹرنس ٹسٹ اور انٹرویو میں مقام اول ملا اور داخلے کے لیے اہل قرار دیا گیا تو میں نے اپنی محنت، لگن، جستجو اور ا

ستادمحترم ونگراں کار پروفیسر مظفرعلی شہ میری کی رہنمائی میں اپنا ایم۔فل اردو بہ موضوع ''قاضی مشتاق احمد بحیثیت افسانہ نگار'' پر مقررہ وقت میں مکمل کرلیا اور اپنے آپ کو ماسٹر آف فلاسفی کی ڈگری کے ساتھ ساتھ گیان چند جین میڈل اور اختر حسن میموریل میڈل کے لیے مستحق ثابت کیا۔

انٹی گریٹیڈ ایم۔اے اُردو اور ایم۔فل اردو کی کامیابیوں نے مجھے پی ایچ۔ڈی کی سنجیدہ تحقیق پر آمادہ کیا تو میں نے بھی اسی محنت اور لگن سے پی ایچ۔ڈی اُردو میں داخلہ حاصل کرلیا اور موضوع کی تلاش میں سرگرداں رہی، کئی موضوعات پر غور کیا مگر کوئی بھی موضوع قابل قبول نہیں ٹھہرا، اس کے بعد میں نے اُردو ادب کا مطالعہ ''موضوع کے انتخاب'' کے Point of Reference کے تحت کیا تو میری نظر انتخاب ''پروفیسر عبدالستار دلوی'' پر ٹک گئی کیوں کہ آپ نے علم لسانیات پر لکھا ہے اور مجھے لسانیات سے دلچسپی ہے، آپ نے ترجمے کیے ہیں اور مجھے ترجمے کا ذوق ہے، آپ نے تحقیق وتنقید میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں اور بقول اساتذہ شعبہ اُردو یونی ورسٹی آف حیدرآباد، مجھ میں تحقیقی وتنقیدی نظر ہے، لہٰذا میں نے پروفیسر عبدالستار دلوی کو موضوع تحقیق بنانے (ذاتی دلچسپیوں کی بناء پر) کا اردہ کرلیا، استاد محترم پروفیسر مظفر علی شہ میری نے بھی اس کی تائید کی، مگر پروفیسر عبدالستار دلوی اور سیلکشن کمیٹی کی منظوری حاصل کرنے میں چند دشواریاں بھی حائل رہیں لیکن حاصل نتیجہ میرے حق میں رہا۔

موضوع تحقیق کے بعد تحقیق کا سب سے اہم مرحلہ مواد کی فراہمی ہے کیوں کہ اس مرحلے میں محقق کی یا تو تحقیق سے دلچسپی پیدا ہوجاتی ہے یا پھر خاطر خواہ مواد نہ ملنے پر موضوع سے دوری یا بیزاری کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے مگر الحمداللہ! میرے لیے یہ مرحلہ موضوع سے دلچسپی اور جوش دلانے والا رہا کیوں کہ مواد کی فراہمی کا سب سے مستند ذریعہ خود پروفیسر عبدالستار دلوی ہی تھے جنہوں نے ابتداء تا اختتام تحقیق کے ہر دشوار مرحلے میں میری مدد فرمائی، مفید مشوروں سے نوازا اور وقتاً فوقتاً علمی وادبی موضوعات پر تبادلہ خیال کیا ہے جس کے لیے میں ہمیشہ آپ کی مشکور رہوں گی۔

مواد کی فراہمی کا یہ مرحلہ اتنی آسانی سے سر ہونے والا بھی نہ تھا کیوں کہ پروفیسر عبدالستار دلوی مسلسل چھ

دہائیوں سے اپنا زورِ قلم آزمارہے ہیں جس کا لازمی نتیجہ تھا کہ آپ متعدد تصانیف کے مرتب، محقق، نقاد اور مترجم کے ساتھ ساتھ متعدد مختلف النواع مضامین کے مصنف بھی ہیں، جن کی تلاش میں، میں نے مختلف لائبریریوں بالخصوص Back Volumes کی خاک چھانی ہے اور حاصل محنت کے طور پر میں نے آپ کی زیادہ تر کتابیں اور مضامین جمع کر لیں تھیں لیکن آپ کی مرتبہ تصانیف ''امرت بانی'' تلاش و جستجو کے بعد بھی دستیاب نہیں ہو پا رہی تھی مگر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور لائبریری کے لائبریرین جناب سید محمد طاہر نے اسے اپنی لائبریری میں تلاش کر کے مہیا کروائی، اس کے علاوہ پروفیسر عبدالستار دلوی کی سرگرمیوں سے بھی ہمیشہ مجھے باخبر کرتے رہے جس کے لیے میں جناب سید محمد طاہر کی ممنون ہوں۔

محترم شاہد عمادی کا تعلق بھی بمبئی کے اسی ماحول سے ہے جس کا اثر پروفیسر عبدالستار دلوی نے قبول کیا ہے اسی لیے پروفیسر عبدالستار دلوی پر اثر انداز ہونے والے اس ماحول کو سمجھنے اور جاننے کے لیے میں نے محترم شاہد عمادی سے تبادلہ خیال کیا تو انہوں نے میرے ساتھ خلوص اور اپنائیت کا مظاہرہ کیا اتنا ہی نہیں آپ نے مجھے اپنے شخصی خاکوں کے دو مجموعے نقوش رفتہ اور سرو د رفتہ بھی مرحمت فرمائے جن سے بمبئی اور بمبئی کی بیشتر ہستیوں سے متعلق مواد حاصل ہوا، آپ کی ان امداد کے لیے میں آپ کی شکر گذار ہوں۔

ڈاکٹر مزمل سرکھوت (اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو بمبئی یونی ورسٹی) کا شمار بھی پروفیسر عبدالستار دلوی کے عقیدت مندوں میں ہوتا ہے، آپ نے پروفیسر عبدالستار دلوی کی کئی تصانیف پر تبصرے اور تاثراتی مضامین بھی قلم بند کیے ہیں اور میں نے جب ان تبصروں کی تلاش میں ڈاکٹر مزمل سرکھوت سے ربطہ کیا تو انہوں نے نہ صرف مجھے تبصرے ارسال کیے بلکہ وقفے وقفے سے مختلف اوقات میں مختلف موضوعات پر اپنی رائے اور معلومات سے واقف کرایا جس کے لیے میں آپ کی مشکور ہوں۔

اسی سلسلے کی ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ پروفیسر عبدالستار دلوی کا قلم آج بھی متحرک ہے کتابیں اور مضامین کی اشاعت کا سلسلہ اب بھی جاری ہے لہٰذا میرا مواد کی فراہمی کا مرحلہ بھی اختتام تک جاری رہا۔

مختلف ذرائع سے مواد کی ایک کثیر تعداد کے جمع ہو جانے کے بعد میں نے استادِ محترم پروفیسر مظفر علی شہ میری کی رہنمائی میں اپنے تحقیقی موضوع ''عبدالستار دلوی کی علمی وادبی ولسانی خدمات'' کی ابواب بندی کی اور مواد کا مطالعہ کیا تو دو ضروری باتیں محسوس ہوئیں، ایک تو یہ کہ پروفیسر عبدالستار دلوی کے مختلف موضوعات جیسے گاندھی جی کا قومی زبان کا نظریہ، ہندوستانی زبان، حضرت مخدوم علی مہائمیؒ، پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی، پروفیسر محمد ابراہیم ڈار، پروفیسر عبدالقادر سرفراز اور پونے کے مسلمانوں کی تاریخ وغیرہ وغیرہ میرے لیے بالکل نئے تھے، میں نے کبھی ان موضوعات سے متعلق نہ کچھ پڑھا تھا نہ سنا تھا، لہٰذا ان موضوعات پر لکھتے ہوئے طویل وقت درکار ہوا کیوں کہ ان سے متعلق مواد اکٹھا کرنا، اکٹھا ہوئے مواد کا مطالعہ کرنا، اہم نکات جمع کرنا اور نتائج اخذ کرنا ایک طویل مرحلہ تھا مگر الحمداللہ! اس طویل مرحلے میں پروفیسر عبدالستار دلوی نے مجھے اپنا قیمتی وقت اور تعاون دیا جس کی بدولت میں اس دشوار گذار راستے سے ثابت قدم آگے بڑھ سکی، آپ کی ان کرم فرمائیوں کے لیے میں عمر بھر آپ کی ممنون رہوں گی۔

مواد کے مطالعے کے دوران محسوس ہونے والی دوسری ضروری بات ''کثرتِ مواد'' ہے اور کثرتِ مواد سے ہونے والی دقتوں سے بچنے کا واحد ذریعہ کارڈ سسٹم ہے اور ہمیں کارڈ سسٹم سکھانے والی واحد شخصیت استادِ محترم پروفیسر مظفر علی شہ میری ہیں جنھوں نے ہمیں ایم۔فل کے دوران طریقہ تحقیق بالخصوص کارڈ سسٹم سکھا دیا تھا مگر درمیانی عرصے میں جو مختلف سرگرمیاں و دشواریاں رہیں ان کے بعد میں نے استا محترم کی خدمت میں حاضر ہو کر طریقہ تحقیق کے اصولوں کی یاد دہائی ضروری سمجھی اور میرے حاضر ہوتے ہی استادِ محترم نے بھی اپنے مخصوص شفقت بھرے انداز میں مجھے طریقہ تحقیق و کارڈ سسٹم دوبارہ سکھائے، اتنا ہی نہیں مجھے دورانِ تحقیق (اختتام تک) جب بھی کوئی دقت پیش آئی میں نے آپ ہی سے رابطہ کیا اور آپ نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود اپنی رہنمائی اور خلوص میرے ساتھ رواں رکھا جس کے لیے میں تاعمر آپ کی ممنون و مشکور رہوں گی۔

موضوعِ تحقیق کے انتخاب اور مواد کی فراہمی کے بعد موضوع کو پانچ ابواب میں تقسیم کرتے ہوئے

موضوع کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو اس طرح ہیں:

پہلا باب: شہرِ ممبئی کا مجموعی پس منظر:

اس باب میں شہرِ ممبئی کے مجموعی پس منظر کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان شخصیات و مقامات کو بیان کیا گیا ہے جنہوں نے عبدالستار دلوی کو علمی، ادبی ولسانی ذوق وشوق دے کر پروفیسر عبدالستار دلوی بنایا ہے، اس باب کی نوعیت موضوعِ تحقیق کے لیے پس منظر کی سی ہے اسی لیے اسے مختصر ہی رکھا گیا ہے۔

دوسرا باب: عبدالستار دلوی: حیات، شخصیت اور ماحول:

اس باب کے پہلے حصے میں عبدالستار دلوی کے سفرِ حیات کے مختلف پہلوؤں جیسے آباو اجداد، والدین، پیدائش، بچپن، تعلیم، ملازمت، شادی، اولادیں، انعامات، اعزازات، اسفار وغیرہ وغیرہ کا تفصیلی مطالعہ کیا گیا ہے اور اس باب کے دوسرے حصے میں آپ کی شخصی خصوصیات کو مدلل بیان کیا گیا ہے جبکہ اس باب کے تیسرے حصے میں آپ کی شخصیت پر اثر انداز ہونے والے مختلف مقامات کے ماحول کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب سے جہاں آپ کی حیات اور شخصیت پر روشنی پڑتی ہے وہیں آپ کی شخصیت پر اثر انداز ہونے والے ماحول کا بھی پتہ چلتا ہے۔

تیسرا باب: عبدالستار دلوی کی علمی خدمات:

اس باب کے پہلے حصے ''ادارہ ساز'' میں آپ کے قائم کردہ اداروں اور انا داروں کے استحکام میں آپ کی علمی خدمات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے جب کہ دوسرے حصے میں آپ کی دیگر علمی خدمات کا بھی احاطہ کیا گیا ہے، اس باب میں آپ کو ادارہ ساز اور ایک عمدہ منتظم ثابت کرنے کی سعی کی گئی ہے اور اس سعی میں مشاہیرینِ ادب کی قیمتی آراء سے مدد لی گئی ہے۔

چوتھا باب: عبدالستار دلوی کی ادبی خدمات:

یہ باب مقالے کا سب سے اہم اور طویل باب ہے جس میں عبدالستار دلوی کو مختلف ادبی حیثیتوں سے پیش کیا گیا ہے، اس باب کے پہلے حصے میں آپ کی اٹھارہ مرتبہ تصانیف کی روشنی میں آپ کو بحیثیت مرتب و مقدمہ

نگار دکھانے کی کوشش کی گئی ہے، دوسرے حصے میں آپ کو بحیثیت محقق و نقاد ثابت کیا گیا ہے، تیسرے حصے میں آپ کو بحیثیت مترجم (انگریزی سے اردو اور مراٹھی سے اردو) پیش کیا گیا ہے، چوتھے حصے میں آپ کو بحیثیت شاعر دکھا یا گیا ہے، پانچویں حصے بحیثیت ادبی صحافی، میں آپ کی صحافتی خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے، چھٹے حصے میں آپ کے پڑھے گئے سمینار، لکچرز اور توسیعی خطبات کو بیان کیا گیا ہے، ساتویں حصے میں آپ کے قلم زد پیش لفظوں کا مطالعہ کیا گیا ہے اور آخری حصے میں آپ کو بحیثیت محرک پیش کیا گیا ہے۔

پانچواں باب: عبدالستار دلوی کی لسانی خدمات:

اس باب میں عبدالستار دلوی کی مختلف لسانی تصانیف (تصنیف، تالیف اور مجموعہ مضامین) کا تفصیلی لسانی مطالعہ کیا گیا ہے اور آپ کے متفرق مضامین جو سماجی لسانیات کے موضوع پر لکھے گئے ہیں کا لسانی پس منظر میں جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے، اس باب سے آپ کے لسانی ذوق، گہر مطالعے اور موضوعات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

ماحصل: ماحصل میں مذکورہ پانچ ابواب کی تلخیص بیان کرتے ہوئے نئے نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔

محقق چوں کہ نا تجربہ کار ہوتا ہے اسی لیے اسے نگراں یا رہنما کی ہمیشہ ضرورت ہوتی ہے اور میرے نگراں ، رہنما اور استاد ڈاکٹر نشاط احمد صاحب نے ہمیشہ میری مدد فرمائی، میرے ساتھ دوستانہ رویہ رواں رکھا تا کہ میں ان سے بلا جھجک کسی بھی موضوع پر تبادلہ خیال کرسکوں، جس کے لیے میں آپ کی شکر گذار ہوں۔

میں صدر شعبۂ اُردو پروفیسر حبیب نثار صاحب کی مشکور ہوں جنہوں نے ابتداء ہی سے میرے موضوع تحقیق سے دلچسپی دکھائی اور وقتاً فوقتاً میری مدد فرمائی، ان کے علاوہ میں شعبۂ اُردو کے تمام اساتذہ کرام کی ممنون ہوں جنہوں نے مجھے اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔

میں ڈاکٹرل کمیٹی ممبران ڈاکٹر عرشیہ جبین صاحبہ اور ڈاکٹر محمد کاشف صاحب کی بھی تہہ دل سے شکر گذار ہوں کہ انہوں نے ہر سمسٹر میں میری حوصلہ افزائی کی ہمت بڑھائی اور اپنے مشوروں سے مستفیض کیا، جن کے لیے

میں ان کی مشکور وممنون ہوں۔ میرے اس مسودے کو کمپوز کر کے نئی اور خوبصورت شکل دینے کے لیے میں محبوب خان محبوبؔ کی بھی مشکور ہوں۔

میرے تعلیمی سفر میں پیش آنے والی ہر مشکل کو حل کرنے میں میری بہن ڈاکٹر آمنہ آفرین پیش پیش رہتی ہیں پھر چاہے وہ مشکل کسی بھی نوعیت کی ہو جیسے کسی پیچیدہ موضوع پر لکھتے ہوئے بحث کرنا ہو، رائے قائم کرنی ہو، وضاحت کرنی ہو یا پھر میری تحریروں کی خامیوں وخوبیاں گنوانی ہوں وہ کبھی تعامل نہیں کرتیں، جہاں حقائق سے واقف کراتیں ہیں وہیں غلطیوں، کوتاہیوں پر ڈانٹ بھی لگاتیں ہیں۔ ان ہی کی طرح میرے بہنوئی ڈاکٹر محمد شفیع کی شخصیت بھی میرے لیے محرک اور معلومات خیز درجہ رکھتی ہے کیوں کہ کوئی بھی مسئلہ درپیش ہو وہ مجھے اس مسئلے سے آسانی سے نکل آنے کے راستے تجویز کر ہی دیتے ہیں۔ آپ دونوں کی اس اصلاح، تحریک اور تجاویز کے لیے میں ہمیشہ ان کی احسان مند رہوں گی۔

میرے والدین کی تربیت، بھائیوں کی شفقت اور بہنوں کی رفاقت شامل حال نہ ہوتی تو میں اس قابل نہ ہوتی کہ تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لیتی مگر میں ان کے لیے شکریہ، مشکور اور ممنون جیسے الفاظ کا استعمال کر کے ان کے جذبات کو مجروح نہیں کرنا چاہتی لیکن دعا کرتی ہوں کہ ان کی تربیت، شفقت اور رفاقت مجھے زندگی کے ہر قدم پر نصیب ہوں۔ آمین!

رئیسہ بیگم

28-05-2018

﴿باب اول﴾

شہر ممبئی کا مجموعی پس منظر

شہر ممبئی کا مجموعی پس منظر

1۔ شہر ممبئی کا مجموعی پس منظر

1.1۔ ممبئی کا علمی پس منظر اور عبد الستار دلوی

1.1.1۔ مکتبہ جامعہ ممبئی اور عبد الستار دلوی

1.1.2۔ ڈائریکٹر سید نجیب اشرف ندوی اور عبد الستار دلوی

1.1.3۔ پروفیسر گجیندر گڈکر اور عبد الستار دلوی

1.2۔ ممبئی کا ادبی پس منظر اور عبد الستار دلوی

1.2.1۔ مستان تالاب اور عبد الستار دلوی

1.2.2۔ مکتبہ جامعہ ممبئی کی ادبی نشستیں اور عبد الستار دلوی

1.2.3۔ احمد سیلر ہائی اسکول کے اساتذہ اور عبد الستار دلوی

1.2.4۔ اسماعیل یوسف کالج کے اساتذہ اور عبد الستار دلوی

1.2.5۔ مولانا حفظ الرحمٰن، قاری سید ودود الحئی اور عبد الستار دلوی

1.3۔ ممبئی کا لسانی پس منظر اور عبد الستار دلوی

1.3.1۔ سمر اسکول کورسس اور عبد الستار دلوی

1.3.2۔ بمبئی یونی ورسٹی کا شعبہ لسانیات اور عبد الستار دلوی

1.3.3۔ سنیتی کمار چٹرجی، پنڈت ستیو مادھوراؤ پگڑی، مسعود حسین خان اور عبد الستار دلوی

شہرممبئی کا مجموعی پس منظر

شہرممبئی کا شمار ہندوستان کے بڑے اور قدیم شہروں میں ہوتا ہے اگر ہم ممبئی کا نقشہ دیکھیں تو یہ شہرسات جزائر پر مشتمل ہے جن کے نام یہ ہیں: کولابہ(Colaba)، ''Little Colaba''(اس کا قدیم نام)، ''Old Woman's Island'' ماہم (Mahim)، ورلی(Warli)، مجگاؤں (Mazagaon)،Parel اورBambay۔

تحقیق سے ثابت ہے کہ شہرممبئی کا نام وہاں کے قدیم مقامی باشندے کولیوں کی ماتا ممبادیوی کے نام سے اخذ کیا گیا ہے۔ڈاکٹر میمونہ دلوی ''ممبئی'' کی وجہ تسمیہ سے متعلق یوں رقم طراز ہیں:

> ''یہ رواج عام ہے کہ دیوی اور دیوتا کے لیے وہ لقب استعمال کیے جاتے ہیں جو کہ مفتوح یا مغلوب کی شخصیت سے متعلق ہوں۔اسی وجہ سے ہندوؤں نے اپنی دیوی ''مہا امّا'' Mahah Amma کے نام کی مناسبت سے ''ممباMumba'' میں تبدیل کر دیا اور اس طرح ممبادیوی کے تعلق سے اس علاقے کا نام ممبئی پڑ گیا۔''ممبئی'' کی ابتدائی صوت''م'' جو دولبی انفی صوت Bi-Labial Nasal ہے۔دولبی بندشی صوت Bi-Labial Stop''ب'' میں بدل گئی اور اس طرح یہ نام''بمبئی'' بن گیا۔''

(بمبئی میں اردو،ص:12-13)

اگر شہرممبئی کی وجہ تسمیہ جاننے کے لیے تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کو بمبئی کے علاوہ بمبائن اور بمبے وغیرہ بھی نام دیے گئے ہیں،اور شہرممبئی کی تاریخ سے متعلق اگر انگریزی مواد کا مطالعہ کریں تو ان حقائق کا انکشاف ہوتا ہے:

“In 1534 the portugues captured the Island and established a trading centre (or Factory) there. The portugues called the place Bom Bahia, meaning the good bay which the English Pronounced Bombay. .... the englishman to visit mumbai were raiders. In october 1626, whilst at war with portugal, English sailors heard that the portuguese had "got into a hole called Bombay" to repair their ships.”

(Bombay : History of a city. www.bl.uk>hiskitzen> traiding> history)

ڈاکٹر میمونہ دلوی اور انگریزی مواد دونوں سے پتہ چلتا ہے کہ ممبئی کا نام ممبا دیوی کی مناسبت سے ممبئی کہلانے کے بعد وقفے وقفے سے بمبیا، بمبائن اور بمبے بھی پڑا لیکن 1628ء میں ایک بار بمبئی Bombay پڑا تو یہی اس کا مستقل نام بن گیا۔ RSS نے صدر بال ٹھاکرے کی قیادت میں مسلسل جدوجہد کی اور جب 1995ء میں مہاراشٹرا میں RSS برسر اقتدار آئی تو اس سیاسی جماعت نے بمبئی کو ممبئی کا انگریزی Version بنائے ہوئے بمبئی کو ممبئی میں تبدیل کر دیا۔ تب سے لے کر آج تک اس شہر کا نام ممبئی Mumbai ہی برقرار ہے۔

ہر علاقہ وخطہ اپنی تاریخی تہذیب رکھتا ہے جس میں سیاسی، سماجی، معاشی، علمی، ادبی اور لسانی وغیرہ مختلف پہلو شامل ہوئے ہیں اور تہذیب میں اس علاقے کے مخصوص رسم و رواج کھانے وغیرہ کا احاطہ کیا جاتا ہے اس طرح اگر ممبئی کی تاریخ بالخصوص سیاسی تاریخ دیکھیں تو متعدد واقعات ملتے ہیں مگر ہم یہاں چند اہم واقعات کا ہی ذکر کریں گے۔

بمبئی کے مقامی باشندے کہلانے والی کوئی قوم پہلے گجرات کے علاقے میں آباد تھی لیکن جب گجرات میں آریہ قوم وارد ہوئی تو انہوں نے جنوب کی طرف بڑھتے ہوئے بمبئی کو اپنے لیے منتخب کر لیا کیوں کہ ان کا پیشہ

ماہی گیری تھا اور بمبئی سات جزائر پر مشتمل تھا۔ اور اس قوم نے یہاں کے سب سے بلند جزیرے پر اپنی دیوی ''ممباء دیوی'' (مباماں) کا مندر تعمیر کروایا۔ جس کی مناسبت سے ہی یہ شہر ممبئی کہلاتا ہے۔ کولیوں نے آریاؤں کا اثر بھی قبول کیا اور مغربی علاقوں سے تعلقات بھی قائم کیے جس سے تجارت کو فروغ ملا۔

تیسری صدی قبل مسیح میں یہاں موریہ خاندان کی حکومت تھی۔ اس خاندان کا سب سے اہم راجہ اشوک اعظم تھا جس نے یہاں بدھ مت کی تبلیغ کروائی تھی۔ مگر جب موریہ سلطنت کمزور ہونے لگی تو ستواہن خاندان کے حملے شروع ہو گئے، انہوں نے پہلے گوداوری کا علاقہ فتح کیا اور پہلی صدی قبل مسیح تک وہ گھاٹ اور کوکن کے تمام علاقوں پر اپنا تسلط قائم کر چکے تھے۔ اس خاندان نے بمبئی پر تین سو سال حکمرانی کی۔ لیکن اس خاندان کا سب سے بڑا راجہ گوتمی پتر شتکرنی تھا۔ جس نے 125ء میں کشت اپ سلطنت کے سردار Mahapana کو شکست دے کر دکن کا علاقہ فتح کر لیا تھا۔ مگر جب ستواہن سلطنت کا زوال شروع ہوا تو Mahapana نے بمبئی پر حملہ کیا اور اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

بمبئی کی سیاسی تاریخ میں چوتھی صدی عیسوی میں راجہ رودرا گانا Rudragana (والد اندرورما) پانچویں صدی میں (Traikutaka) تری کوٹک خاندان اور لاچوری خاندان کی حکمرانی رہی مگر تفصیلات کا علم نہ ہو سکا۔

پانچویں صدی عیسوی میں جب بمبئی اور نواح بمبئی میں تری کوٹک سلطنت زوال پذیر ہوئی تب موریہ خاندان نے بمبئی پر حملہ کیا، فتح حاصل کی اور تقریباً ایک صدی یہاں حکومت بھی کی لیکن چالوکیہ خاندان نے موریاؤں کی راجدھانی ''پوری'' پر قبضہ کر لیا اور خلیج فارس سے تجارتی تعلقات بھی قائم کر لیے مگر بمبئی کا انتظام چالوکیہ کے گورنر کی ماتحتی میں تھا جس کو 759ء میں راشٹر کوٹ خاندان کی گورنر میں دیا تو سلہار خاندان نے یہاں 810ء سے 1260ء تک حکومت کی۔ سلہار خاندان کے راجاؤں نے بمبئی کو عروج دیا۔ انہوں نے مسلم ممالک سے تجارتی تعلقات قائم کیے۔ مسلمانوں کو مسجدیں بنوانے کی اجازت دی ان کے جھگڑوں کو سلجھانے کے لیے قاضی

مقرر کیے۔ دوسری طرف انہوں نے اپنے مذہب کو بھی عروج دیا۔مندریں تعمیر کروائیں اور برہمنوں کو عطیات دیے جن میں والکیشور کا مندر بہت اہم ہے۔1265ء میں سلہارا خاندان کا خاتمہ ہوا تو کوکن کا علاقہ یادو خاندان کی ماتحتی میں چلا گیا۔جس نے 1290ء میں کرشنا نامی وائسرائے مقرر کیا جو کوکن کا انتظام کیا کرتا تھا۔اسی دوران علاؤالدین خلجی نے دکن پر حملہ کیا تو دیوگری کے راجہ رام دیو نے شکست کو قریب پا کر اپنے بیٹے بھیم دیو کو کوکن روانہ کیا اور بھیم دیو نے کوکن اور بمبئی کو ترقی وفروغ دیا۔اس نے بمبئی کو ایک نئی تہذیب اور فنون لطیفہ سے متعارف کروایا۔عمارتیں تعمیر کروائیں اور بمبئی کو سلطنت کا مرکز بنا دیا۔بھیم دیو نے 1303ء میں وفات پائی تو اس کا بیٹا پرتاپ بھیم تخت نشین ہوا اور 28 سال یعنی 1331ء تک اور اس کے بعد نگر دیو نے 17 سال یعنی 1348ء تک کوکن اور بمبئی پر حکومت کی۔

1348ء ہی میں بمبئی گجرات کے مسلمان سلاطین کی سلطنت میں شامل ہو گیا۔ویسے تو مسلمان سلاطین کی نظریں عرصے سے بمبئی پر تھیں۔جس کے چلتے انہوں نے بمبئی پر متعدد حملے کیے اور 1326ء میں تھانہ اور ماہم کے علاقوں پر قبضہ بھی کر لیا مگر محمد بن تغلق کے عہد میں انتشار کی وجہ سے وہ بمبئی پر زیادہ توجہ نہ دے سکے۔لیکن اس کے گورنر یہاں حکومت کرتے رہے۔اس عرصے میں مختلف مسلمان خاندان کوکن سے ہجرت کر کے ماہم اور بمبئی میں آباد ہو گئے۔جن میں مختلف مسلک کے مسلمان شامل تھے۔لیکن اس دور کی سب سے اہم شخصیت ''حضرت مخدوم علی مہائمی'' ہیں۔

سلاطین گجرات ایک طرف مراہٹوں اور دوسری طرف پرتگیزوں سے پریشان تھے کیوں کہ انہوں نے کبھی بھی خود حکمرانی نہیں کی بلکہ وہ چند عہدیدار مقرر کرتے انتظام حکومت چلاتے تھے۔اسی اثنا میں پرتگیز تجارت کی غرض سے ہندوستان آئے۔وہ بمبئی کو حاصل کر کے اسے اپنا تجارتی مرکز بنانا چاہتے تھے۔دوسری طرف سلطان بہادر شاہ مغل بادشاہ ہمایوں کے حملوں سے تنگ آ چکا تھا اس نے 1534ء میں پرتگیزوں سے معاہدہ کیا تو شہر بمبئی 50 سال کے لیے پرتگیزوں کے قبضے میں چلا گیا۔جنہوں نے بمبئی کو تجارت کے لیے تو استعمال کیا ہی ساتھ ہی

ساتھ بمبئی میں متعدد چرچ بنوائے اور عیسائیت کی تبلیغ بھی کی۔

انگریز سورت میں ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کر چکے تھے مگر ان کی نظریں بمبئی بالخصوص اس کی جغرافیائی اہمیت کے پیش نظر ٹکی ہوئی تھیں۔اور بمبئی کو حاصل کرنے کے لیے انہوں نے ڈچ تجارتی کمپنی کے تعاون سے 1625ء میں بمبئی پر حملہ کیا،لوٹ مار کی۔ یہ سلسلہ ایک طویل عرصے تک چلتا رہا۔اور اس سلسلے کا ایک اہم واقعہ انگلستان کے بادشاہ چارلس دوم اور پرتگال کی شہزادی کیتھرائن ڈی بریگنز کی سیاسی شادی ہے جو 23 جون 1661 کو انجام پائی۔ اس شادی سے اقتدار بمبئی انگریزوں کو منتقل ہو گیا۔مگر مراہٹوں اور سیدی حاکموں نے انگریزوں کی حالت خراب کر رکھی تھی۔ 1857ء کی بغاوت، 1861ء کی امریکہ کی خانہ جنگی اور 1869ء کے نہر سوئز کے راستے سے آمدورفت کی وجہ سے بمبئی انٹرنیشنل بندرگاہ کی اہمیت اختیار کر گیا،مگر بمبئی کی سیاسی تاریخ کے سلسلے میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام 1885 ایک اہم واقعہ ہے۔جس سے بمبئی میں ایک دور کا آغاز ہوتا ہے۔

آزادی کے بعد مہاراشٹر میں کبھی کانگریس کبھی بی جے پی اور کبھی شیوسینا کی حکومت رہی۔لیکن بمبئی کو جو ہندوستان کے سب سے بڑے صنعتی وتجارتی شہر ہونے کا اعزاز حاصل ہے اس میں کوئی فرق نہیں آیا۔

شہر بمبئی کی مختصر سیاسی تاریخ جان لینے کے بعد اب آیئے بمبئی میں اردو کی ابتدا وفروغ کو بھی دیکھ لیں۔ جس سے اس شہر کے علمی،ادبی ولسانی پس منظر کو عبدالستار دلوی کے حوالے سے جاننے میں مدد ملے گی۔

جب دبستان دلی اور دبستان لکھنؤ ویران ہوئے، تقسیم ملک ہوا اور حیدرآباد کی اردو سرپرستی بھی ختم ہو گئی تو شہر ممبئی اور اس کے نواح میں اردو زبان وادب کو فروغ حاصل ہوا۔جس کی ایک وجہ ممبئی میں Bollywood کی موجودگی بھی ہے کیوں کہ اس Bollywood سے منسلک ہو کر شہرت اور روزگار حاصل کرنے کے لیے وقفے وقفے سے اردو ادیب وشاعر ممبئی کا رخ کرتے رہتے ہیں۔ان میں سے کچھ کے حصے میں شہرت وکامیابی اور کچھ کے حصے میں ناکامی بھی آتی ہے۔اس کی دوسری وجہ ترقی پسند تحریک بھی تھی۔ کیوں کہ ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی ایک طویل فہرست ممبئی میں آباد تھی جن کو سن کر نئی نسل پروان چڑھی ہے۔اور ممبئی میں اردو کے فروغ سے متعلق

شاہد عمادی اپنے خاکے ''خوشا ممبئی تجھ پہ اردو کا سایہ'' میں لکھتے ہیں:

''لکھنؤ اور دلی کے سوتے جب خشک ہوئے تو اہل دانش نے اس شہر کی طرف رخ کیا۔ آزادی کی شفق پھوٹتے ہی ملک تقسیم کے زخموں سے تڑپ اٹھا اور شہر انتخاب دلی اور شہر نگاراں لکھنؤ کے دبستان ادب ویران ہوئے اور حیدرآباد کا گہوارۂ ادب اجڑا تو بمبئی کے پیران شہر نے اس بلا خیز آندھی میں نہ صرف انسانی قدروں کی حفاظت کی بلکہ شمع علم کو بھی تند ہواؤں میں بجھنے نہ دیا۔ آج جب کہ لکھنو دلی کے اکثر نامور اہل علم خانوادوں کی نسلیں اردو سے نابلد ہیں۔ بمبئی کا بچہ بچہ اردو کا شیدائی ہے۔'' (''نقوش رفتہ'' ص۔28)

شہر ممبئی میں اردو زبان و ادب کو ترقی بھلے ہی دبستان دلی، دبستان لکھنؤ اور حیدرآباد کے ویران ہونے کے بعد ہوئی ہو لیکن جب ایک بار اس شہر نے اردو نوازی کی ابتداً کی تو اسے ارتقاء دینے میں کئی اردو نواز خاندانوں نے اہم رول ادا کیا جن میں مقبہ خاندان سے ابراہیم مقبہ اور محمد حسن مقبہ، مہری خاندان سے قاضی غلام علی مہری، قاضی غلام حسین مہری اور قاضی شہاب الدین مہری، روگھے خاندان سے ناخدا محمد علی روگھے، کھٹکھٹے خاندان سے مولوی محمد یوسف کھٹکھٹے اور طیب جی خاندان سے طیب جی، بدرالدین طیب جی، اصغر علی فیضی، زہرہ بیگم فیضی، عطیہ بیگم فیضی، آصف علی فیضی اور بیگم سلطانہ فیضی وغیرہ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

تقریباً تین صدیوں سے ممبئی میں اردو زبان و ادب کی آبیاری ہو رہی ہے۔ ابتداً میں مذہبی و درسی کتابیں لکھی گئیں۔ ڈراموں اور سنیما نے بھی اپنا اپنا حصہ دیا مگر انیسویں صدی کے نصف آخر میں مشاعروں کی بنیاد پڑی جو آج بھی جاری ہے اور انہی مشاعروں میں سردارؔ جعفری، کیفیؔ اعظمی، مجروحؔ سلطان پوری، ساحرؔ لدھیانوی اور جاں نثار اخترؔ وغیرہ نے ترقی پسند شاعری سے نئی نسل کو متاثر کیا اور اس نئی نسل کا ایک روشن و معتبر نام عبدالستار دلوی کا ہے، جنھوں نے اپنے زمانۂ طالب علمی ہی سے ان شعراً کو نہ صرف سنا بلکہ ان کا اثر بھی قبول کیا ہے۔ لہٰذا شہر ممبئی کے اس مختصر مگر مجموعی پس منظر کو جان لینے کے بعد اب آیئے شہر ممبئی کا علمی و ادبی و لسانی پس منظر عبدالستار دلوی کے

حوالے سے بھی دیکھتے چلیں۔

1.1۔ ممبئی کا علمی پس منظر اور عبدالستار دلوی:

ممبئی شہر اپنی اردونوازی کی ابتدا ہی سے علم کا دفینہ رہا ہے کیوں کہ اس شہر نے اپنے تعلیمی نظام پر توجہ مرکوز کی ہے اور تعلیمی ادارے قائم کیے ہیں۔ جن میں لڑکوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کی بھی تعلیم کا انتظام تھا۔ ایسے اداروں میں اسماعیل یوسف کالج جو سر محمد یوسف کے عطیے سے قائم ہوا تھا اور انجمن اسلام کے نام دیے جا سکتے ہیں۔ جہاں سے فارغ التحصیل اور مستفید طلبہ میں علم کی جستجو و پیاس ہمیشہ باقی رہی اور ایسے ہی طلبہ میں ایک نام عبدالستار دلوی کا ہے، جنھوں نے احمد سیلر ہائی اسکول سے میٹرک کے بعد اسماعیل یوسف کالج سے انٹرمیڈیٹ اور بی۔اے آنرز کی تعلیم پائی مگر آپ کے یہاں علمی پیاس و جستجو اپنے اسکولی دور سے ہی ملتی ہے کیوں کہ آپ اپنے اسکول کے بعد فرصت کے اوقات میں بھی اپنی علمی جستجو کی تسکین کا سامان کسی نہ کسی جگہ ڈھونڈ ہی لیتے تھے ایسی ہی ایک جگہ ''مکتبہ جامعہ ممبئی'' ہے۔

1.1.1۔ مکتبہ جامعہ ممبئی اور عبدالستار دلوی:

مکتبہ جامعہ ایک قدیم ادارہ ہے جو کتابوں کی طباعت و تقسیم کا کام کرتا ہے۔ اس کا صدر دفتر دلی میں ہے اور ایک شاخ ممبئی میں ہے اور اس شاخ یعنی مکتبہ جامعہ ممبئی میں اس دور میں طویل عرصے تک شاہد علی خان بہ حیثیت مینجر مقرر تھے جو علم دوست و علم نواز شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی سرپرستی میں جامعہ میں تقریباً ہر روز ادیبوں، شاعروں، اساتذہ اور طالب علموں کا میلہ لگا رہتا تھا اور اس میلے میں بہ روز ہفتہ (سنیچر) کو اور اضافہ ہو جاتا تھا۔ لہٰذا عبدالستار دلوی کے اسکول کے بعد کے اوقات اسی مکتبہ جامعہ میں گزرتے یہاں جہاں آپ نے اپنے ادبی ذوق کو پروان چڑھایا۔ وہیں اپنے علمی ذوق کی بھی نشو و نما کی۔ بقول عبدالستار دلوی وہ اپنے فرصت کے اوقات میں مکتبہ جامعہ پر چلے جاتے، جہاں انہوں نے دیکھ اور سیکھا کہ کتابوں کا Bill کس طرح بنایا جاتا ہے اور Discount کس طرح دیا جاتا ہے۔ یہاں سے عبدالستار دلوی نے بہ حیثیت منتظم پہلا تجربہ حاصل کیا تھا۔ جس

نے آپ کی منتظم شخصیت کو جلا بخشی۔ اوراس سلسلہ کا دوسرا تجربہ پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی (بانی ڈائرکٹر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ) کی صحبت وشاگردی میں ہوا۔

1.1.2۔ ڈائریکٹر پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی اور عبدالستار دلوی:

پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے بانی ڈائرکٹر رہے ہیں چونکہ وہ ابھی اپنی پروفیسرشپ سے مستعفی نہیں ہوئے تھےاسی لیے آپ اسماعیل یوسف کالج میں اردو کے پروفیسر بھی متعین تھےاورآپ بمبئی یونی ورسٹی سے الحاق رکھنے والے مختلف کالجوں میں انٹرمیڈیٹ سے پی۔ایچ۔ڈی تک کے طلبہ کی رہنمائی کرتے تھے۔ ان ہی میں سے ایک طالب علم ''عبدالستار دلوی'' ہیں۔جنہیں اسماعیل یوسف کالج میں نہ صرف اپنے استاد محترم کی شاگردی ملی بلکہ ان کا بیشتر وقت انجمن اسلام میں اپنے استاد محترم، ڈائرکٹر پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی کے ساتھ گزرتا۔ جہاں آپ ان کی کارکردگی کا بغور مشاہدہ کرتے تھے۔ یہ مشاہدہ بالراست ہی صحیح مگراس سے آپ کی انتظامی صلاحیت اور پروان چڑھی ۔اس سلسلے کا آپ کا تیسرا تجربہ پروفیسر گجیند رگڈکر (صدر شعبہ لسانیات، بمبئی یونی ورسٹی) کے توسط سے ہوا۔

1.1.3۔ پروفیسر گجیند رگڈکر اور عبدالستار دلوی:

پروفیسر گجیند رگڈکر بمبئی یونی ورسٹی کے شعبہ لسانیات میں صدر کے عہدے پر فائز تھےاور عبدالستار دلوی نے 1964 سے 1967ء تک تین سال کے دوران ان کی نگرانی میں لسانیات میں پی ایچ ڈی کیا۔ دراصل پروفیسر گجیند رگڈکر اپنے ریسرچ اسکالر عبدالستار دلوی کو شاگرد کی طرح نہیں بلکہ ایک دوست کی طرح مانتے تھے۔ اسی لیے جب وہ صدر شعبہ کی حیثیت سے اپنے شعبے کا سالانہ اخراجات پر مشتمل متوقع لائحہ عمل بناتے تو اسے آپ کو بھی دکھاتے تھے۔ بقول عبدالستار دلوی پروفیسر گجیند رگڈکر سے انہوں نے سمینارس، لکچرس وتوسیعی خطبات کا لائحہ عمل کس طرح تیار کرنا چاہیے، سیکھا ہے۔

عبدالستار دلوی کی شخصیت میں انتظامی صلاحیت خدا داد ہے مگر اسکول، کالج اور یونی ورسٹی میں ملے مختلف ماحول اور تجربات سے آپ کی صلاحیتوں کو اور تقویت ملی، جن سے آپ نے استفادہ کیا اور اپنی صلاحیتوں کو متحرک کر کے عمل میں لا کر، متعدد شعبوں کو قائم کر کے، آپ ادارہ ساز بن گئے ہیں، جس کا کوئی ثانی نہیں۔

1.2۔ ممبئی کا ادبی پس منظر اور عبدالستار دلوی

ممبئی میں تقریباً تین صدیوں سے اردو زبان و ادب کی آبیاری ہو رہی ہے۔ مگر ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند مصنفین نے اسے نیا موڑ دیا۔ کیوں کہ ترقی پسند ادیب و شعراٗ ہی اس دور کے منظر نامے پر چھائے ہوئے تھے اور وقفے وقفے سے ان کے جلسے و مشاعرے منعقد ہوتے رہتے تھے اور ان جلسوں و مشاعروں کے لیے اکثر جو جگہ مختص رہتی وہ ''مستان تالاب''، تھی۔

1.2.1۔ مستان تالاب اور عبدالستار دلوی

ممبئی کے ناگپاڑہ علاقے میں ایک وسیع و عریض میدان ''مستان تالاب میدان'' کے نام سے موسوم ہے۔ جہاں ترقی پسند ادیبوں و شاعروں کے جلسے ہوا کرتے تھے جن میں اکثر علی سردارؔ جعفری، مجروحؔ سلطان پوری، کیفیؔ اعظمی، ساحرؔ لدھیانوی اور جاں نثار اخترؔ وغیرہ وغیرہ اپنے کلام سے سامعین تک اپنے ترقی پسند یا مارکسی خیالات پہنچاتے تو وہیں کبھی کبھی کرشن چندر بھی اپنے افسانے سنایا کرتے اور بقول عبدالستار دلوی میں نے علی سردارؔ جعفری کو پہلی بار مستان تالاب پر ہی دیکھا، سنا اور متاثر ہوا تھا۔ یہ آپ کے اسکول کا زمانہ تھا اور اسی زمانے میں آپ کا دوسرا ادبی مشغلہ '' مکتبہ جامعہ ممبئی کی نشست و برخاست'' بھی رہا۔

1.2.2۔ مکتبہ جامعہ ممبئی کی ادبی نشستیں اور عبدالستار دلوی

دراصل مکتبہ جامعہ ممبئی، مکتبہ جامعہ دہلی کی ایک شاخ ہے جو بظاہر تو ایک چھوٹی سی کتابوں کی دوکان ہے مگر اس میں اس دور میں ہونے والی ادبی نشستیں بہت ہی اعلیٰ پائے کی ہوتی تھیں۔ جن میں ترقی پسند

ادیب وشعراً کے علاوہ مولانا مہر محمد شہاب مالیر کوٹلوی اور دیگر ادبی شخصیتیں شامل ہوتی تھیں تو عبدالستار دلوی بھی اسکول کے بعد اپنے فرصت کے لمحات ان ہی نشستوں کا حصہ بن کر گزارتے اور یہی نشستیں ہیں جنہوں نے نہ صرف آپ کو متاثر کیا ہے بلکہ آپ کو ابتدائی ادبی ذوق بھی دیا ہے اور آپ کے اس ادبی ذوق کو آپ کے اسکول ''احمد سیلر ہائی اسکول کے قابل اساتذہ'' نے بخوبی سمجھا ہے۔

1.2.3۔ احمد سیلر ہائی اسکول کے اساتذہ اور عبدالستار دلوی

احمد سیلر ہائی اسکول، انجمن اسلام کے تحت چلایا جاتا تھا اور ایک اعلیٰ معیار کا اسکول تصور کیا جاتا تھا۔ اس اسکول میں محترم محمد بشیر مرحوم آپ کے اردو کے استاد تھے جو مختلف موضوعات پر مضامین لکھوانے کے علاوہ خوشخطی پر بھی نظر رکھتے تھے۔ ایک اور استاد عبدالقادر چور گھے تھے جو شاعر تھے ''لطف'' تخلص استعمال کرتے تھے اور تلامذۂ محمد یونس ہینڈادے میں سے تھے۔ وہ زباندانی، املا اور انشا کی غلطیوں کو کبھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ ان اساتذہ کے علاوہ استاد مولوی عباس اور اسداللہ خان جیسے قابل اساتذہ اس اسکول سے وابستہ تھے جن کی تربیت وذہن سازی نے آپ کے ابتدائی ادبی ذوق کی نشوونما کی۔ ان کے علاوہ اس اسکول کے پرنسپل مولوی محمد انصار علی مرحوم تھے جن کی محبتیں وشفقتیں آپ کو آج بھی یاد ہیں۔ انہوں نے ہی آپ کو مشورہ دیا تھا کہ میٹرک کے بعد کالج میں اردو عربی پڑھنی ہے تو اسماعیل یوسف کالج میں داخلہ لے لو اور پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی سے اردو اور پروفیسر محمد ابراہیم ڈار سے عربی پڑھو۔ لہٰذا استاد محترم کے مشورے کے مطابق آپ نے اسماعیل یوسف کالج میں داخلہ لے لیا۔ مگر افسوس اس سے پہلے ہی پروفیسر محمد ابراہیم ڈار انتقال کر گئے اسی لیے آپ کی نظریں صرف اور صرف پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی پر مرکوز ہو گئیں تھی۔

1.2.4۔ اسماعیل یوسف کالج کے اساتذہ اور عبدالستار دلوی

اسماعیل یوسف کالج کے پرنسپل ڈاکٹر محمد بذل الرحمٰن عربی کے بہت بڑے عالم اور کیمبرج یونی ورسٹی سے

فارغ التحصیل تھے۔ان کی سرپرستی میں اسماعیل یوسف کالج کی کہکشاں میں پروفیسر سراج الحسن نقوی، پروفیسر داؤد پوتا، پروفیسر غلام ہمدانی، پروفیسر سید تجیب اشرف ندوی، پروفیسر محمد ابراہیم ڈار، ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی، ڈاکٹر عالی جعفری اور ڈاکٹر باقر علی ترمذی جیسے ستارے شامل ہیں جو مختلف شعبے جات سے تعلق رکھتے تھے۔مگران تمام اساتذہ میں عبدالستار دلوی جس استاد سے سب سے زیادہ متاثر ہیں وہ پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی کی شخصیت ہے کیوں کہ وہ ایک پروفیسر تھے اوران کی علمی وادبی دھاک جمانے کے لیے جو پورے سال میں ان کے دو یا تین لکچرس ہوتے تھے وہی کافی تھے۔ دراصل پروفیسر ندوی کی علمیت ہی نہیں آپ ان کی شخصیت سے بھی متاثر تھے۔ بقول عبدالستار دلوی، انہیں کئی بار خواہش ہوتی تھی کہ وہ بھی پروفیسر بنے اوران کی شخصیت بھی نرم وملائم بالوں والی ہو پروفیسر ندوی کی طرح۔ان کے علاوہ آپ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی سے بھی بے حد متاثر تھے جو دراصل ایک سنجیدہ قسم کے استاد تھے اور آپ نے انہی کی نگرانی میں اپنا پی ایچ ڈی مکمل کیا تھا۔علاوہ ازیں ڈاکٹر عالی جعفری بھی ایک عالی مرتبت استاد واقع ہوئے ہیں جو طالبہ کو مختلف کتابوں کے ساتھ ساتھ رسائل سے بھی مستفید ہونے کی تلقین کرتے تھے۔آپ کے متذکرہ بالا تینوں اساتذہ کی شخصیتیں ایک دوسرے سے مختلف رہی ہیں مگران مختلف شخصیتوں نے نہ صرف آپ کے ادبی ذوق کو مختلف طرح سے یا یوں کہے کہ مختلف زاویوں سے متاثر کیا بلکہ انہوں نے آپ کے ادبی ذوق کو مستحکم بھی کیا۔آپ کے ان متاثر کن اساتذہ کے علاوہ دو اور بھی شخصیات ہیں جن سے آپ نے اثر قبول کیا ہے اور وہ شخصیات یہ ہیں ''مولانا حفظ الرحمٰن'' اور ''قاری سید ودود الحیٔ ندوی نفیس''۔

1.2.5۔ مولانا حفظ الرحمٰن، قاری سید ودود الحیٔ اور عبدالستار دلوی

مولانا حفظ الرحمٰن میرٹھی جنگ آزادی کے دوران فسادات اور مشکل حالات سے نمٹنے کے لیے پنڈت نہرو کے ساتھ ساتھ رہتے تھے اور اپنی غیر معمولی تقاریر سے حالات کو سازگار بنانے کی کوشش کرتے تھے کیوں کہ بقول عبدالستار دلوی آپ ایک غیر معمولی مقرر تھے اور آپ ان کی تقاریر سے بہت متاثر ہیں۔

ممبئی میں ایک عمدہ روایت رہی ہے کہ جمعہ ہو یا عشرۂ محرم یا پھر عید میلاد النبیؐ۔ان مختلف موقعوں پر سنی

مسلم اکثریت والے محلوں میں قاری صاحبان، واعظین اور مولانا اصحاب کی تقاریر ہوا کرتی تھیں۔ مگر ان سب میں سب سے متاثر کن شخصیت قاری سید ودودالحئ ندوی کی تھی جو خود ایک شاعر تھے اور اپنی تقاریر میں جا بجا مولانا روم، شیخ سعدی اور اقبال کے اشعار پڑھا کرتے تھے اور ان کی نثر میں بھی کتابیں ملتی ہیں۔ بقول عبدالستار دلوی ان کا ایک گروپ تھا جو قاری سید ودودالحئ سے متاثر تھا اور ان کی تقاریر کا منتظر رہتا تھا۔ لہٰذا قاری سید ودودالحئ سے بھی آپ نے اثر قبول کیا ہے جس کا آپ اعتراف بھی کرتے ہیں۔

بہر حال مستان تالاب کے جلسے، مکتبہ جامعہ ممبئی کی نشستیں احمد سیلر ہائی اسکول کے اساتذہ، اسماعیل یوسف کالج کے اساتذہ مولانا حفظ الرحمٰن اور قاری سید ودودالحئ ندوی سے آپ نے جتنا بھی اور جیسے بھی اثر قبول کیا ہو لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر آپ کی خود کی شخصیت میں ادبی ذوق نہ ہوتا تو یہ سب رائیگاں ہوتا، مگر ایسا نہیں ہوا۔ آپ کو قدرت نے ادبی ذوق عطا کیا ہے جسے مختلف اوقات میں مختلف طرح سے اور مختلف شخصیتوں نے جلا بخشی ہے۔

1.3۔ ممبئی کا لسانی پس منظر اور عبدالستار دلوی

شہر ممبئی کے شعر و ادب اور فن پاروں کی تخلیق میں جو زبان استعمال ہوتی آئی ہے وہ معیاری اردو ہے، مگر جو ''بمبیا اردو'' پورے ممبئی کی رابطِ عامہ کا ذریعہ ہے۔ اس پر ابتداً ہی سے گجراتی، دکنی، مراٹھی اور پرتگیزی وغیرہ زبانوں کے اثرات ملتے ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ممبئی ایک صنعتی شہر ہے، اسی لیے یہاں ملک کے مختلف علاقوں کے اور مختلف زبانوں کے بولنے والے آباد ہیں۔ اور وہ اپنی اپنی روزمرہ کی زبانوں اور بولیوں سے ممبئی کی روزمرہ اردو یعنی ''بمبیا اردو'' کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔

اس دور میں ممبئی کے اردو میڈیم اسکولس میں ابتداً تا آٹھویں جماعت تک کی تعلیم اردو میں ہوتی تھی اور اس کے بعد سے میٹریکولیشن تک کی تعلیم انگریزی میں ہوتی تھی کیوں کہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ تعلیم انگریزی ہوتا ہے اور طلبہ کو اس کے لیے تیار کرنا ان کا مقصد ۔ اس کے علاوہ گجراتی و مراٹھی زبانیں بھی بطور مضامین (Subjects) پڑھائی جاتی تھیں۔

ایسے میں اگر ہم دیکھیں تو اس دور میں ایک طالب علم جو اردو ذریعہ تعلیم سے تعلیم حاصل کرتا ہے اسے معیاری اردو، انگریزی، مراٹھی، گجراتی اور روزمرہ کی بمبیا اردو زبانوں سے واقفیت رکھتا تھا اور ایسا ہی عبدالستار دلوی کے ساتھ بھی ہوا۔ انہوں نے اردو ذریعہ تعلیم سے تعلیم حاصل کی جو آٹھویں تک اردو ذریعہ تعلیم اور بعد میں انگریزی ذریعہ تعلیم ہو گیا۔ گجراتی اور مراٹھی کو مضامین کی حیثیت سے پڑھا۔ اتنا ہی نہیں آپ کوکنی ہیں اسی لیے آپ کو کوکنی زبان پر بھی عبور حاصل ہے۔ ایسے میں آپ کو میٹریکیولیشن تک ہی اردو، مراٹھی، گجراتی، کوکنی اور انگریزی کے ساتھ ساتھ بمبیا اردو پر بھی غیر معمولی قدرت حاصل ہو چکی تھی اور ان مختلف زبانوں اور بولیوں کے مشترک ومختلف عناصر نے ہی آپ کی لسانیات میں دلچسپی پیدا کی ہے، جس میں پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی اور ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی سے ہونے والے آپ کے صحت مند لسانی مباحث نے گہرائی پیدا کی اور ان لسانی مباحث کا اکثر موضوع ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی ''ہندوستانی لسانیات'' ہوتی۔ کیوں کہ اس دور میں لسانیات کے نصاب میں یہی کتاب شامل تھی اور لسانی ذوق رکھنے والے طلبہ و اساتذہ کے پیش نظر بھی یہی کتاب ہوتی تھی۔ دراصل اس دور میں لسانی سرمائے کی کمیابی کی وجہ سے ''ہندوستانی لسانیات اور ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ'' دونوں ہی توجہ کا مرکز بنے رہتے تھے۔ لہٰذا آپ کی لسانی ذہن سازی میں ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ کا بھی اثر رہا۔ اور یہ اثر اس وقت اور زیادہ ہو گیا جب ڈاکٹر زورؔ سے آپ کی پہلی شخصی ملاقات ہوئی۔ تب جب ڈاکٹر زورؔ آپ کے پی ایچ ڈی کے زبانی امتحان (Viva Voice) کے لیے بیرونی ممتحن بن کر آئے تھے۔ اس کے بعد آپ دونوں کی کئی ملاقاتیں بھی ہوئیں اور خط کتابت کا سلسلہ بھی رہا۔ اسی طرح ڈاکٹر احتشام حسین سے بھی ملاقاتیں اور خط و کتابت رہیں۔ جس سے آپ کی لسانی ذہن سازی میں ایک نیا موڑ آیا اور آپ کو انہی اساتذہ وقت نے مشورہ دیا کہ آپ سمر اسکولس سے منسلک ہو کر استفادہ حاصل کریں۔ جس پر آپ نے عمل کرتے ہوئے ''سمر اسکول کورسس'' کا سلسلہ شروع کیا۔

1.3.1۔ سمر اسکول کورسس اور عبدالستار دلوی

سمر اسکول کورسس مختصر مدتی ہوتے ہیں۔ جو بالخصوص گرمائی تعطیلات میں منعقد ہوتے ہیں۔ یہی وجہ

ہے کہ ان کورسس میں لسانیات کے بہترین اور ماہر اساتذہ کی خدمت حاصل کی جاتی ہے کیوں کہ اساتذہ کے علمی تبحر سے طلبہ مستفیض ہو سکے۔ اسی لیے عبدالستار دلوی نے بھی اساتذہ وقت کے مشورے پر دھاڑوار، کرناٹک کے سمر اسکول میں داخلہ لے لیا۔ یہاں آپ اکیلے اردو کے طالب علم تھے۔ اسی طرح اپ نے روی شنکر یونی ورسٹی اور میسور یونی ورسٹی سے بھی سمر اسکول کورسس کیے ان اسکولوں میں جو اساتذہ طلبہ کو مستفیض کرتے ان میں پروفیسر میتلے، پروفیسر گاڑگے، پروفیسر کیلکر اور پروفیسر خوبچندانی وغیرہ وغیرہ ہوتے جو اس وقت لسانیات کے میدان میں چوٹی کے ماہرین مانے جاتے تھے اور سمر اسکولس میں ان اساتذہ و دیگر طلبہ سے ہونے والے لسانی مباحث نے نہ صرف آپ کی ذہن سازی کی بلکہ آپ کے ذہن میں لسانی کشادگی اور وسعت پیدا کی۔ اور یہی آپ کی لندن یونی ورسٹی میں لسانیات کی اعلیٰ تعلیم کا سبب بنی۔ دراصل آپ کی لسانیات سے دلچسپی اور زیادہ سے زیادہ جاننے کی جستجو ہی آپ کو لندن یونی ورسٹی کے کورس Advance Training in Gen Linguistics and Phonetics تک لے آئی۔ یہاں آپ نے 1962-63 کے درمیانی وقفے میں لسانایت اور صوتیات کی خصوصی تعلیم پائی۔ جس کے بعد آپ نے فیصلہ کیا کہ اب آپ لسانیات میں پی ایچ ڈی کریں گے۔ اور اس کے لیے آپ نے ''بمبئ یونی ورسٹی کے شعبہ لسانیات میں پی ایچ ڈی'' کے لیے داخلہ لے لیا۔

1.3.2۔ بمبئ یونی ورسٹی کا شعبہ لسانیات اور عبدالستار دلوی

ویسے تو بمبئ یونی ورسٹی آپ کی مادر علمی ہے۔ آپ نے یہیں سے ایم اے اردو، ایم فل اردو اور پی ایچ ڈی اردو جیسے اعلیٰ تعلیمی کورسس کیے تھے مگر اس بار آپ بمبئ یونیورسٹی کے شعبے لسانیات سے منسلک ہوئے تو اس شعبے کے صدر پروفیسر گجیند رگڈکر ہی آپ کے نگران مقرر ہوئے۔ اس کے بعد جب موضوع کے انتخاب کا وقت آیا تو آپ کے کرم فرما ڈاکٹر احتشام حسین نے آپ کو دو موضوعات تجویز کیے۔ جن میں سے ایک موضوع Bombay Urdu : A Study in Linguistic Behavviar کو آپ نے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ کیوں کہ اردو سے آپ پہلے ہی پی ایچ ڈی کر چکے تھے۔ وہ زبانیں (انگریزی، مراٹھی اور گجراتی) جن سے

متاثر ہوکر اردو کی ''بمبیا اردو'' بولی وجود میں آئی تھی وہ آپ نے اسکول میں بطور مضامین پڑھ رکھی تھیں، ۔ایسے میں اپنی روزمرہ کی بولی ''بمبیا اردو'' کو اپنا موضوع تحقیق بنانا آپ نے زیادہ مناسب سمجھا اور 67-1964 کے درمیانی تین سال میں آپ نے اپنا پی ایچ ڈی مکمل کرلیا اسی دوران اسماعیل یوسف کالج اور الفنسٹن کالج میں لسانیات کے لیے مہمان لکچرر کی بھی خدمات انجام دیتے رہے۔اسی اثنا میں (1967) ہی اردو،لسانیات اور مراٹھی سے واقفیت کی بنا پر آپ کا انتخاب ''بحیثیت ڈائرکٹر مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر اور لائبریری'' میں ہوگیا۔

1.3.3۔ سنیتی کمار چٹرجی، پنڈت ستیو مادھوراؤ پگڑی، مسعود حسین خان اور عبدالستار دلوی

عبدالستار دلوی جب مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر اور لائبریری کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے تو آپ نے یہاں لکچررس توسیعی خطبات اور سمینارس کے لیے مقررین کی شکل میں مختلف ذی علم شخصیتوں کا انتخاب کیا اور ان کے علم وفضل سے اپنے قارئین کو محظوظ بھی کیا۔ان ہی مقررین میں عالمی شہرت یافتہ ماہر لسانیات پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی بھی شامل ہیں۔لیکن افسوس کے پروفیسر چٹرجی سے آپ کے روابط ان کی عمر کے آخری حصے میں یعنی ان کی وفات سے پانچ چھ سال پہلے قائم ہوئے۔مگر ان تقریباً پانچ چھ سال ہی کے روابط نے عبدالستار دلوی پر پروفیسر چٹرجی کا دیرینہ اثر چھوڑا ہے۔اسی طرح ایک اور مقرر ماہر لسانیات پنڈت ستیو مادھوراؤ پگڑی ہیں۔جن سے آپ کی دیرینہ ملاقاتیں اور صحبتیں رہیں۔ بقول عبدالستار دلوی، پنڈت ستیو مادھوراؤ پگڑی انہیں ہر اتوار کی صبح فون کرکے پوچھتے کہ آج کیا کررہے ہوں اور اگر کچھ خاص نہیں کررہے ہیں تو گھر آجایئے۔'' اور آپ ان کی دعوت پر ان کے گھر چلے جاتے۔ وہاں پورا دن مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال ہوتا رہتا۔جس میں کئی بار ہم خیال اور اختلاف کی صورتیں بھی پیش آتیں مگر صحت مند انداز میں۔ان کے علاوہ اردو لسانیات کی قد آور شخصیت پروفیسر مسعود حسین خان سے بھی آپ کے تعلقات رہے جس کے دوران ملاقاتیں اور خط وکتابت بھی ہوتی رہی۔دراصل

آپ کے اور پروفیسر مسعود حسین خان کے تعلقات میں لسانی اصطلاح سازی کمیٹی کی میٹنگوں نے اہم رول ادا کیا، کیوں کہ جب یہ کمیٹی قائم ہوئی تو اس کے صدر ڈاکٹر احتشام حسین تھے اور اراکین میں پروفیسر مسعود حسین خان، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور عبدالستار دلوی و دیگر شامل تھے۔ اس وقت آپ ان جملہ اراکین میں سب سے کم عمر اور کم تجربے کار تھے۔ مگر بقول عبدالستار دلوی، ڈاکٹر احتشام حسین ان کا حوصلہ بڑھانے کے لیے انہیں مخاطب کر کے ان سے ان کی رائے پوچھتے اور کبھی کبھی تو سب کی رائے جان لینے کے بعد آخری فیصلہ ان ہی پر چھوڑ دیتے۔

اس وقت عبدالستار دلوی کے یہاں لسانیات کا علم تو تھا مگر ڈاکٹر احتشام حسین کے اس رویے سے ان میں خود اعتمادی اور حوصلہ بڑھا۔ مگر جب ڈاکٹر احتشام حسین کا انتقال ہوا تو پروفیسر مسعود حسین خان کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے اور آپ نے نہ صرف اپنی کارکردگی سے انہیں متاثر کیا بلکہ وقفے وقفے سے انہیں اپنے مفید مشوروں سے بھی نوازتے رہے اور یہ سلسلہ آپ کی وفات تک چلتا رہا۔

مختصراً کہا جائے تو مختلف زبانیں جاننے سے، ان کے درمیان مشابہت و اختلاف رکھنے والے عناصر نے عبدالستار دلوی کو علم لسانیات سے دلچسپی دلائی اور اس دلچسپی کو ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ، پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی، ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی، ڈاکٹر احتشام حسین، پروفیسر مسعود حسین خان، پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی، پنڈت سیتو مادھوراؤ پگڑی اور سمراکولس سے وابستہ مختلف ماہرین لسانیات نے، مختلف ماحول میں اور مختلف طرح سے متاثر کیا جس کا لازمی نتیجہ تھا کہ عبدالستار دلوی کی شخصیت میں علم لسانیات کا سنجیدہ ذوق پیدا ہوا۔

کہتے ہیں کہ سکھانے والا استاد ہوتا ہے مگر ہمارے اطراف و اکناف کا ماحول بھی ہمیں بہت متاثر کرتا ہے، بہت کچھ شعوری اور غیر شعوری طور پر سکھا دیتا ہے، لہٰذا عبدالستار دلوی کو بمبئی میں جو علمی، ادبی اور لسانی ماحول اور شخصیات ملیں جنہوں نے انہیں متاثر کر کے ادارہ ساز، ادیب، نقاد اور محقق جیسے مختلف میدانوں میں معتبر و مستند بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔

oOo

﴿باب دوم﴾

عبدالستار دلوی: حیات، شخصیت اور ماحول

2۔ عبدالستار دلوی: حیات، شخصیت اور ماحول

2.1۔عبدالستار دلوی کی حیات (سوانحی خاکہ)

2.1.1۔ خاندانی پس منظر

2.1.2۔ والدین اور بھائی، بہن

2.1.3۔ پیدائش

2.1.4۔ بچپن

2.1.5۔ تعلیم

2.1.6۔ ملازمت

2.1.7۔ شادی

2.1.8۔ اولادیں

2.1.9۔ انعامات واعزازات

2.1.9.1۔ انعامات

2.1.9.2۔ اعزازات

2.1.10۔ اسفار

2.2۔ عبدالستار دلوی کی شخصیت

2.2.1۔ حلیہ خدوخال

2.2.2۔ لباس

2.2.3۔ غذا

2.2.4۔ اخلاق وآداب

2.2.5۔ اہل خانہ کے ساتھ تعلقات

2.2.6۔ دوست واحباب کے ساتھ تعلقات

2.2.7۔ شاگردوں کے ساتھ تعلقات

2.3۔ عبدالستار دلوی کا ماحول

2.3.1۔ گھر کا ماحول

2.3.2۔ اسکول کا ماحول

2.3.3۔ کالج کا ماحول

2۔ عبدالستار دلوی: حیات، شخصیت اور ماحول

عبدالستار دلوی اردو ادب کا ایک معتبر نام ہے جو مسلسل چھ دہائیوں سے بنا رکے، تھکے لکھتے جا رہے ہیں اور آج بھی ان کا قلم متحرک ہے وہ محقق، نقاد، مرتب، قومی یکجہتی کے سفیر (مترجم)، ماہر لسانیات، اقبال شناس اور سردار جعفری شناس کی حیثیت سے اردو ادب کی بے لوث خدمت انجام دے رہے ہیں۔ محمد ایوب واقفؔ لکھتے ہیں:

> ''وہ اپنی علمی و ادبی شخصیت کو خوب سے خوب تر کرنے اور اسے پائے ثبات تک پہنچانے میں دل و جان سے مصروف و منہمک رہے۔ ایسی پرخلوص سچی اور بے لاگ جدوجہد کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ آج وہ ہندوستان کے مستند اور معتبر ماہرین لسانیات اور درجہ استناد تک پہنچنے والے محققین اور ناقدین کی صف میں شامل ہیں۔''

(ممبئی کے ساہتیہ اکادمی انعام یافتگان: شاعر، ادیب اور مترجم، ص:176-177)

عبدالستار دلوی کا تعلق اہل نوائط سے ہے اور نوائط عرب نژاد خاندان ہے۔ بے محل نہ ہوگا اگر اس موقع پر خاندان نوائط کی مختصر تاریخ بیان کر دی جائے، یہ بات واضح رہے کہ قوم ''نوائط'' کا نسبی شجرہ حضور اکرم ﷺ سے شروع ہوتا ہے، لیکن آگے جا کر یہ تین شاخوں یا سلسلوں میں منقسم ہو جاتا ہے، جہاں پہلی شاخ کی ابتدا حضرت نضر بن کنانہؓ سے ہوتی ہے جن کو عربوں نے جدالقریش بھی کہا ہے وہیں دوسری شاخ یا سلسلہ حضرت عبداللہ بن جعفر طیارؓ تک پہنچتا ہے۔ جن کو حاجت مندوں کا باپ کہا گیا ہے علاوہ بریں تیسرے سلسلے کے نوائطی حضرت سیدنا اسماعیل بن جعفر صادقؓ کی اولادیں کہلاتے ہیں۔ بہ ظاہر یہ تینوں سلسلے ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں مگر رسالتِ مآب سے ان کا رشتہ ان کو متحد رکھتا ہے۔ شمس العلماء نواب عزیز جنگ ولاؔ ان تینوں سلسلوں کے باہمی اتحاد سے متعلق فرماتے ہیں:

''ان تینوں سلسلوں کے افراد میں باہمی اتحاد ہے۔کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے ایک دوسرے کو اپنی قوم کا شخص خیال کرتا ہے اور تینوں میں باہمی سمدھیانہ ہوتا ہے۔فی نفس الامر سلسلہ ثالث کی بزرگی باعتبار اعزاز سیادت سلسلہ اول ودوم پر فائق ہے۔'' (تاریخ النوائط،اشاعت دوم،ص:46)

دراصل قوم نوائط کا اصل وطن مدینہ مطہرہ ہے لیکن بعض وجوہات کی بنا پر انہیں یہاں سے ہجرت کر کے بغداد میں قیام کرنا پڑا اور جب بغداد کے بھی حالات ناساز گار ہوئے تو یہ قوم دوبارہ ہجرت کے بعد بصرہ پہنچی اور جب بصرہ کے حکمران کا حکم ماننا گوارا نا ہوا تو پھر یہ قوم بحری راستوں سے ہوتے ہوئے ہندوستان میں وارد ہوئی اور کوکن وملیبار کے ساحل پر بس گئے،لیکن بعد کے زمانے میں انہوں نے پھر ہجرت کی اور مدراس، دہلی، گوا، بیجاپور، ممبئی، حیدرآباد ودیگر مقامات پر پھیل گئے۔ خاص بات یہ ہے کہ اہل نوائط اپنے مخصوص القاب رکھتے ہیں جیسے انتولے، باجتری، بدری، پالکر، تانتلی، ٹینڈاسی، جدی، چیندہ، چودہری،خطیب، دلوائی، روگھے، سعید،شکری،صابر،صلواتی، طاہر،عنبر خالی،غریب،قریشی،کوکنی،گوڈرے،لوگڑی،مامون، ملک وغیرہ وغیرہ۔بہر حال یہاں لقب دلوی اور دلوائی کے درمیان فرق کو جان لینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے اور اس فرق کو عبدالستار دلوی یوں بیان کرتے ہیں:

''لقب عام طور پر جگہ اور پیشے سے تعلق رکھتے ہیں۔جگہ کی مناسبت سے نام ہیں۔ وہ علاقائی لقب کہلاتے ہیں جیسے دابھوکل کر، ہرے کر،جنجیر کر وغیرہ۔ دوسرے القاب پیشے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جیسے قاضی پٹیل،دیشمکھ،کلکرنی اور دلوی وغیرہ۔دلویوں میں سے ایک گروہ نے اپنے آپ کو''اردووا'' لیا اور اسے فارسی یا عربی رنگ دینے کی کوشش کی۔اس گروہ نے دلوی کے مقابلے میں تھوڑا سا فرق پیدا کر کے امتیاز پیدا کیا اور اپنے آپ کو دلوی کے بجائے دلوائی بنالیا۔''

(خاندان''دلوی''پر ایک نظر،غیر مطبوعہ)

اگر چہ کہ ''دلوی'' اور ''دلوائی'' دونوں القاب الگ الگ معلوم ہوتے ہیں مگر عبدالستار دلوی کی رائے سے واضح ہوجاتا ہے کہ یہ دونوں القاب رکھنے والے افراد ایک ہی خاندان سے متعلق ہیں۔

آیئے اب دلوی خاندان کو مختصراً جان لیں، دراصل دلوی خاندان کا براہ راست تعلق عادل شاہی سلطنت سے ہے۔ چونکہ دَل کے معنی فوج اور دلوی کے معنی کمانڈر کے ہیں اسی لحاظ سے دلوی خاندان کا ایک گروہ جو کہ خان دلوی ہے وہ پیشہ سپہ گری سے وابستہ رہے ہیں اور ان لوگوں نے سلطنت بیجاپور میں اعلیٰ فوجی عہدے پائے، جب کہ دلوی خاندان کا دوسرا گروہ شیخ دلوی ہے جو صرف تعلیمی امور پر نظر رکھتا ہے۔

تاریخ میں دلوی خاندان کے تین اہم بزرگ، محمد حسین دلوی، طہٰ ابراہیم دلوی اور معتبر خان دلوی کے نام ملتے ہیں، چنانچہ محمد حسین دلوی، محمود گاواں کے دور حکومت میں ''پرگنہ'' دابھول کے صوبیدار تھے جہاں انہوں نے محمود گاواں کے خلاف بغاوت کردی تھی جو کہ بعد میں رفع ہوگئی، مگر محمود گاواں نے اس کا ذکر اپنے خطوط ''ریاض الانشاء'' میں کیا ہے۔ جس کی بنا پر ہم محمد حسین دلوی کو دلوی خاندان کے سب سے قدیم بزرگ مان سکتے ہیں اور اس خاندان کے دوسرے اہم بزرگ طہ ابراہیم دلوی ہیں، جو دابھیل کے دلوی خاندن کے جدامجد ہیں، اور جہاں تک معتبر خان دلوی کا تعلق ہے وہ عہد اورنگ زیب میں مغل صوبیدار تھے اور ان کا مزار آج بھی شہر کلیان میں موجود ہے۔

دلوی خاندان کا تعلق عادل شاہی سلطنت کے بعد سلطنتِ خداداد سے بھی رہا کیوں کہ سلطنت خداداد کے حکمراں سلطان حیدر علی اور ٹیپو سلطان کا تعلق بھی اہل نوائط سے ہے، گویا دلویوں نے یہاں بھی اعلیٰ فوجی عہدے سنبھالے لیکن زوال سلطنت خداداد کے بعد دلویوں نے بڑی تعداد میں نقل مکانی کی اور کوکن کے مختلف اضلاع میں سکونت اختیار کرلی، چونکہ ''دلوی'' آبادی کثیر تعداد میں دابھیل اور پنگار میں آباد ہے اسی لیے گمان غالب ہے کہ دابھیل اور پنگار کے دلویوں کا تعلق ریاست میسور سے رہا ہو۔ مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ عبدالستار دلوی کے آباواجداد کا تعلق دابھیل، تعلقہ داپولی، ضلع رتنا گیری سے ہے، آپ کے دادا محترم محمد احمد دلوی مرحوم نہایت متقی اور پرہیز گار

انسان تھے اور پیشہ تجارت سے وابستہ تھے۔

عبدالستار دلوی کے والد محترم کا نام محمد اسماعیل دلوی ہے جو ہمیشہ تجارت سے وابستہ رہے اور چالیس سال کیپ ٹاؤن جنوبی آفریقہ میں مقیم رہنے کے بعد 1948ء میں مستقل سکونت کے لیے ہندوستان لوٹ آئے لیکن اسی سال انتقال کر گئے۔ اور آپ کی والدہ محترمہ کا نام خدیجہ دلوی ہے، ان کی خاص بات یہ ہے کہ وہ خود بھی اردو پڑھتی اور اپنے بچوں کو بھی اردو پڑھاتی تھیں۔ افسوس کہ 1984ء میں آپ نے وفات پائی۔

محترم اسماعیل دلوی اور محترمہ خدیجہ دلوی کی تین اولادیں ہیں۔ جن میں سے پہلی اولاد ایک لڑکی شریفہ دلوی ہیں، جن کی شادی آپ کے چچازاد بھائی محترم یوسف صالح دلوی سے ہوئی تھی، مگر افسوس اسی بات کا کہ آپ نے اپنی والدہ کے انتقال کے اندرون تین سال ہی میں 1987ء میں اس دنیا کو الوداع کہہ دیا۔ البتہ ان کے بعد آپ دونوں کی دوسری اولاد محمد قاسم دلوی ہیں جو کہ پہلے بمبئی کے ایک اسکول میں پرنسپل تھے لیکن بعد میں لندن چلے گئے اور وہاں Head of Multi Community and Bilingual Education کے عہدے پر فائز تھے، جس کے تحت انہوں نے تقریباً سو اسکولوں میں اردو زبان کو متعارف کروایا، بہرحال ان کا ایک غیر معمولی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز کے اشتراک سے Teach Your Self Urdu نامی کتاب لکھی ہے جو لندن، جاپان اور دیگر ممالک میں خاصی مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ اور 2 جون 2017 کو ہارٹ اٹیک کی وجہ سے آپ اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔

عبدالستار دلوی کا پورا نام عبدالستار محمد اسماعیل دلوی ہے۔ اور آپ کی جائے پیدائش گاؤں دابھیل، تعلقہ داپولی، ضلع رتنا گیری ہے، مگر آپ کی تاریخ پیدائش جو آپ کو آپ کی اماں بتاتی تھیں وہ 18 اگست 1937ء ہے لیکن آپ کے تمام سرکاری کاغذات میں آپ کی تاری پیدائش یکم ستمبر 1937ء ملتی ہے جو کہ غلط ہے، بقول عبدالستار دلوی ان کی پیدائش کے بعد ان کا نام سرکاری کاغذات میں درج کرانے کی ذمہ داری ان کے چچا کی تھی لیکن ان کو سرکاری دفتر جانے میں تاخیر ہوئی جس کا یہ نتیجہ ہوا۔

عبدالستار دلوی کا بچپن دیہات کی فضا میں گزرا، جہاں کھیتوں اور امرایوں میں کھیلنا، پرندوں کے پیچھے بھاگنا، درخت سے جامن توڑنا، کشتیوں میں کھیلنا اور سواری کرنا ان کے محبوب مشاغل تھے۔آپ کا ننھیال آپ کے گھر کے پڑوس ہی میں تھا جہاں آپ کا جب جی کرتا آپ پہنچ جاتے، آپ کو اپنی نانی اور ممانی سے خاص انسیت تھی کیوں کہ وہ بھی آپ کو لاڈ کرتیں تھیں اور جہاں تک آپ کے غیر مسلم ملازمین کا سوال ہے وہ آپ کو اور آپ ان کو عزیز رکھتے تھے، آپ کو آپ کی والدہ محترمہ بچپن ہی سے اردو پڑھاتی تھیں۔ دراصل آپ کی مادری زبانیں کوکنی اور اردو ہیں۔لیکن بچپن ہی سے آپ کو کوکنی اردو اور مراٹھی تینوں زبانوں سے واقفیت حاصل ہے۔

آپ کی ابتدائی تعلیم لوکل بورڈ مراٹھی اسکول میں ہوئی لیکن یہاں پر مسلمانوں کے لیے اردو زبان لازمی تھی، یہاں تیسری جماعت تک کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ کو چوتھی جماعت کے لیے اینگلو اردو ہائی اسکول میں داخل کرایا گیا مگر جلد ہی آپ کو احمد سیلر ہائی اسکول میں منتقل کروا دیا گیا۔ کیوں کہ یہ اسکول انجمن اسلام کے زیرِ اہتمام چلایا جاتا تھا اور ساتھ ہی ایک اعلیٰ معیار کا اسکول تصور کیا جاتا تھا جہاں آپ نے پانچویں جماعت تک میٹرک تک کی تعلیم پائی اور 1954 میں میٹرک درجہ اول میں کامیاب کر کے اسا سکول کو خیر آباد کہہ دیا۔ میٹرک کے بعد کی منزل انٹرمیڈیٹ یا 2+ ہے جس کے لیے آپ نے اسماعیل یوسف کالج میں داخلہ لیا، یہاں سے آپ نے 1956ء میں انٹرمیڈیٹ اور 1958ء میں بی اے آنرس کی ڈگریاں لیں جن میں اردو اور اسلامی کلچر آپ کے پسندیدہ مضامین رہے اور بی اے میں امتیازی کامیابی پر آپ کو دیکھشنا فیلوشپ کے ساتھ ساتھ St. Xavier's Gold Medal عطا کیا گیا۔ جس کے فوراً بعد یعنی 1960 میں آپ نے بمبئی یونی ورسٹی سے ایم اے اردو امتیازی نشانات کے ساتھ کامیاب کیا اور اسی بنا پر آپ Chancellor gold medal چانسلر گولڈ میڈل کے مستحق ٹھہرے۔ انٹرمیڈیٹ بی۔اے اور ایم اے کی شاندار کامیابیوں کے بعد اب باری ہے پی ایچ ڈی کی تو اس مرحلے میں آپ نے ''محمد حسین آزاد: حیات اور کارنامے'' کے موضوع پر ایک جامع مقالہ لکھ کر 1962 میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لی اور اس جامع مقالے کے نوک پلک درست کرنے والے نگران ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی تھے، جب کہ

زبانی امتحان لینے والے بیرون ممتحن نامور دکنی محقق ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ تھے۔ بقول عبدالستار دلوی ’’جو نہ صرف آپ کے مقالے کی جامعیت سے متاثر تھے بلکہ آپ کے زبانی امتحان سے بھی بہت خوش تھے۔

کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں بمبئی یونی ورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ’’سرکریم اسکالرشپ‘‘ دی جاتی تھی، چونکہ اس دور میں اسکالرشپ طلبہ کے لیے کسی نعمت سے کم نہ تھی اسی وجہ سے آپ نے بھی دوران پی ایچ ڈی درخواست دی جو کہ منظور بھی ہوگئی اور اس اسکالرشپ کے تحت آپ کو لندن یونی ورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ آفریقن اسٹڈیز میں ایک سال کے قیام کا موقع مل گیا، قبل از قیام لندن، ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ، پروفیسر احتشام حسین اور پروفیسر مسعود حسین خان نے آپ کو اپنے مفید مشوروں سے نوازا، بالخصوص پروفیسر مسعود حسین خان کا مشورہ تھا کہ آپ لندن جانے سے پہلے کسی سمر اسکول میں داخلہ لے لیں، ظاہر ہے کہ ان اساتذہ وقت کے مشوروں کو آپ نظر انداز نہیں کرسکتے تھے اسی لیے آپ نے سمر اسکول آف لنگویسٹکس (Summer School of Linguistics) کرناٹک میں داخلہ لے لیا مگر اس اسکول مین آپ اکیلے اردو کے طالب علم تھے، غالباً سمر اسکول کے فوراً بعد یعنی 1962-63 کے درمیان ایک سال میں آپ نے لندن یونی ورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ آفریقن اسٹڈیز سے Advance Training in Gen Linguistics and Phonetics کی تعلیم پائی، لندن سے واپسی کے بعد بھی آپ نے سمر اسکولس کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے روی شنکر یونی ورسٹی اور میسور یونی ورسٹی سے دو اور سمر اسکول کورسس کیے، اسی اثنا میں آپ کو لسانیات میں پی ایچ ڈی کے لیے فیلوشپ 1964-67 بھی مل گئی جس نے آپ کا لسانیات سے رشتہ اور گہرا کردیا کیوں کہ آپ نے پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے Bombay Urdu : A Study in Linguistics behavior کے موضوع پر مقالہ لکھا جو کہ آپ کو پروفیسر احتشام حسین نے تجویز کیا تھا اور اس مقالے کی تسوید کے دوران آپ کے دشوار کن مرحلوں میں رہنمائی کرنے والے نگران ڈاکٹر گجیند رگڈکر، صدر شعبہ لسانیات، بمبئی یونی ورسٹی تھے۔

یہاں یہ بات واضح کردوں کہ 1943 سے 1967ء کا دور آپ کی طالب علمی کا دور ہے جس میں آپ نے اسکول سے لے کر پی ایچ ڈی تک کی تعلیم پائی لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسی دور میں آپ نے اپنی عارضی ملازمت کا آغاز کردیا تھا جس کے تحت آپ نے 62-1961 الفنسٹن کالج میں، 64-1963 اسماعیل یوسف کالج میں بہ حیثیت لکچرر رہے، یہ سلسلہ آگے بھی چلا یعنی 67-1964ء سے 71-1970 کے دوران دومرتبہ آپ نے شعبۂ اردو بمبئی یونی ورسٹی کے طلبہ کے لیے مہمان لکچرر کی خدمات انجام دیں ہیں۔

بس یوں سمجھئے کہ آپ کی مستقل ملازمت کا آغاز مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر اور لائبریری کے بانی ڈائرکٹر کی حیثیت سے ہوتا ہے جہاں آپ نے 1967 میں خالی جائیداد دیکھ کر درخواست دی منتخب بھی ہوئے اور 1967ء اور 1982ء تک ڈائرکٹر کے فرائض انجام دیتے رہے اس کے علاوہ آپ 1982 سے 1997 تک صدر شعبہ اردو وکرشن چندر پروفیسر، بمبئی یونی ورسٹی رہے لیکن اس طویل مدت کے درمیان میں دوسال یعنی 96-1996 آپ بانی پروفیسر وصدر اردو سکشن، عین شمس یونی ورسٹی، قاہرہ مصر میں بھی خدمات انجام دے آئے۔ ابھی آپ مصر سے لوٹے ہی تھے، صدر شعبہ اردو کے عہدے پر برقرار ہی تھے کہ حکومت مہاراشٹر نے آپ کو 1996ء میں مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی کا چیرمین مقرر کردیا اور اس کی مدت 2000ء تک رہی، دراصل آپ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو وساہتیہ اکادمی میں بہ حیثیت چیرمین (1996-2000) کے دوران 1997ء میں صدر شعبہ اردو کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے مگر 1998 میں منسٹری آف لکچر، حکومت ہند میں سینئر ریسرچ فیلو بھی متعین ہوئے اور 2000ء میں اکادمی کی چیرمین شپ اور منسٹری آف کلچر، حکومت ہند کی ریسرچ فیلوشپ دونوں کی معیاد ختم ہوگئی، مگر آپ کی ذی علم شخصیت کو 2001ء ہی میں اور 2005ء تک کے لیے دکن مسلم ایجوکیشن اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، پونے میں بہ حیثیت ڈائرکٹر منتخب کرلیا گیا یہاں سے آپ نے یونی ورسٹی آف حیدرآباد کا رخ کیا جہاں آپ نے 2005ء سے 2006ء کے دوران شعبہ اردو میں مہمان پروفیسر کی کارکردگی انجام دی۔ اور حیدرآباد میں اپنی خدمات کی انجام دہی کے بعد آپ اپنے وطن ممبئی لوٹ آئے تو ممبئی کی مشہور درگاہ حضرت مخدوم علی

مہائمیؒ پر بنے ٹرسٹ حضرت مخدوم علی مہائمیؒ میموریل اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اینڈ لائبریری میں ڈائرکٹر کی حیثیت سے مقرر ہوئے اور 2008ء تک رہے لیکن اس کے درمیان ہی میں یعنی 2007ء میں آپ دوبارہ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی کے چیرمین نامزد ہوئے اور یہ چیرمین شپ 2011ء تک باقی رہی، جب کہ 2011 سے 2013 کے درمیانی دو سال آپ مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی میں مشیر Advisor کے عہدے پر فائز رہے، لیکن اب فی الوقت 2007ء سے آپ ابھی تک انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کے منصب پر برقرار ہیں۔

عبدالستار دلوی کی شادی محترمہ میمونہ علی مقدم سے 10 اکتوبر 1958ء کو ہوئی، کہا جاتا ہے کہ محترمہ میمونہ دلوی کے آباواجداد کا تعلق بھی ضلع رتنا گیری سے تھا لیکن آپ کے دادا عبدالغنی مقدم ایک بار بمبئی آئے تو یہیں کے ہوکر رہ گئے، آپ اور میمونہ دلوی دونوں ہم جماعت تھے، دونوں کے مزاج میں یکسانیت تھی اسی لیے ان کی شادی شدہ زندگی بڑی خوشگوار گزاری۔

محترمہ میمونہ دلوی سابق صدر شعبہ اردو اسماعیل یوسف کالج ممبئی رہی ہیں جہاں انہوں نے اپنی زندگی کے تیئیس 33 برس درس وتدریس میں گزارے، واضح رہے کہ آپ نے تین کتابیں بمبئی میں اردو، دکھڑے اور کوکن اور ممبئی کے اردو لوک گیت کے علاوہ متعدد مضامین اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ آپ کی شخصیت اور فکر وفن پر جو مضامین لکھیے گئے ہیں اور جو خود آپ نے اپنی یادگار چھوڑے ہیں ان کا ایک انتخاب ڈاکٹر معزہ (قاضی) دلوی نے ''ڈاکٹر میمونہ دلوی اعتراف خدمات اور منتخب مضامین'' کے عنوان سے یکجا کر دیا ہے، مگر افسوس کہ کچھ علالت کے بعد 20 ستمبر 2009ء کو آپ کا انتقال ہوگیا۔

عبدالستار دلوی کی تین اولادیں ہوئیں، آپ کی پہلی اولاد ایک لڑکا ہے جس کا نام سعد دلوی ہے انہوں نے پرنٹنگ ٹکنالوجی کا کورس کیا تھا اور اپنی مہارت کی وجہ سے اس کاروبار کو وہ بڑی خوبی سے چلائے تھے، افسوس یہ کہ عین جوانی میں 24 / جولائی 2008ء کو آپ اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ آپ کی شادی ہو چکی تھی جس سے آپ

کی دولڑکیاں ہیں سارا دلوی اور صبا دلوی۔

عبدالستار دلوی کو بڑے لڑکے سعد دلوی کے علاوہ دولڑکیاں ہیں، جن میں بڑی لڑکی ڈاکٹر معز دلوی فی الوقت صدر شعبہ اردو، ممبئی یونی ورسٹی کے عہدے پر فائز ہیں، اور وہ اپنے والدین کی طرح ایک علمی وادبی شخصیت ہیں اور ان کی اس شخصیت کو اور بلند کرنی والی چیزوں میں ان کی منفرد موضوعات پر لکھی گئی کتابیں ہیں جو اس طرح ہیں۔

(1) اردو میں منظوم عوامی ادب اور لوریاں

(2) اردو میں تحریک تعلیم نسواں اور خواتین کی اردو خدمات

(3) ''ڈاکٹر میمونہ دلوی اعتراف خدمات اور منتخب مضامین''

(4) ''اردو کی چند کلاسیکی مثنویاں'' اور

(5) ''مقالات ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی''۔ ان تصانیف کے علاوہ آپ کے مضامین ملک و بیرون ملک کے ادبی رسائل میں پڑھنے اور محظوظ ہونے کو ملتے ہیں، آپ کی دوسری اور سب سے چھوٹی لڑکی ڈاکٹر سمیہ دلوی ہیں جنھوں نے یونانی طبیبہ کالج سے BUMS کی تعلیم حاصل کی اور اپنے ذاتی دواخانے میں مصروف ہیں۔

عبدالستار دلوی کی علمی، ادبی و لسانی خدمات کے اعتراف میں انہیں مختلف ادارے، انجمنوں اور N.G.O کی جانب سے کثیر تعداد میں انعامات و اعزازات سے نوازا گیا ہے۔

انعامات:

☆ 1983ء میں میرؔ اکادمی لکھنؤ نے مجموعی ادبی خدمات کے اعتراف میں ''امتیاز میرؔ ایوارڈ'' دیا۔

☆ 1986ء میں مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی نے ''لسانی اور ادبی یکجہتی ایوارڈ'' عطا کیا۔

☆ 1990ء میں ساہتیہ اکادمی دہلی نے آپ کے ترجمہ شدہ ناول ''رن انگن'' پر ترجمہ ایوارڈ دیا۔

☆ 11 دسمبر 2009ء کو غالب ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔

☆ 2011ء میں میکش اکبر آبادی ایوارڈ ملا۔

☆ 2013ء میں ''شولا پور اردو ادبی کانفرنس قومی ایوارڈ'' ملا۔

☆ 15 اگست 2013 کو'' آرٹ سرکل فاؤنڈیشن ایوارڈ فار ایجوکیشن'' سے سرفراز کیا گیا۔

☆ 9 جنوری 2014 کو مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی نے ''سنت گیانیشور'' ایوارڈ دیا۔

☆ آپ کی مختلف کتابوں پر ہریانہ اردو اکادمی، بنگال اردو اکادمی اور اتر پردیش اردو اکادمی نے وقفے وقفے سے آپ کو ایوارڈس سے سرفراز کیا ہے۔

اعزازات:

1۔ ترقی اردو بورڈ کی پہلی مینجمنٹ کونسل کے رکن رہے۔

2۔ 1967ء میں ترقی اردو بورڈ کی لسانی اصطلاح سازی کمیٹی کے رکن رہے۔

3۔ 1975ء سے 1985ء تک ترقی اردو بورڈ کے لسانی اور ادبی پینل کے رکن رہے۔

4۔ 1975ء سے 1987ء تک مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی کے بانی جوائنٹ سکریٹری رہے۔

5۔ 1976ء سے 1978ء تک سنٹرل ہندی ڈائرکٹوریٹ، حکومت ہند کی ایگزیکیٹیو کونسل کے رکن رہے۔

6۔ 1977ء سے 1978ء تک بمبئی ٹی وی ایڈوائزری بورڈ کے رکن رہے۔

7۔ 1979ء سے 1989ء تک فلم سنسر بورڈ آف انڈیا کے رکن رہے۔

8۔ 1986ء سے 1989ء تک حکومت مہاراشٹر کے اسپیشل ایگزیکیٹیو مجسٹریٹ رہے۔

9۔ 1989ء سے 1995ء تک انجمن اسلام کی جنرل کونسل کے رکن رہے۔

10۔ 1990ء سے 1991ء تک انجمن ترقی اردو مہاراشٹر کے صدر رہے۔

11۔ 1991 میں مدھیہ پردیش کے ''اقبال سمان'' جیوری ممبر رہے۔

12۔ 1993ء سے 1997ء تک صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے یونی ورسٹی آف حیدرآباد اور جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے لیے رکن نامزد ہوئے۔

13۔ 1994ء سے 1996ء تک بانی پروفیسر، عین شمس یونی ورسٹی، مصر رہے۔

14۔ 1994ء ہی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے رکن بنائے گئے۔

15۔ 1996ء سے 2000ء تک مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی کے چیرمن رہے۔

16۔ 1996ء میں سیریل ''مولانا ابوالکلام آزاد'' کے مشیر رہے، جو 13 قسطوں پر مشتمل تھا اور اس کی اسکرپٹ محافظ حیدر نے لکھی تھی۔

17۔ انڈو عرب سوسائٹی کی مینیجنگ کمیٹی کے رکن رہے۔

18۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی فیکلٹی آف آرٹس کمیٹی کے رکن رہے۔

19۔ 1997ء میں انٹرنیشنل بیکولیریٹ ادارے کے مشیر رہے۔

20۔ 1998 سے 2000 ءتک منسٹری آف کلچر، حکومت ہند میں سینئر ریسرچ فیلو رہے۔

21۔ 2001 سے 2005ء تک اعزازی ڈائرکٹر دکن مسلم ایجوکیشن اینڈ ریسرچ سنٹر اور لائبریری رہے۔

22۔ 2006ء سے 2008 تک اعزازی ڈائرکٹر ''حضرت مخدوم علی مہائمی میموریل اورینٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور لائبریری رہے۔

23۔ 2006ء سے 2008ء تک مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی کی اکادمک کونسل کے رکن رہے۔

24۔ 2007 سے 2011 تک مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے چیرمن رہے۔

25۔ 2007ء سے تاحال انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ہیں۔

26۔ 18 مارچ 2009ء سے 2011 تک مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی ایگزیکیٹیو کونسل کے رکن رہے۔

27۔ 2011ء سے 2013 تک مولانا آزاد نیشنل یونی ورسٹی میں مشیر Advisor رہے۔

28۔ 2012ء سے تاحال نیشنل میشن فار مینو اسکر پٹ، منسٹر آف کلچر، حکومت ہند کے رکن ہیں۔

29۔ 2015ء سے تاحال قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی لسانیات اور سماجی لسانیات کمیٹی کے چیرمن ہیں۔

عبدالستار دلوی نے تعلیمی، تدریسی، تہذیبی اور ثقافتی امور کے سلسلے میں اندرون و بیرون ممالک کے کئی اسفار کیے ہیں جس میں انہوں نے اندرون ملک کے تمام بڑے شہروں کا سفر کیا ہے لیکن کچھ شہر تو ایسے ہیں جن کا آپ بار بار دورہ کرتے رہتے ہیں اور ان شہروں میں شہر حیدر آباد کا نام سرفہرست ہے۔

آپ نے اپنا پہلا غیر ملکی سفر تعلیمی غرض سے کیا تھا جب آپ نے 1962ء میں لندن یونی ورسٹی کے اسکول آف اورنٹیل اینڈ آفریقن اسٹڈیز میں ایک سال قیام کیا اور لسانیات کی اعلیٰ تعلیم پائی۔

1987ء میں آپ نے اپنا دوسرا سفر بھی لندن ہی کا کیا جس کے دوران آپ نے برٹش کونسل کے اسکالر کی حیثیت سے لندن یونی ورسٹی، ایڈنبرا یونی ورسٹی، آکسفورڈ یونی ورسٹی اور کیمبرج یونی ورسٹی میں مختلف موضوعات پر لیکچرز دیے۔

آپ 1988ء میں ہند مصر ثقافتی تبادلے Indo Egypt Cultural Exchange کے تحت

پہلی بار مصر گئے غالباً یہاں جامعہ ازہر، قاہرہ یونی ورسٹی اور عین شمس یونی ورسٹی میں ''اردو پر عربی کے اثرات'' اور اردو کے علاوہ دوسری ہندوستانی زبانوں پر عربی کے اثرات'' وغیرہ وغیرہ موضوعات پر لیکچرز دیے اور اس سفر میں آپ نے واپسی میں عمرہ کی سعادت اور مکہ معظّمہ و مدینہ منورہ کی زیادرت کا شرف حاصل کیا، ساتھ ہی اس سفر کے دوران جدہ یونی ورسٹی کے اساتذہ سے لسانیات کے موضوع پر تبادلہ خیال بھی کیا۔

آپ نے 1989ء میں لندن کا تیسرا سفر کیا یہاں اس بار آپ نے لندن یونی ورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن کے ایک سمینار میں ''اردو میں پیکر تراشی'' کے موضوع پر مقالہ پڑھا اور پھر یہیں سے ایڈنبرا یونی ورسٹی بھی گئے جہاں پر آپ نے اردو اور اسلامیات کے مختلف موضوعات پر خطبات بھی دیے۔

آپ نے 1989ء ہی میں جنوبی آفریقہ کا پہلا سفر کیا۔ اس سفر کے دورن آپ نے کیپ ٹاؤن اور ڈربن کی یونی ورسٹیوں میں لسانی و تہذیبی موضوعات پر لیکچرز دیے، اس کے علاوہ کیپ ٹاؤن کے حبیبہ کالج اور بزم ادب کے زیر اہتمام علمی و ادبی پروگراموں میں لسانی، ثقافتی اور ادبی موضوعات پر خطبات بھی دیے۔

آپ نے 1990ء میں دوسری بار مصر کا سفر کیا اور اس بار آپ کو حکومت ہند کے وفد کے ساتھ ہند و مصر سمینار میں شرکت کرنے کے لیے مصر بھیجا گیا تھا البتہ اس وفد کی لیڈر نجمہ ہبت اللہ تھیں۔

1994ء میں آپ نے حکومت مصر کی دعوت پر مصر کا تیسرا سفر کیا جس میں آپ نے عین شمس یونی ورسٹی کے ڈپارٹمنٹ آف اسلامک لنگوئجس میں اردو سکشن اور لائبریری قائم کی اور وہاں تقریباً دو سال قیام کر کے ان کی نشو و نما بھی کی۔

آپ نے 1995ء میں دوحہ، قطر میں جشن امیر خسرو میں منعقدہ سمینار بتاریخ 19 تا 21 اکتوبر میں مقالہ پڑھا در اصل یہ سمینار بزم اردو کا پانچواں سالانہ سمینار و مشاعرہ تھا۔

1997ء میں آپ نے لندن کا چوتھا سفر کیا کیوں کہ آپ مارچ 1997ء میں انٹرنیشنل بیکولیریٹ ادارے کے اردو ایکزمینیر Examiner منتخب ہوے تھے اور شہر کارڈف میں میٹنگ کے بعد آپ آکسفورڈ اور

کیمبرج یونی ورسٹیوں کی لائبریریوں میں ایک ماہ مصروف رہے۔

آپ نے 1997ء ہی میں ترکی کا بھی سفر کیا اور یہاں استنبول یونی ورسٹی کا دورہ کر کے وہاں کے وائس چانسلر (VC) سے غالبؔ اور امیر خسروؔ پر گفتگو بھی کی اور علاوہ بریں وہاں کی سابق انگریزی پروفیسر خالدہ ادیب خانم کے کمرے کی بھی سیاحت کی جو میوزیم میں تبدیل ہو چکا تھا جس سے نہ صرف آپ محظوظ ہوئے بلکہ یہاں کئی تصویریں بھی لیں جس کے بعد قونیہ میں قونیہ یونی ورسٹی میں خطبات دیے اور یہاں کی ایک مسجد میں نماز جمعہ بھی ادا کی۔

آپ 2001ء میں ایران شناسی کی غرض سے ایران گئے بقول عبدالستار دلوی یہاں آپ نے تہران، شیراز اور اسفہان کی یونی ورسٹیوں میں مختلف موضوعات پر لیکچر دیے اور فردوسی کے مزار کی سیاحت بھی کی۔

2001ء ہی میں آپ سعودی عرب کے نیشنل ڈے پر منعقد ہونے والی عالمی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے سعودی عرب تشریف لے گئے، جس کے لیے شاہ عبداللہ وزیر داخلہ سعودی عرب نے آپ کو مدعو کیا تھا اور واپسی میں آپ نے عمرہ کی سعادت بھی حاصل کی۔

آپ نے 2003ء میں لندن کا پانچواں سفر کیا اور اس سفر کی خاص وجہ ''نیشنل کونسل فار اردو ٹیچرز کانفرنس'' میں آپ کو کلیدی خطبہ دینا تھا۔

2007ء میں آپ نے لندن کا چھٹا سفر کیا جس کے دوران آپ نے انڈین ہائی کمیشن کی طرف سے نہرو سنٹر میں منعقدہ ایک بین الاقوامی سمینار میں مقالہ پڑھا اور اس مقالے کا عنوان ''دکنی فاؤنڈیشن آف اردو اینڈ ہندی'' تھا۔

2009ء میں آپ نے لندن کا ساتواں سفر کیا اور معلوم ہوتا ہے کہ اس بار بھی آپ ایک بین الاقوامی سمینار میں شرکت کرتے ہوئے (Sofi Songs in Indian Language) کے عنوان پر اپنا مقالہ پڑھا۔

مارچ 2014ء میں کویت میں بزم ادب نے آپ کی مجموعی ادبی خدمات کے اعتراف میں تہنیتی جلسہ منعقد کیا اس جلسہ میں آپ کے اعزاز میں چند تقاریر بھی ہوئیں۔ جس کے بعد آپ نے یہاں دس روز قیام بھی کیا۔

عبدالستار دلوی نے تقریباً سولہ غیر ملکی اسفار کیے جن میں سات اسفار لندن کے ہیں تین مصر کے، ساتھ ہی قطر کویت سعودی عرب، ترکی، ایران اور جنوبی آفریقہ کا ایک ایک سفر شامل ہے، یہ واضح رہے کہ ان سولہ اسفار میں صرف ایک تعلیمی سفر ہے اور باقی پندرہ اسفار آپ نے لیکچرز، سمینار اور کانفرنس میں شرکت ہی کی غرض سے کیے ہیں۔

شخصیت:

شخصیت چند ظاہری و باطنی عناصر پر مشتمل ہوتی ہے۔ جس کے ظاہری عناصر میں حلیہ (خدوخال) لباس اور غذا وغیرہ وغیرہ عناصر شامل رہتے ہیں جب کہ باطنی عناصر میں اوصاف اور فکر وغیرہ وغیرہ کا دخل رہتا ہے دراصل کچھ ایسے ہی ظاہری و باطنی عناصر سے ایک عمدہ شخصیت تشکیل پاتی ہے۔

اللہ رب العزت نے تمام انسانوں کے چہروں کو آنکھ، کان، ناک، ہونٹ اور پیشانی وغیرہ اعضا بخشے ہیں لیکن پھر بھی ہر انسان کا چہرہ دوسرے انسان کے چہرے سے مختلف ہے ظاہر ہے انسانی چہروں کے اس طرح مختلف ہونے کی خاص وجہ چہروں کے خدوخال ہیں۔ عبدالستار دلوی گول چہرہ، سیدھی ناک، عینک کے اندر تجسس بھری آنکھیں، کشادہ پیشانی سے مسحور کر دینے والے خدوخال رکھتے ہیں۔ آپ کے دلکش خدوخال سے متعلق محمد ایوب واقفؔ لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر عبدالستار دلوی شکل وصورت اور صباحت کے بھی دھنی ہیں۔ اللہ نے ان کے سراپے میں بڑی کشش، جاذبیت اور دلکشی پوشیدہ کر رکھی ہے۔ گول مٹول بھرا بھرا سا وجیہ ودل کشا چہرہ، کشادہ پیشانی سیدھی ناک، عینک کے اندر سے جھانکتی ہوئی متجسس اور تابندہ آنکھیں اور سر کے بالوں میں درمیان سے نکالی ہوئی سیدھی مانگ''۔

(ممبئی کے ساہتیہ اکادمی انعام یافتگان ''شاعر، ادیب اور مترجم''، ص: 173)

دراصل آپ اپنے ظاہری خدوخال سے ایک سنجیدہ مزاج انسان نظر آتے ہیں لیکن اصل میں آپ ایک

خوش مزاج انسان ہیں۔

لباس یا پوشاک انسان کی ظاہری وضع قطع میں مزید اضافہ کا ایک اہم ذریعہ ہے حالاں کہ لباس کی نوعیت کچھ حد تک مذہبی ہوتی ہے اور کچھ حد تک بدلتے رجحانات کا اثر بھی ہوتا ہے۔عبدالستار دلوی ایک سادگی پسند انسان ہیں اور یہ سادگی آپ کے زیب تن لباس میں بھی نظر آتی ہے جہاں اکثر اوقات سوٹ وٹائی اور سفاری میں ملوث دکھائی دیتے ہیں وہیں عام اوقات میں کرتا پاجامہ میں بھی نظر آتے ہیں آپ کو پہلے پینٹ شرٹ میں بھی دیکھا جاتا تھا لیکن اب آپ نے ان کا استعمال کم کر دیا ہے۔

انسان کی تین بنیادی ضروریات میں سے ایک اہم ضرورت غذا ہے اور جس کے حصول کے لیے انسان تا عمر کوشاں رہتا ہے اور کوئی ایسا نہیں جس کو یہ فکر لاحق نہ رہتی ہو۔عبدالستار دلوی کو کھانے میں جو بھی پیش کر دیا جائے وہ اسے خدا کا شکر سمجھ کر کھا لیتے ہیں چونکہ آپ کا تعلق علاقہ کوکن سے ہے اور کوکنیوں کی پسندیدہ غذا چاول اور مچھلی ہے اسی مناسبت سے آپ نہ صرف مچھلی کو نوش فرمانا پسند کرتے ہیں بلکہ آپ مچھلی پکانے کے مختلف طریقوں سے بھی واقف ہیں جیسے کہ آپ کو شہر حیدرآباد سے خاص رغبت ہے اسی مناسبت سے آپ کو حیدرآباد بریانی اور چوگور بھی بہت لذت دیتے ہیں۔آپ گہرا مطالعہ اور چائے دونوں کے شوقین ہیں۔خاص بات یہ ہے کہ چائے میں آپ دودھ والی ایرانی چائے اور سلیمان چائے تو پیتے ہی ہیں مولانا ابوالکلام آزاد کے زیر اثر جاسمین ٹی کا بھی کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔

ویسے تو کسی فرد کی زندگی کے تمام معاملات ومعمولات کا احاطہ کرنا اخلاق کہلاتا ہے۔جس طرح اس کی تمام عادتیں، خصلتیں اور طور طریقے اسی زمرے میں آتے ہیں، اسی طرح کسی کے مرتبے کا پاس ولحاظ کرنے کو آداب کہتے ہیں۔عبدالستار دلوی کی شخصیت میں متعدد ظاہری عادتیں ایسی ہیں جو دوسروں کے لیے قابل تقلید ہوسکتیں ہیں جیسے گہرا مطالعہ، کم گویائی، نرم وشائستہ لب ولہجہ، مددگار، تنقید ونکتہ چینی سے پرہیز اور سستی شہرت سے دامن بچانا وغیرہ وغیرہ۔

کم گوئی سمجھ داری کی علامت ہے کیوں کہ ایک سمجھ دار انسان سوچ سمجھ کر بولتا ہے تاکہ بعد میں پچھتانا نہ پڑے لیکن بعض حضرات کی نظر میں کم گویائی کوئی اچھی عادت نہیں کیوں کہ ان کے خیال میں کم گویائی سے ترسیل میں دشواریاں پیش آتی ہیں، دراصل عبدالستار دلوی بھی کم گو ہیں اور آپ جب ضروری سمجھتے ہیں تب ہی بولتے یں اور اکثر اوقات اپنی مسکراہٹ پر اکتفا کر جاتے ہیں۔آپ کی کم گویائی کے تعلق سے یوسف ناظم کا اندازِ بیان دیکھیے جو یہاں بے محل نہ ہوگا:

> ''ڈاکٹر عبدالستار دلوی میں کئی خرابیاں ہیں۔ وہ فضول باتیں نہیں کرتے۔گپیں نہیں ہانکتے دوسروں پر کیچڑ نہیں اچھالتے، پتہ نہیں وہ زندہ کیسے رہتے ہوں گے۔لسانیات اور صوتیات پر ریسرچ کرنے کے یہ معنی نہیں کہ آدمی اپنی زبان بند رکھے اور اپنی آواز نہ نکلے،کسی کی برائی نہ کرے.................ڈاکٹر دلوی کو شاید اس کا علم نہیں کہ غیبت کرنے پر کوئی ٹیکس نہیں لگتا۔انہیں کل سے اپنا طریقۂ زندگی بدل دینا چاہیے۔''

(ماہنامہ ''شگوفہ'' یوسف ناظم نمبر،مضمون ''ایک نہ شد دو شد''، جون 2004ء۔ص:23)

آپ کم گو ہیں مگر کم سے کم الفاظ میں اپنی بات کو جامع انداز میں سامنے والے تک پہنچانے کا فن آپ کو آتا ہے۔

غصہ انسان کو تباہ و برباد کرنے کی طاقت رکھتا ہے اس کے برخلاف نرم و شائستہ لب ولہجہ دشمنوں کو بھی دوست بنانے کے لیے کارگر ثابت ہوتا ہے گویا نرم و شائستہ انداز بیان رکھنے والوں کی زبان کبھی کسی کو تکلیف نہیں دیتی، یہی حال عبدالستار دلوی کا بھی ہے کیوں کہ آپ کسی پر غصہ کرنا تو دور، کسی سے بلند آواز میں بات تک نہیں کرتے ، ہمیشہ نرم و شائستہ لب ولہجہ ہی اختیار کرتے ہیں۔آپ کے نرم و شائستہ لب و لہجے سے متعلق ڈاکٹر فصیح احمد صدیقی کا اظہار خیال دیکھیے :

''بے ریائی، اخلاص، نکوکاری اور رجائیت پسندی کے اوصاف کے جلو میں مجھے ذاتی طور پر ان کی ایک کمزوری ضرور متردد رکھتی ہے۔ اور وہ ہے ان کی نرم روی ونرم گفتاری۔ درشت کلام تو کجا۔ انہیں اپنی آواز بلند کر کے ڈانٹ ڈپٹ کرنے تک کا سلیقہ نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ آج کے بعض شتر بے مہار، بے اثر، کج فہم اور مدفع طلبہ وطالبات کی تادیب وسرزنش کیسے کرتے ہیں اور انھیں کس طرح راہ راست پر لاتے ہیں''۔

(ماہنامہ ''کتاب نما'' دہلی، پروفیسر عبدالستار دلوی نمبر، مضمون ''میرا دوست میرا بھائی''، فروری/2006، ص۔22)

ڈاکٹر فصیح الدین احمد صدیقی کے خیال میں نرم وشائستہ لب ولہجہ آپ کی کمزوری ہوسکتی ہے لیکن راقمۃ الحروف کی نظر میں یہ ایک عمدہ خوبی ہے جو کہ ہر کسی کے حصے میں نہیں آتی۔ ہاں تو یہاں میرے اس بیان کی تصدیق داکٹر زہرہ عبدالرحمٰن موڈک کے ان الفاظ سے ہوتی ہے ملاحظہ فرمائیے:

''لب ولہجہ بڑا دھیما دھیما ہے۔ دوسروں کی گفتگو غور سے سنتے ہیں اور جب گفتگو کرتے ہیں تو کوئی شئے دل پر اثر کرتی معلوم ہوتی ہے''۔

(ماہنامہ ''کتاب نما'' دہلی، پروفیسر عبدالستار دلوی نمبر، مضمون ''سایہ دار درخت''، فروری/2006، ص۔81)

عبدالستار دلوی کم گو ہیں اور ساتھ ہی ہمیشہ نرم وشائستہ لب ولہجہ ہی اختیار کرتے ہیں مگر آپ کا انداز بیان ایسا ہوتا ہے کہ بات سننے والے کے دل پر اثر کر جاتی ہے۔

آج کے اس مشینی دور میں انسان صحیح اور غلط، اچھے اور برے کا فرق محسوس کرنا بھول گیا ہے، وہ محنت ومشقت سے آگے بڑھنے کے بجائے Short Cut سے آگے بڑھ جانے کو ترجیح دینے لگا ہے اور تو اور اس کو آگے بڑھنے میں مدد دینے والے بھی اسی طرح کی سوچ رکھنے لگے ہیں، اسی لئے کہا جاسکتا ہے کہ اس دور میں کسی کی مدد کرنا وہ بھی جائز طریقوں سے، بنا اپنے کسی مفاد کے، ایک غیر متوقع بات ہے۔ عبدالستار دلوی جائز طریقوں سے

دوسروں کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور اسی لیے جو بھی آپ کے پاس مدد کی غرض سے آتا ہے آپ اسے کبھی ناامید نہیں کرتے۔ آپ کی اس عادت سے متعلق مقبول احمد تشنہ کہتے ہیں:

''جب وہ کسی کو نیک مقصد کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو انھیں انتہائی خوشی ہوتی ہے۔ اور اس کی جدوجہد میں اسے سہارا دینا وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں اور کامیابی کے بعد اس کی مسرتوں میں شریک ہونا ان کا حق ہوتا ہے''۔

(ماہنامہ ''کتاب نما'' دہلی، پروفیسر عبدالستار دلوی نمبر، مضمون، ''پروفیسر عبدالستار دلوی: ایک دلنواز شخصیت'' فروری/2006، ص۔29)

بے شک کسی کی مدد کرنا ایک اچھی عادت ہے اور اس سے بھی اچھی عادت یہ ہے کہ مدد کرنے کے بعد اپنا بڑا پن جتائے بنا اس کی مسرتوں میں شامل ہو کر ان مسرتوں کو دوبالا کر دینا۔

آج کے دور میں بحث و مباحث اور نکتہ چینی عام ہو گئے ہیں پھر وہ بے جا اور غیر ضروری ہی کیوں نہ ہوں لیکن لوگ ان میں شامل ہو کر اپنے آپ کو عالم و دانا ثابت کرنا چاہتے ہیں اور ایسے ماحول کا حصہ ہوتے ہوئے بھی آپ ان سب چیزوں سے کوسوں دور رہتے ہیں۔ اس بارے میں ڈاکٹر زہرہ عبدالرحمٰن موڈک رقم طراز ہیں:

''خواہ مخواہ بحث پسند نہیں کرتے۔ نکتہ چینی سے کتراتے ہیں اور لوگوں کی نکتہ چینی کا جواب دینا اوچھا پن سمجھتے ہیں''۔

(ماہنامہ ''کتاب نما'' دہلی، پروفیسر عبدالستار دلوی نمبر، مضمون، ''سایہ دار درخت''، فروری/2006، ص۔81)

بحث کرنا، نکتہ چینی کرنا اور نکتہ چینی کا جواب دینا، یہ تمام باتیں ایک دوسرے سے مختلف نظر آتی ہیں مگر اصل میں یہ سب ایک ہی ہیں کیوں کہ جو بحث کو برا نہیں سمجھتے وہ نکتہ چینی کرنے سے بھی باز نہیں آتے اور نکتہ چینی کا جواب دینے سے بھی پرہیز نہیں کرتے، البتہ جو لوگ بحث کرنا مناسب نہیں سمجھتے وہ نکتہ چینی کرنا یا اس کا جواب دینا دونوں کو غیر ضروری تصور کرتے ہیں۔ اور عبدالستار دلوی کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے جو اس طرح کی کسی بھی بات کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے۔

آج کل جو دکھتا ہے وہ بکتا ہے کا دور دورہ ہے جس کے چلتے ہر کوئی منظر عام پر آنا چاہتا ہے اور اس کے لیے غلط راستوں کے استعمال سے بھی پرہیز نہیں کیا جاتا، لیکن عبدالستار دلوی غیر معمولی کارنامے انجام دینے کے باوجود پس منظر میں رہنا پسند کرتے ہیں کیوں کہ سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے اپنی سطح سے نیچے گرنا آپ کو گوارا نہیں۔ آپ کی اس مخصوص عادت سے متعلق عبدالاحد سازؔ کا کہنا ہے:

> ''کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے اور کئی ذمہ داریوں کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھائے پھرنے کے باوجود اپنے نام کی جائز پبلی سٹی کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دیتے............خود کو نمایاں کرنے کے لیے بسا اوقات نیچے اترنا پڑتا ہے اور یہ دلوی صاحب کے لیے دشوار ہے۔ اس لیے انہوں نے پس منظر میں رہنے کو ترجیح دی ہے''۔

(ماہنامہ ''کتاب نما'' دہلی، پروفیسر عبدالستار دلوی نمبر، مضمون ''دلوی صاحب۔ حلقۂ ہنر سے دائرۂ عمل تک''، فروری/ 2006، ص۔52)

بعض لوگ اصول وضوابط کے پابند ہوتے ہیں۔ اور وہ اپنی تمام تر زندگی انہی اصولوں کے تحت گزار دیتے ہیں کیوں کہ اپنے اصولوں کی خلاف ورزی انہیں گوارا نہیں، چوں کہ عبدالستار دلوی بھی ایک اصول پسند انسان ہیں اور انہوں نے اپنی ساری زندگی اصول وضوابط کے تحت گزاری ہے جس کی وجہ سے ان کے اصول انھیں سستی شہرت پانے کے لیے اپنے معیار سے سمجھوتہ کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اسی لیے تو وہ تمام ذمہ داریاں نبھانے کے باوجود پس منظر میں رہنا پسند کرتے ہیں۔

یہ وہ چند مخصوص عادتیں ہیں جو آپ کی شخصیت کو اور نمایاں کرتیں ہیں۔ یہ عادتیں قابل تعریف بھی ہیں اور قابل تقلید بھی۔

کسی انسان کی شخصیت میں موجود معیاری اوصاف جیسے ہمدردی، ملنساری، خندہ پیشانی سے ملنا وغیرہ وغیرہ چیزیں خصلتوں کے زمرے میں شامل ہوتی ہیں۔ عبدالستار دلوی کی شخصیت میں متعدد اوصاف ایسے ہیں جن

پر رشک کیا جا سکتا ہے مثلاً تیز قوت حافظہ، ہمدرد، ملنسار، حسد اور جلن سے پاک، صبر وتحمل، مستقل مزاج، انکسار، بے ریا، خلوص وغیرہ وغیرہ اور اپنی شخصیت میں اتنے سارے اوصاف رکھنے کے باوجود آپ کی طبیعت میں انانیت کا عنصر نہ کے برابر ہے اور وہ بھی کوئی عمدہ خوبی سے کم نہیں۔

موجودہ دور مشینی دور ہے جہاں انسان مشینوں پر منحصر رہنے لگا ہے ریکارڈر، کمپیوٹر، لیپ ٹیاب، پن ڈرائیو، موبائل اور ٹیب لیٹ جیسی مشینوں کے استعمال سے انسان نے خدا کی نعمتوں میں سے ایک خاص نعمت ''قوت حافظہ'' کا استعمال کرنا کم کر دیا ہے یا یوں کہیے کہ بند کر دیا ہے۔ کیوں کہ انسان روزمرہ کی چھوٹی سے چھوتی بات کو یاد رکھنے کے لیے بھی آلام لگانے لگا ہے۔ جہاں پہلے کسی کو فون کرنے کے لیے فون نمبر یاد رکھنا پڑتا تھا اب تمام نمبرس موبائل ہی میں محفوظ ہو جاتے ہیں دراصل ان مشینوں میں نمبرس تو نمبرس پوری پوری کتابیں اور بڑی بڑی فائلوں کو بھی محفوظ کر کے رکھا جا سکتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ آج کا نوجوان طالب علم بھی یہ یاد رکھنا ضروری نہیں سمجھ رہا ہے کہ کونسی کتاب کس ادیب کی ہے وہ کب اور کہاں سے شائع ہوئی ہے لیکن اس سیاق وسباق میں دیکھیں تو عبدالستار دلوی کا حافظہ غیر معمولی تیزی ہے کیوں کہ انھیں صرف اردو ہی کی نہیں بلکہ مراٹھی اور انگریزی کی اہم کتابوں کی بھی معلومات آپ کے حافظے میں محفوظ ہیں۔ آپ کے تیز قوت حافظہ کے بارے میں خالد اگاسکر فرماتے ہیں:

> ''دلوی صاحب کو اگر خدا نے دل کھول کر کچھ دیا ہے تو ان کا حافظہ۔ دلوی صاحب کی یاداشت بلا کی تیز ہے۔ انھیں کتابوں کے سنہ اشاعت تک یاد ہیں۔ انھیں تاریخی حوالوں کے لیے کتابوں کی ضرورت شاید ہی کبھی پیش آئی ہو۔''

(ماہنامہ ''کتاب نما''، دہلی، پروفیسر عبدالستار دلوی نمبر، مضمون، ''بھاؤں ناؤں کا شانت ساگر''، فروری/2006، ص۔87)

اب تقریباً 80 برس کی عمر میں آپ کے حافظے کا یہ عالم ہے کہ آپ کو اپنی زندگی میں پیش آئی ہر بات اور

ہر وہ انسان یاد ہے جس سے آپ نے ملاقات کی ہے اور جو کچھ آپ نے پڑھا ہے وہ بھی حوالوں کے ساتھ آپ کے ذہن میں محفوظ ہے۔

ہمدرد کا مطلب دکھ درد کا ساتھی، دردمند اور غم خوار وغیرہ ہیں چوں کہ آپ کی شخصیت میں یہ صفت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے آپ کے ہمدرد دل کے بارے میں مقبول احمد تشنہ کا خیال ہے:

''انسانی ہمدردی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بنی نوع انسان میں سے کسی ایک فرد کا بھی دل نہ دکھایا جائے۔ اپنے قول وعمل پر وہ تدغن مسلط رکھی جائے کہ اس سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ یہ احساس فکر بھی دلوی صاحب کی فطرت میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ اگر کوئی شخص غلطی بھی کر رہا ہے تو دلوی صاحب اتنے خوب صورت انداز میں ٹوک دیں گے جس میں تنقید وتوبیخ کا شائبہ بھی نہ ہوگا اور اس شخص کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا''۔

(ماہنامہ ''کتاب نما'' دہلی پروفیسر عبدالستار دلوی نمبر، مضمون، ''پروفیسر عبدالستار دلوی۔ ایک دلنواز شخصیت''، فروری/2006، ص۔24)

آپ کے دردمند دل کے ایک اور پہلو پر آگے مقبول احمد تشنہ یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

''دلوی صاحب کا ایک حسین وصف میں نے یہ دیکھا ہے کہ وہ کسی کی خامیاں تلاش کرنے کے بجائے اس کی خوبیوں پر نظر رکھتے ہیں اور تلاش کے باوجود اس میں کوئی خوبی نہ پا کر بھی خالق کل کی نوازشوں سے مایوس نہیں ہوتے اور کوشش کرتے ہیں کہ وہ اپنی کمزوریوں پر قابو پا کر ایک اچھا انسان بن جائے''۔

(ماہنامہ ''کتاب نما'' دہلی پروفیسر عبدالستار دلوی نمبر، مضمون، ''پروفیسر عبدالستار دلوی۔ ایک دلنواز شخصیت''، فروری/2006، ص۔29-28)

آپ کا دل ہمدرد تو ہے ہی اس کے مختلف پہلو بھی آپ کی شخصیت میں بہ درجہ اتم موجود ہیں۔

جلن اور حسن یہ فطرت تقریباً ہر دوسرے انسان کی ہوتی ہے کیوں کہ انسان تو ہے ہی خیر و شر کا مجموعہ، لیکن

کچھ بلند اور نیک صفت انسانوں کی فطرت میں ان کا دخل نہیں ہوتا۔ اسی کے مصداق عبدالستار دلوی کا شمار بھی ایسے ہی نیک صفت انسانوں میں ہوتا ہے، آپ کی فطرت میں جلن و حسد کا مادہ نہیں ہے آپ دوسروں کی کامیابی سے خوش ہوتے ہیں، کامیاب کو اور کامیاب ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ مقبول احمد تشنہ آپ کی اس مخصوص صفت سے متعلق کہتے ہیں:

''حسد اور جلن لعنتوں سے ان کا کردار یکسر پاک ہے دوسروں کی کامیابی پر خوش ہونا ان کی فطرت کا خاصہ ہے۔''

(ماہنامہ ''کتاب نما'' دہلی پروفیسر عبدالستار دلوی نمبر، مضمون، ''پروفیسر عبدالستار دلوی۔ ایک دلنواز شخصیت''، فروری/ 2006، ص۔ 29)

آپ کی فطرت کا یہ خاص پہلو ہے کہ کسی کے مدد مانگنے سے پہلے ہی آپ جان جاتے ہیں کہ فلاں شخص کو میری مدد کی ضرورت ہے اور اس کے کہنے سے پہلے اپنی بساط بھر اس کی مدد کر دیتے ہیں جس کا سامنے والے کو احساس بھی نہیں ہوتا۔ آپ کی فطرت کے اس پہلو سے متعلق مقبول احمد تشنہ رقم طراز ہیں:

''میں نے بار ہا دیکھا ہے کہ ڈاکٹر دلوی اپنے قریب آنے والے ہر شخص کی قلبی کیفیات کا انداز ایک نظر میں لگا لیتے یں۔ انسانی فطرت کے پیچیدہ پہلوؤں کو پڑھ لینا بھی ایک فن کی حیثیت رکھتا ہے۔ کسی کے اظہار مدعا کیے بغیر اسکی قلبی کیفیات کو پڑھ لینا اور نفسیاتی طریقے استعمال کر کے اس کی ضروریات و احتیاج کا اندازہ لگا لینا اور پھر حتی المقدور اس کی ضرورت کی تکمیل اس انداز میں کر دینا کہ اسے قطعی اپنی سبکی کا احساس نہ ہو۔ دلوی صاحب کی فطرت کا ایک خاصہ ہے''۔

(ماہنامہ ''کتاب نما'' دہلی پروفیسر عبدالستار دلوی نمبر، مضمون، ''پروفیسر عبدالستار دلوی۔ ایک دلنواز شخصیت''، فروری/ 2006، ص۔ 24)

کہتے ہیں کہ انسان کی عادتیں بدلتی ہیں مگر فطرت نہیں، اگر فطرت اتنی خوبیوں والی ہو تو بدلنی بھی نہیں

چاہیے۔ بلکہ دوسروں کو اپنے آپ کو ان کے جیسا بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

صبر وتحمل اور مستقل مزاجی، یہ ایسے اوصاف ہیں جو ہر کسی کی شخصیت میں جگہ نہیں پاتے کیوں کہ یہ اوصاف کڑی محنت اور پختہ ارادے چاہتے ہیں جو ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ صبر وتحمل اور مستقل مزاجی آپ کے وہ اوصاف ہیں جو آپ کو ایک بلند وقار انسان بناتے ہیں اور آپ کے یہ اوصاف کسی سے چھپے نہیں ہیں لیکن یہ کوئی نہیں جانتا ہے کہ ان اوصاف کو پانے کے لیے آپ نے کتنی کڑی محنت کی ہے۔ آپ کے صبر وتحمل اور مستقل مزاجی کے تعلق سے خالدا گاسکر اس طرح اپنی رائے دیتے ہیں:

> ''کوکن کے ایک پسماندہ گانو دابھیل سے شہر آنے والے اس نوجوان کی جدوجہد اور صبر آزما دور کی کہانی کے وہ حصے جوان کی مستقل مزاجی کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ جدوجہد کی اس کہانی کو ان کی محنت اور مستقل مزاجی نے کئی بہتر روپ عطا کیے ہیں۔ میں جب تصور میں دلوی صاحب کے لڑکپن پر غور کرتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے زندگی جینے کے لیے کیا کیا جتن کیے ہوں گے۔ کس قدر محنت کی ہوگی۔ حوصلہ شکن حالات سے کس طرح لڑے ہوں گے۔ جذباتی سطح پر کس قدر ٹوٹ پھوٹ ہوتی رہی ہوگی۔ اس کے باوجود ان کے چہرے پر ٹوٹ پھوٹ کا ہلکا سا شائبہ تک نہیں''۔

(ماہنامہ ''کتاب نما'' دہلی، پروفیسر عبدالستار دلوی نمبر، مضمون، ''بھاؤناؤں کا شانت ساگر''، فروری/2006، ص۔87)

آپ کی باطنی شخصیت میں ان اوصاف کے علاوہ اور بھی اوصاف ہیں جو آپ کی شخصیت کو اور نمایاں کرتے ہیں۔

ویسے تو کسی کے مرتبے کا پاس ولحاظ رکھنا آداب کہلاتا ہے لیکن اپنے بڑوں کی تعظیم اور چھوٹوں پر شفقت وغیرہ چیزیں بھی آداب میں داخل ہوتی ہیں۔ اپنے بڑوں کی تعظیم کے کئی پہلو ہوتے ہیں جس میں سے ایک پہلو اپنی قوم کے بزرگ بھی ہوسکتے ہیں، غالباً اسی وجہ سے عبدالستار دلوی اکثر کہا کرتے ہیں کہ زندہ قومیں اپنے بزرگوں کو

کبھی نہیں بھولتی اور آپ کے اس بیان سے متعلق محمد ایوب واقفؔ کہتے ہیں:

''ڈاکٹر عبدالستار دلوی صاحب ایک حق پرست'' دور اندیش، وسیع المشرب اور صاف ذہن کے انسان واقع ہوئے ہیں۔اسی لیے بہ حیثیت خلق الصدق کے وہ اپنے اسلاف کے شاندار اور قابل صد احترام کارناموں کو ایک پل کے لیے بھی فراموش نہیں کرتے''۔

(ممبئی کے ساہتیہ اکادمی انعام یافتگان'شاعر'ادیب اور مترجم''ص۔178)

اپنے بڑوں کی تعظیم کا ایک اور پہلو اپنے اساتذہ کا احترام بھی ہوسکتا ہے پھر چاہے وہ حقیقی اساتذہ ہوں یا معنوی اساتذہ۔ یہاں میں یہ بات واضح کردوں کہ آپ اپنے معنوی اساتذہ کا بھی بڑا احترام کرتے ہیں آپ کی تعظیمِ اساتذہ کے تعلق سے محمد ایوب واقفؔ کا کہنا ہے:

''سید نجیب اشرف ندوی چونکہ عبدالستار دلوی صاحب کے مکرم، محترم اور معزز استاد تھے۔ اس بنیاد پر ڈاکٹر دلوی صاحب ندوی صاحب کے دونوں قریبی ساتھیوں ڈاکٹر بذل الرحمٰن اور ڈاکٹر ڈار کو بھی اپنے معنوی اساتذہ کا درجہ دیتے ہیں جب بھی ان اساتذہ کا ذکر آتا ہے دلوی صاحب ادب و احترام سے سر جھکا دیتے ہیں۔ مشرقی نظام حیات کی یہ وہ حیات آفرین اور درخشاں روایتیں ہیں جنھیں ڈاکٹر دلوی صاحب نے طرزِ جاں بنا رکھا ہے''۔

(ممبئی کے ساہتیہ اکادمی انعام یافتگان'شاعر'ادیب اور مترجم''ص۔180)

بڑوں کی تعظیم کے ان دو پہلوؤں کے علاوہ اور بھی پہلو ہو سکتے ہیں مگر یہاں مقصد صرف آپ کی شخصیت میں موجود آداب کی طرف اشارہ کرنا ہے۔

گھر گھر والوں سے بنتا ہے ورنہ وہ اینٹ پتھر سے بنا مکان ہوتا ہے کیوں کہ گھر والے لاڈ پیار کرتے

ہیں تو وہی غلطیوں پر سرزنش بھی کرتے ہیں جب کچھ بھی نہیں ہوتے گھر والے تب بھی حوصلہ افزائی کرتے ہیں ورنہ مقام ومرتبہ حاصل کر لینے کے بعد تو سب ہی قریب آتے ہیں۔

عبدالستار دلوی جب دس گیارہ سال کے تھے تب ہی آپ کے والد محترم کا انتقال ہو گیا۔ اور اس کے بعد آپ کی پرورش آپ کی والدہ محترمہ نے کی۔ ظاہر ہے آپ کی والدہ آپ کو لاڈ پیار بھی کرتیں تھیں مگر غلطیوں پر ڈانٹ بھی لاتیں تھیں، آپ کی والدہ محترمہ ہی نے آپ کو زندگی جینے کے طور طریقے سکھائے۔ آپ اپنے بڑے بھائی اور بہن کے ساتھ عزت واحترام سے پیش آتے ہیں۔ اور وہ بھی آپ کو شفقت بھری نظروں سے دیکھتے، ان کے علاوہ آپ کے چچا زاد بھائی و بہنوئی محترم یوسف صالح دلوی نے آپ کی تعلیم وتربیت پر خاص توجہ دی ہے تو آپ ان کی بھی ہر بات مانتے ہیں۔

آپ کے اور آپ کی شریک حیات محترمہ میمونہ دلوی مرحوم کے تعلقات بہت خوشگوار تھے حالاں کہ اگر کبھی اختلاف ہو بھی جاتا تو زیادہ دیر تک رہ نہیں پاتا کیوں کہ آپ دونوں ہی ملازمت کرتے تھے اس کے باوجود گھر کی ذمہ داریوں کو اول وقت میں پورا کر دیتے، معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی کامیاب شادی شدہ زندگی کی ایک خاص وجہ دونوں کا ہم مزاج ہونا ہے۔ آپ کے تعلقات اپنے تینوں بچوں اور ان کے بچوں سے بھی بہت ہی عمدہ ہیں کیوں کہ آپ ہمیشہ نرم ونازک لہجہ ہی اختیار کرتے ہیں تو پھر کہاں مسئلہ پیش آتا ہے۔

مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ آپ کے تعلقات بڑے ہی خوشگوار رہے ہیں اور امید کی جارہی ہے کہ ہمیشہ یہی حال رہے گا۔

دوست کے معنی ہم راز، ہم سفر وغیرہ کے آتے ہیں مگر ادبی اصطلاح میں دوست اسے کہتے ہیں جس کے ساتھ آپ چائے پیتے ہوئے ادبی بحث ومباحث کر سکیں۔ عبدالستار دلوی کے دوست بلا تکلف آپ کے گھر آتے ہیں اور ان دوستوں میں ادیب، شاعر، رفقاء اور شاگرد سبھی شامل ہوتے ہیں اس کے باوجود آپ مہمانوں کی مہمان نوازی میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے جس کی وجہ سے آپ کے دوست احباب بھی آپ کی مہمان نوازی سے بہت

خوش ہوتے ہیں۔ڈاکٹر زہرہ عبدالرحمٰن موڈک آپ کی مہمان نوازی کے بارے میں یوں اظہار رائے کرتے ہیں:

> ''دلوی صاحب کا مکان بمبئی کا اردو گھر ہے۔ دوستوں ادیبوں، شاعروں اور شاگردوں کی شیریں زبانی کے ساتھ شیرینی سے اس طرح خاطر تواضع کرنا کہ وہ بندہ بے دام بن جائے۔دلوی صاحب کی فطرت ہے''۔

(ماہنامہ ''کتاب نما'' دہلی پروفیسر عبدالستار دلوی نمبر، مضمون ''سایہ دار درخت''، فروری/2006،ص۔81)

آپ کے اردوداں دوست واحباب میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر رشید حسن خان، پروفیسر گیان چند جین، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر ضیاء الدین شکیب، پروفیسر انور معظم، پروفیسر مظفر علی شہ میری اور محافظ حیدر وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔چوں کہ لسانیات آپ کا پسندیدہ موضوع ہے اور اس موضوع کے ماہرین سے بھی آپ کی دوستی قابل ذکر رہی ہے تو یہاں آپ کے لسانی ماہرین دوستوں میں پروفیسر موہنتی پروفیسر میتھلے، پروفیسر گھاڑگے اور پروفیسر کیلکر شامل ہیں۔آپ کو تاریخ سے بھی دلچسپی ہے تو آپ نے اس موضوع کے اساتذہ سے بھی اپنے دوستانہ تعلقات استوار کیے ہیں، جن میں جے۔وی نائک، پی۔ایم۔جوشی اور علی یاور جنگ کے نام سرفہرست ہیں۔آپ کے حلقۂ دوست احباب میں سماجیات کے پروفیسر ڈی نارائن اور پروفیسر موہنتی بھی شامل ہیں۔

آپ کے مراٹھی داں حلقے میں بھی گہرے مراسم رہے ہیں۔ ان مراٹھی شاعر دوستوں میں نارائن سُروے (Narayan Surve) (دلت شاعر) اور سریش بھٹ (غزل گو) شامل ہیں۔مراٹھی فکشن نگاروں میں تقابلی ادب کے پروفیسر بھائی چند نیمڈے Bhai Chand Nemade اور صدر شعبہ مراٹھی بمبئی یونی ورسٹی پروفیسر کیشو میشرم (Prof. Keshav Meshram) کے نام اہمیت کے حامل ہیں، اس کے علاوہ انگریزی کے پروفیسر و مراٹھی ادیب (سفرنامہ نگار و مترجم) را۔بھی جوشی سے آپ کے دوستانہ مراسم رہے ہیں۔

اردو لسانیات، تاریخ، سماجیات اور مراٹھی کے پروفیسر و ادیب و شعراُ کے علاوہ دوسرے شعبہ حیات سے

تعلق رکھنے والے حضرات سے بھی آپ کی دوستی رہی ہے مگر یہاں صرف ادب اور ادب سے متعلق شعبوں کے دوست واحباب کا ہی ذکر کیا گیا ہے۔

شاگرد وہ ہوتا ہے جس کو آپ نے کچھ سکھایا ہو اور جو سکھائے وہ استاد کہلاتا ہے، بہر حال استاد یا شاگرد پر عمر کی کوئی قید نہیں ہوتی لیکن ایک عام تصور یہ ہوتا ہے کہ استاد عمر رسیدہ ہو اور شاگرد نوجوان ہو جب کہ معاملہ اس کے برعکس بھی ہوسکتا ہے۔عبدالستار دلوی ایسے استاد ہیں جو اپنے شاگردوں کو کبھی اپنے سے دور نہیں کرتے جہاں وہ اپنے عمر رسیدہ یا ہم عمر شاگردوں کا احترام تو کرتے ہی ہیں وہیں نوجوان شاگردوں کو بھی اپنا دوست یا چھوٹا بھائی مانتے ہیں، ساتھ ہی دوسروں کے سامنے اپنے شاگردوں کا تعارف فخر سے پیش کرتے ہیں،ن کی خوبیاں گنواتے اور آگے بڑھنے میں ان کی مدد کرتے ہیں یہی نہیں بلکہ درست موقعوں پر حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں۔

آپ کلاس روم میں تو اپنے پر مغز لیکچر سے اپنے شاگردوں کو مخلوط کرتے ہی ہیں لیکن کلاس کے باہر بھی کینٹین میں چائے پیتے ہوئے ان کے ساتھ علمی و ادبی موضوعات پر تبادلہ خیال کیا کرتے ہیں۔آپ کے اپنے شاگردوں سے خوش گو تعلقات پر ڈاکٹر زہرہ عبدالرحمٰن موڈک کے ان الفاظ سے روشنی پڑتی ہے:

> ''اپنے شاگردوں کا بڑے پیار اور فخر سے دوسروں سے تعارف کروانا ان کا شیوہ ہے۔شاگردوں کو محنت کرتے دیکھ''ترقی کرتا دیکھ خوش ہوتے ہین وران سے کام لینے کے گر بھی جانتے ہیں۔ان کی خوبیوں کی فراخ دلی سے تعریف کرتے ہیں۔ بڑوں کی تو ہر ایک تعظیم کرتا ہے لیکن اپنے چھوٹوں کی عزت کرنا دلوی صاحب کے کردار کا عظیم پہلو ہے''۔

(ماہنامہ ''کتاب نما'' دہلی، پروفیسر عبدالستار دلوی نمبر،مضمون،''سایہ دار درخت''،فروری/2006،ص۔81)

ویسے تو آپ سے فیض یاب ہونے والے شاگردوں کی ایک طویل فہرست ملتی ہے لیکن چند کے نام اس طرح ہیں ڈاکٹر فاطمہ ہارون مومن، ڈاکٹر سعیدہ اختر پٹیل، ڈاکٹر عطاء الرحمٰن صدیقی ندوی، داکٹر رشید آثار، ڈاکٹر

کلثوم ابولبشر، ڈاکٹر معین الدین جینا بڑے، عباس بختیار، وقار قادری، مظفر احمد، قاسم امام اور خالد اگاسکر وغیرہ وغیرہ۔

عبدالستار دلوی کا ماحول:

ماحول کے معنی گردوپیش اور پاس پڑوس کے آتے ہیں وہیں گردوپیش کے معنی دیکھیں تو اردگرد اور آس پاس نکلتے ہیں اور پاس پڑوس کے معنی تلاش کیے جائیں تو قرب وجوار، ہم سائگی اور اردگرد ملتے ہیں، لیکن اگر گردوپیش اور پاس پڑوس کے مختلف معنوں پر غور کیا جائے تو یہ تمام مترادفات معلوم ہوتے ہیں یا پھر یوں کہے کہ یہ سب لفظ ''ماحول'' کے مختلف Shades نظر آتے ہیں۔

ایک چھوٹا بچہ جو تجربات زندگی نہیں رکھتا وہ اپنے ماحول کا مشاہدہ کر کر کے سیکھتا ہے دراصل وہ اپنے ماحول میں جو بھی دیکھتا ہے جیسا بھی دیکھتا ہے اس کو ویسے ہی اپنا لیتا ہے۔

عبدالستار دلوی کے بچپن کے ابتدائی کچھ سال دابھیل میں گزرے، جہاں ان کے گھر میں ڈاک گھر تھا معلوم ہوا کہ مقامی وآس پاس کے گاؤں کے لوگ اس ڈاک گھر سے استفادہ کرنے کے لیے میلوں پیدل مسافت طے کر کے آتے تھے کیوں کہ اس زمانے میں اب کے جتنی سہولتیں نہیں تھیں اس لیے جو بھی آتا آپ کے گھر سے کھانا کھا کر ہی جاتا یہی معمول تھا کہ ہر وقت کھانا پکتا رہتا اور لوگ کھاتے رہتے۔ بس یوں سمجھیے کہ آپ نے نہ صرف یہ سب قریب سے دیکھا ہے بلکہ اس کا اثر بھی قبول کیا ہے۔ غالباً آپ کی شخصیت میں جو مہمان نوازی کی صفت ہے وہ اسی ماحول کی دین ہے۔

دابھیل میں آپ کے گھر میں غیر مسلم ملازم ہوا کرتے تھے جن سے سب افراد خاندان ہی کی طرح پیش آتے جس کی وجہ سے وہ بھی تمام افراد خاندان کا احترام کرتے تھے بس اسی ماحول میں آپ کا بچپن گزرا اور ایہ سب آپ نے محسوس بھی کیا، ضروری ہے کہ اسی ماحول کے زیر اثر ہمدردی، اخوت اور بھائی چارگی جیسے اوصاف آپ کی شخصیت میں جگہ پاتے ہیں۔

آپ کے والد محترم کے انتقال کے بعد آپ سب بمبئ منتقل ہو گئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی، آپ کے لیے یہاں کا ماحول بالکل نیا تھا جیسے نیا گھر، نیا اسکول اور نئے دوست۔غرض سب کچھ نیا تھا لیکن ایک چیز جو آپ کے لیے نئ نہیں تھی وہ تھی مہمانوں کی آمدورفت۔دراصل آپ کے جو بھی رشتہ دار بمبئ آتے وہ آپ ہی کے گھر میں قیام کرتے تھے اور جو مہمان نوازی کی صفت دابھیل میں پیدا ہوئی تھی وہ بمبئ آکر اور پروان چڑھی۔

اسکول کا مطلب ہے مدرسہ یا مکتب۔چنانچہ اسکول وہ جگہ ہوتی ہے جہاں بچوں کو عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ عمدہ اخلاق وآداب بھی سکھائے جاتے ہیں کیوں کہ یہیں سے مستقبل کے بہتر شہری تیار ہوتے ہیں جس کی وجہ سے اسکول کی تعلیم پر ہر بچے کا حق ہوتا ہے اور اب تو حکومت ہند نے بھی اس کے لیے مختلف اسکیمات جاری کیں ہیں۔

عبدالستار دلوی دابھیل میں لوکل بورڈ مراٹھی میڈیم اسکول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے لیکن اس اسکول میں مسلمانوں کے لیے مسلمانوں کے لیے اردو زبان لازمی تھی جس کا لازمی نتیجہ تھا کہ آپ نے بچپن ہی سے اردو اور مراٹھی دونوں زبانوں کی تعلیم پائی ہے اس کے علاوہ آپ کے گھر میں کوکنی اور اردو زبانیں بولی جاتی تھیں۔اس لیے آپ کو بچپن ہی سے کوکنی اردو اور مراٹھی زبانوں سے واقفیت حاصل ہے۔

آپ کو بمبئ آنے کے بعد احمد سیلر ہائی اسکول میں داخل کروایا گیا کیوں کہ یہ ایک اردو میڈیم اسکول تھا اور انجمن اسلام کے زیر اہتمام چلایا جاتا تھا اور اسکول کے پرنسپل انصار علی مرحوم تھے، بقول عبدالستار دلوی ''وہ اسکول کے ہر بچے سے واقف تھے اور ان کے مسائل بھی جانتے تھے اور کوشش کرتے کہ مسلمان غریب بچے زندگی کے میدان میں آگے بڑھیں وہ نہ صرف اپنے ادارے انجمن اسلام سے اپنے طالب علموں کی مالی امداد فرماتے بلکہ اکثر اوقات اپنی جیب خاص سے غریب ونادار بچوں کی فیس ادا کرتے۔'' ان کے علاوہ ایک اور استاد محمد بشیر مرحوم تھے جو بقول عبدالستار دلوی ایک غیر معمولی اسکالر تھے۔جس کی وجہ سے طلبہ پر کلاس میں ان کی تدریس کے جادو میں کھو جاتے تھے۔بس یوں سمجھیے کہ آپ کی ذہنی تربیت میں ان کا بڑا حصہ ہے،ایک اور استاد جن کا نام اسداللہ خان تھا

وہ مشہور شاعر عظمت اللہ خان کے بیٹے تھے اور حیدر آباد سے تعلق رکھتے تھے۔ایک اور استاد عبدالقادر چور گھے مرحوم تھے جو خوشخطی پر دھیان دیتے تھے اور ان کی نظروں سے نڑھا ہوا ایک سوشہ بھی نہیں بچ پاتا۔آپ سے متعلق عبدالستار دلوی لکھتے ہیں:

''زباندانی، املا اور انشا کی غلطی کو وہ کبھی برداشت نہیں کرتے تھے اور سختی سے گرفت کرتے تھے اور ان کی ایک چھوٹی سی بید جو ہمیشہ ان کی آستین میں چھپی رہتی تھی خبر لیتے تھے''۔

(سہ ماہی ''نوائے ادب''،مضمون ''احمد سیلر ہائی اسکول''۔چند یادیں۔اپریل تا ستمبر۔2015،ص:69)

آپ کے ایک اور استاد مولانا عباس مرحوم تھے جو عربی اور اردو پڑھاتے تھے اور اکثر نئی نئی کتابیں لا کر دیتے تھے اور یہ تاکید کرتے کہ ان کو پڑھ کر تبصرہ کریں۔بسا اوقات کوئی موضوع دے کر مضمون لکھ کر لانے کا حکم صادر کرتے اور جب مضمون لکھ کر لے جاتے تو مضمون پڑھ کر اس پر خوب،بہت خوب اور تسلی بخش وغیرہ کے ریمارکس بھی دیتے،جیسا کہ ایک دفعہ موضوع تھا ''میں کیا بننا چاہتا ہوں'' جس کے لیے آپ نے مضمون لکھا۔''میں ٹیچر بننا چاہتا ہوں''،استاد محترم مضمون پڑھ کر بہت خوش ہوئے کافی تعریف بھی کی مگر حاشیے میں اقبالؔ کا یہ شعر لکھا:

تیری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
میری دعا ہے کہ تیری آرزو بدل جائے

استاد محترم مولانا عباس مرحوم نہیں چاہتے تھے کہ آپ ٹیچر بنے کیوں کہ اس وقت ٹیچرس کی تنخواہیں بہت ہی قلیل ہوا کرتی تھیں۔جس کی وجہ سے ان کو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔عبدالستار دلوی استاد محترم سے متعلق ایک دلچسپ واقعہ یوں بیان کرتے تھے:

''میں دسویں جماعت کا طالبِ علم تھا۔اسکول میں ایک تقریری مقابلہ تھا اور ایک تحریری مقابلہ۔ اگر چہ میں کوئی اچھا مقرر نہیں رہا لیکن اتفاق سے تقریری

مقابلے میں مجھے پہلا انعام ملا۔ استاد محترم بشیر صاحب تقسیم انعامات کے موقع پر مجھے اپنے ساتھ لے گئے اور بھنڈی بازار کے سلطان بک ڈپو سے انعام کے لیے کتابیں خریدیں۔ مجھے پوچھا تو میں نے نیاز فتح پوری کی ''من ویزداں'' کی فرمائش کی۔ بشیر صاحب اس پر راضی نہیں تھے کہ یہ گمراہ کرنے والی کتاب ہے۔ لیکن میرا اصرار تھا کہ مجھے ''من ویزداں'' ہی دی جائے۔ اگر چہ انعام کی رقم کے مقابلے میں یہ کتاب مہنگی تھی، تاہم میرے اصرار کی وجہ سے انہوں نے وہ کتاب خریدی اور مولوی عباس صاحب سے کہا کہ ''دلوی'' نے بضد ہوکر ''من ویزداں'' خریدوائی میں پریشان ہوں۔ مولوی عباس نے کہا کوئی بات نہیں اس سے پہلے کہ وہ من ویزداں پڑھیں ہم انھیں ایک اور کتاب سید سلیمان ندوی کی خطبات مدارس پڑھنے دیں گے۔ اس سے ایک توازن پیدا ہوگا''۔

(سہ ماہی ''نوائے ادب''، مضمون ''احمد سیلر ہائی اسکول''۔ چندیادیں۔ اپریل تا ستمبر۔2015، ص:68)

آپ نے ابتدأ سے میٹرک تک کی تعلیم تین مختلف اسکولوں میں پائی لیکن ان میں احمد سیلر ہائی اسکول کا جو ماحول تھا وہ زیادہ تر ادبی اور کچھ حد تک مذہبی تھا اور یہاں یہی سے آپ کی ذہنی تربیت اور ذہنی نشو ونما کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

کالج اعلیٰ تعلیم کا ایک ذریعہ ہے لیکن کالجس بھی مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں جیسے انٹر کالج، ڈگری کالج اور پی جی کالج وغیرہ۔ ظاہر ہے کالج کے بعد کی تعلیم یونی ورسٹیوں میں ہوتی ہے لیکن کوئی شاگرد کالج سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ایک مہذب انسان بنے گا یا نہیں اس کا پورا دارومدار کالج کے ماحول پر منحصر ہے کیوں کہ اگر کالج کا ماحول اچھا ہوگا تو غیر مہذب شاگرد بھی یہاں آ کر مہذب ہو جائے گا۔

1930ء میں سر محمد یوسف کے عطیے سے اسماعیل یوسف کالج کی بنیاد پڑی۔ تو عربی، فارسی اور اردو کے جید عالم اور کیمبرج سے فارغ التحصیل ڈاکٹر بذل الرحمٰن کو پرنسپل منتخب کیا گیا، اس وقت کالج کی کہکشاں میں پروفیسر سراج الحسن نقوی (وائس پرنسپل) پروفیسر حسین ہمدانی، پروفیسر عبدالصمد مولوی، پروفیسر داؤد پوتا، پروفیسر سید نجیب

اشرف ندوی، پروفیسر محمد ابراہیم ڈار، ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی اور ڈاکٹر باقر علی ترمذی وغیرہ وغیرہ روشن ستارے جگمگا رہے تھے۔

جب آپ احمد سیلر ہائی اسکول میں میٹرک کی تعلیم پا رہے تھے، تب آپ کے پرنسپل و استاد محترم انصار علی مرحوم نے مشورہ دیا تھا کہ میٹرک کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے اسماعیل یوسف کالج میں داخلہ لے لو تا کہ پروفیسر محمد ابراہیم ڈار سے عربی اور پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی سے اردو پڑھ سکو، مگر افسوس کہ آپ کا میٹرک مکمل ہونے سے پہلے ہی پروفیسر محمد ابراہیم ڈار کا انتقال ہو گیا۔

عبدالستار دلوی کے اساتذہ میں پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی، ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی اور ڈاکٹر عالی جعفری کے نام اہمیت کے حامل ہیں، واقعہ یہ ہے کہ پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی انٹرمیڈیٹ سے لے کر پی ایچ ڈی تک کے طلبہ کو پڑھاتے تھے۔ جس کی وجہ سے آپ کے سال میں دو یا تین لیکچرز ہی ہو پاتے تھے مگر وہ آپ کی علمیت کی دھاک جمانے کے لیے کافی تھے اور آپ کی شخصیت ہر دل عزیز تھی۔ ان کے برخلاف ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی کا مزاج سخت تھا، شاگردوں پر ڈانٹ ڈاپٹ زیادہ کرتے تھے مگر ان کی طبیعت میں شفقت بھی تھی علاوہ ازیں ڈاکٹر عالی جعفری کا مزاج نرم اور مشفقانہ تھا ان کی خاص بات یہ تھی کہ آپ طلبہ کو کتابوں کے ساتھ ساتھ رسائل بھی پڑھنے کی تلقین کرتے اگر ایک دن کسی مخصوص کتاب کو پڑھنے کو کہتے تو دوسرے دن یاد سے اس بارے میں پوچھتے کہ کتاب پڑھی ہے یا نہیں، اگر کتاب کالج کی لائبریری میں موجود نہ ہوتی تو اپنے ذاتی کتب خانے سے عنایت فرماتے۔ بقول عبدالستار دلوی وہ ڈاکٹر علی جعفری کے حلقہ شاگردی کے ساتھ ساتھ حلقہ ارادت مندی میں بھی شامل ہو گئے تھے۔

اسماعیل یوسف کالج کے تمام اساتذہ غرض وہ کسی بھی شعبے سے تعلق رکھتے ہوں ایک خاندان کی طرح رہتے تھے اسی طرح طلبہ و طالبات کا تعلقات چاہے جس شعبے سے ہو وہ تمام شعبہ جات کے اساتذہ کا احترام کرتے تھے اور سب ایک خاندان کے افراد کی طرح رہا کرتے تھے تو کہا جا سکتا ہے کہ کالج کا ماحول علمی و ادبی ماحول تھا۔

oOo

﴿باب سوم﴾

عبدالستار دلوی کی علمی خدمات

عبدالستار دلوی کی علمی خدمات

3۔ عبدالستار دلوی کی علمی خدمات

3.1۔ ادارہ ساز

3.1.1۔ بانی ڈائرکٹر، مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر اور لائبریری

3.1.1.1۔ لائبریری کا قیام

3.1.1.2۔ لکچرز و توسیعی خطبات

3.1.1.3۔ تحقیقی کام

3.1.2۔ بانی جوائنٹ سکریٹری، مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی

3.1.3۔ بانی صدر شعبۂ اردو کرشن چندر پروفیسر، ممبئی یونی ورسٹی

3.1.3.1۔ شعبۂ اردو کا قیام

3.1.3.2۔ کرشن چندر چیئر

3.1.3.3۔ بہ حیثیت تحقیق کے نگران

3.1.3.4۔ لکچرز، توسیعی خطبات و سمینارس

3.1.3.5۔ اشاعتی پروگرام

3.1.4۔ بانی اردو سکشن، ڈپارٹمنٹ آف اسلامک لنگوئجس، عین شمس یونی ورسٹی، مصر

3.1.5۔ بانی ڈائرکٹر حضرت مخدوم علی مہائمی میموریل اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور لائبریری

3.2۔ دیگر علمی خدمات

3.2.1۔ڈائرکٹر دکن مسلم ایجوکیشن اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، پونے

3.2.1.1۔ سمینارس و کانفرنس

3.2.1.2۔ تحقیقی کام

3.2.2۔مہمان پروفیسر، شعبہ اُردو، یونی ورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد

3.2.2.1۔ دوزبانیں، دوادب

3.2.2.2۔ پنڈت سیتو مادھوراؤ پگڑی، مورخ واديب

3.2.3۔ڈائرکٹر، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی

3.2.3.1۔ سہ ماہی ''نوائے ادب''

3.2.3.1۔ پبلیکیشن

3.2.3.3۔ محققین کی رہنمائی

3.2.3.1۔ لکچرز و سمینارس

3۔ عبدالستار دلوی کی علمی خدمات

علم کے لغوی معنی دانائی، آ گہی، ہنر اور فن وغیرہ کے آتے ہیں جب کہ اصطلاحی معنی میں نامعلوم سے معلوم کی طرف جانا یا عدم واقفیت سے واقفیت حاصل کرنا علم کہلاتا ہے۔اس کے علاوہ علم کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں جیسے علم اللسان، علم بشریات، علم عمرانیات وغیرہ وغیرہ۔اسلام میں علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد عورت پر فرض ہے یہ دوسری بات ہے کہ علم سے مادی دولت کے ساتھ ساتھ روحانی سکون بھی حاصل ہوتا ہے اور علم کے ذریعہ انسان اپنی، اپنے معاشرے اور اپنی قوم کی ترقی کا سبب بن سکتا ہے۔

لفظ علم کے لغوی معنی علم سے منسوب یا علم سے متعلق ہیں لیکن ادبی اصطلاح میں علمی خدمات سے مراد وہ خدمات ہیں جو کسی مخصوص ادبی عہدے پر فائز ہوتے ہوئے انجام دی جائیں جیسے کسی نئے ادارے کا قیام عمل میں لانا، کسی ادارے میں لائبریری قائم کرنا، کسی ادارے میں سمینار و لکچر منعقد کرنا، کسی ادارے کا اشاعتی پروگرام بنانا، کسی ادارے سے انعامات و اعزازات اور تہنیت پیش کرنا، کسی ادارے میں نیا کورس متعارف کروانا اور کسی کورس کا نصاب تبدیل کرنا وغیرہ۔

3.1۔ادارہ ساز

ادارہ ساز یا ادارہ سازی یعنی کوئی نیا ادارہ قائم کرنا، اس کی نشو ونما کرنا، اس کو پروان چڑھانا وغیرہ وغیرہ، ادارہ سازی کے لیے علم تو بنیادی ضرورت ہے ہی اس کے ساتھ ساتھ انتظامی صلاحیت کا ہونا بھی لازمی ہے ظاہر ہے اگر کسی کے پاس علم تو ہے لیکن انتظامی صلاحیت موجود نہ ہو تو اس کے لیے ادارہ سازی ممکن نہیں کیوں کہ ادارہ سازی کے لیے علم اور انتظامی صلاحیتیں دونوں ناگزیر ہیں۔

عبدالستار دلوی کے پاس علم کا بیش بہا خزانہ موجود ہے جو انہوں نے نہ صرف اپنے اساتذہ کی صحبت، محبت اور شفقت سے حاصل کیا ہے بلکہ اس میں ان کی سچی لگن اور برسوں کی کڑی محنت بھی شامل ہے۔آپ کے

حصولِ علم کے تعلق سے ایوب واقفؔ کا کہنا ہے:

''مدنپورہ ممبئی کے احمد سیلر ہائی اسکول کی ثانوی تعلیم سے لے کر لندن یونی ورسٹی کی اعلیٰ اور معیاری تعلیم تک ان کا درجہ بدرجہ اور زینہ بہ زینہ حصولِ علمِ مرام اور مقصد کا حامل رہا ہے''۔

(ممبئی کے ساہتیہ اکادمی انعام یافتگان ''شاعر،ادیب اور مترجم'' ص:174)

عبدالستار دلوی کا حصول علم مرام مقصدیت کا حامل ہوسکتا ہے مگر ان کی انتظامی صلاحیتیں خداداد ہیں دراصل انہوں نے نہ صرف اپنی ان صلاحیتوں کو پہچانا ہے بلکہ ان کو صحیح جگہ پر استعمال کرنے کا ہنر بھی وہ جانتے ہیں۔ عبدالاحد سازؔ اس بارے میں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب کو علمی لیاقتوں کے ساتھ ساتھ انتظامی صلاحیت اور علمی سوجھ بوجھ کا مادہ بھی قدرت سے وافر مقدار میں ودیعت ہوا ہے۔''

(ماہنامہ ''کتاب نما'' دہلی، پروفیسر عبدالستار دلوی نمبر، مضمون۔''دلوی صاحب حلقۂ ہنر سے دائرۂ عمل تک'' فروری، 2006ء، ص:50)

عبدالستار دلوی کے یہاں جہاں علم کی بہتات ہے وہی انتظامی صلاحیتیں بھی کثرت سے موجود ہیں جن کو آپ بہ حسن وخوبی بروئے کار لاتے ہیں۔

3.1.1۔ بانی ڈائرکٹر، مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر اور لائبریری

کوئی نیا ادارہ قائم کرنا اور اس کو پروان چڑھانا وغیرہ نہایت ہی مشکل امر ہے لیکن کچھ محنتی، مستقل مزاج اور صابر شخصیتیں اس مشکل امر کو بھی سر کرنے کا جذبہ رکھتی ہیں اور ان جذبوں میں سچی لگن و کڑی محنت بھی شامل رہتی ہے۔ عبدالستار دلوی کی شخصیت میں کڑی محنت، مستقل مزاجی اور ثابت قدمی جیسے اوصاف بدرجہ اتم موجود ہیں، اس کے ساتھ ساتھ علم کا دفینہ اور عمدہ منتظم جیسی خصوصیات بھی آپ کی شخصیت میں شامل ہیں۔

1967ء میں آپ نے اپنا لسانیات میں پی ایچ ڈی مکمل کر لیا تو نو تعمیر شدہ ادارے مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر میں خالی جائیداد دیکھ کر درخواست دی، غالباً انٹرویو کے لیے چار امیدوار تھے جن کے نام کچھ اس طرح ہیں: (۱) ڈاکٹر عبدالستار دلوی (۲) ڈاکٹر عبدالعلیم (۳) راہی معصوم رضا اور (۴) نیر مسعود۔ مگر ان چار امیدواروں میں سے آپ کا انتخاب ہوا کیوں کہ اس جائیداد کے لیے امیدوار کو لسانیات، اردو، ہندی اور گاندھی جی کے نظریے ''ہندوستانی'' سے واقفیت ضروری تھی کیوں کہ مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر قائم کرنے کا اصل مقصد مہاتما گاندھی کے نظریے ہندوستانی زبان کو فروغ دینا ہے جو اردو اور ہندی کا اشتراک اور سنسکرت کے بھاری بھرکم الفاظ سے پاک ہو اور یہ واقفیت صرف آپ کے یہاں تھی اسی لیے آپ ہی منتخب ہوئے۔ عبدالستار دلوی مہاتما گاندھی کے نظریے ''ہندوستانی'' سے واقفیت رکھتے ہیں اور کہیں نہ کہیں اس کے قائل بھی ہیں۔

3.1.1.1۔ لائبریری کا قیام

کسی بھی ادارے میں لائبریری کا قیام کوئی آسان کام نہیں ہے یہ کام اور بھی مشکل ہو جاتا ہے جب ادارہ خود نوزائیدہ ہو تو۔

عبدالستار دلوی 1967ء سے 1982ء تک تقریباً پندرہ (15) سال مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر کے بانی ڈائرکٹر رہے اور اس معیاد کے دوران سنٹر میں انہوں نے کئی کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں لیکن سنٹر میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ لائبریری کا قیام اور ترقی ہے۔ بقول عبدالستار دلوی انہوں نے سنٹر میں پندرہ سال میں 35,000 کتابیں جمع کیں ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ ان کتابوں میں متعدد کم یاب کتب بھی شامل ہیں مثلاً گلکرسٹ کی مرتب کردہ ''اردو ہندی ڈکشنری'' 1833ء میں گارساں دتاسی کا ترتیب دیا ہوا دیوان ولی دکنی اور پانینی کی چالیس صفحاتی کتاب جس میں ڈھائی ہزار سال پہلے لسانیات کا تصور ملتا ہے اور ان کتب کے علاوہ مخطوطات بھی کثیر تعداد میں دستیاب ہیں جو اب نادرونایاب ہیں علاوہ ازیں قدیم رسائل کی فائلیں Back Volumes بھی دستاویزی شکل میں موجود ہیں جن میں ملکی و غیر ملکی رسائل شامل ہیں۔ آپ کے اس کارنامے

سے متعلق مقبول احمد تشنہ کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے:

''دلوی صاحب نے مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر کے لیے سارے ہندوستان سے نایاب ترین اور بیش قیمت کتابیں جمع کر کے ایک لائبریری قائم کردی جو اس ادارے کا جزو لاینفک بن گئی ہیں......اس لائبریری کا نام آتے ہی ڈاکٹر عبدالستار دلوی کی تہہ در تہہ شخصیت ذہن میں ابھرتی ہے۔لیکن دلوی صاحب کی بے نیازی اور سادگی کا یہ عالم ہے کہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ''۔

(ماہنامہ ''کتاب نما'' دہلی، پروفیسر عبدالستار دلوی نمبر،مضمون، پروفیسر دلوی: ایک دلنواز شخصیت،فروری، 2006ء،ص:26)

اس نو تعمیر شدہ ادارے میں جو لائبریری آپ نے تشکیل دی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے ویسے تو ممبئی میں متعدد لائبریریاں ہیں لیکن مہاتما گاندھی میموریل لائبریری کا کوئی ثانی نہیں کیوں کہ آپ کے حسن انتخاب اور سلیقے وشائستگی نے ایسے منفرد بنادیا ہے۔اس لائبریری سے فیض اٹھانے والوں میں ریسرچ اسکالرس ہی نہیں بلکہ اساتذہ بھی شامل ہیں اور اس لائبریری سے فیض یاب ہونے کے لیے محققین ملک کے دوسرے شہروں سے بھی آتے ہیں۔

جب بھی اور جہاں بھی مہاتما گاندھی میموریل لائبریری کا ذکر ہوگا وہاں آپ کا نام احترام سے لیا جائے گا۔

3.1.1.2۔لکچرز وتوسیعی خطبات

کسی ادارے میں لکچرز وتوسیعی خطبات منعقد کرنے کی دو وجوہات ہوسکتیں ہیں پہلی وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ ادارے کے منتظم کو اپنے ارباب حل وعقد کو اپنی کارکردگی کی رپورٹ دینی پڑتی ہے تب کہیں جا کے ان کے عہدے میں برتری آتی ہے اور دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ منتظم خود ایک باذوق شخصیت ہے اور وہ اپنے علمی ذوق کی تسکین کے ساتھ ساتھ دوسروں کے بھی مستفیض ہونے کا سامان ان لکچرز وتوسیعی خطبات میں ڈھونڈ لیتا ہے۔

عبدالستار دلوی کی شخصیت بہ حیثیت منتظم پر دوسری وجہ کا اطلاق صادق آتا ہے کیوں کہ انہوں نے کبھی

ستائش کی تمنا کی نہ صلے کی پرواہ، دراصل آپ اپنے علمی ذوق وشوق کی تسکین کے لیے ہمیشہ سرگرم رہتے ہیں اور کوئی اچھا موضوع ہاتھ آجائے تو اس پر لکچر یا توسیعی خطبہ منعقد کردیتے ہیں، مقررین کے انتخاب میں آپ کے حسن انتخاب کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔اور موضوع اور مقررین کے بعد آپ ان لکچر رکی صدارت کے لیے ایسے صدور کو منتخب کرتے ہیں جو اپنے میدان کے شہسواروں میں شمار ہوتے ہیں اور وہ میدان ادبی و نیم ادبی دونوں قسم کے ہوسکتے ہیں۔

عبدالستار دلوی تقریباً پندرہ سال مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر کے ڈائرکٹر رہے اس معیار کے دوران آپ نے کم وبیش سو لکچرز و توسیعی خطبات کا اہتمام کیا ہے جو ادبی، لسانی، تہذیبی اور ثقافتی موضوعات سے متعلق تھے، ن لکچرز و توسیعی خطبات کے مقررین میں ڈاکٹر بی آر سکسینہ (سابق چیرمین سائنٹفک ٹرنیالوجی کمیشن)، پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی (عالمی شہرت یافتہ پروفیسر و ماہر لسانیات)، پروفیسر مسعود حسین خان (سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ نئی دہلی)، ڈاکٹر ایم ستیہ نارائن (چیرمین سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آگرہ)، جناب بدرالدین طیب جی (ماہر تعلیم)، ڈاکٹر کے وی آر وی راؤ (سابق مرکزی وزیر تعلیم) ڈاکٹر سی ڈی دیشمکھ (سابق مرکزی وزیر فینانس)، مرارجی دیسائی، پروفیسر گجیند رگڈکر (سابق صدر شعبہ لسانیات، ممبئی یونی ورسٹی) پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈیوڈ میتھیوز اور فیض احمد فیضؔ وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ لکچرز و توسیعی خطبات نہ صرف آپ کی بلکہ پورے ممبئی شہر کے ادبی حلقوں کے علمی ذوق وشوق کی تسکین کا سامان مہیا کرتے تھے۔

3.1.1.3۔ تحقیقی کام

کسی بھی ریسرچ سنٹر کے قیام کا مقصد اس میں تحقیقی کام کو فروغ دینا ہوتا ہے، اس میں دیگر علمی وادبی خدمات کے ساتھ ساتھ تحقیقی کام پر بھی نگاہیں مرکوز کی جاتی ہیں اور جو تحقیقی کام انجام پاتا ہے اسے منظر عام پر بھی لایا جاتا ہے، یہ تحقیقی کام مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں جیسے تدوین متن، کسی مخصوص علاقے کی خدمات اور کسی کے

لکچرز کے انتخاب یا مجموعے وغیرہ وغیرہ۔

مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر کے قیام کا مقصد بھی تحقیق کو فروغ دینا ہے اسی لیے اس ادارے میں دیگر علمی خدمات کے ساتھ ساتھ تحقیق پر بھی زور دیا گیا جیسے تدوین متن کے تحت انشاء اللہ خان انشآ کی ''رانی کیتکی کی کہانی'' کو مختلف نسخوں سے تقابل کر کے اردو اور ہندی رسم الخط میں ترتیب دیا گیا ہے، اس میں عبدالستار دلوی نے بہ حیثیت ڈائرکٹر ایک طویل و مبسوط مقدمہ قلم بند کیا ہے جس میں انہوں نے انشآء کے حالاتِ زندگی اور تصانیف پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور بدیسی زبان کو استعمال نہ کرنے کے انشآ کے نئے تجربے کے تعلق سے نئے نتائج اخذ کیے ہیں یہ مرتب کردہ کتاب اگسٹ 1974ء میں منظر عام پر آئی اور شہرت دوام حاصل کی ہے۔

مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر میں تحقیقی زمرے میں ہونے والا دوسرا بڑا کام ''امرت بانی'' کی ترتیب ہے، آپ نے گاندھی جی کے نظریے ''ہندوستانی'' کے مطابق یہ کتاب اپنے بسیط وسیر حاصل مقدمے کے ساتھ ترتیب دی ہے، اس کتاب میں مختلف زبانوں کے شعراً کا کلام کچھ اس انداز میں ترتیب دیا گیا ہے جیسے اردو نے ارتقاء پایا ہے یہ کتاب اگسٹ 1975ء میں منظر عام پر آ کر داد و تحسین وصول کر چکی ہے اور اس منفرد کتاب کے تعلق سے عالمی شہرت یافتہ پروفیسر و ماہر لسانیات پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی کے الفاظ دیکھیے:

> ''قومی زبان کے گاندھی جی والے نظریے کے تحت میں اس طرح کی کتاب
> دیکھنے کا گزشتہ چالیس سال سے خواہش مند تھا۔ امرت بانی دیکھنے سے آج
> میری آرزو پوری ہوگئی۔''

(بہ حوالہ ماہنامہ ''کتاب نما'' دہلی، ''پروفیسر عبدالستار دلوی نمبر'' مضمون ''اردو کا خاموش خادم''، محافظ حیدر، فروری، 2006، ص۔14)

مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر میں تحقیقی زمرے میں ہونے والا تیسرا بڑا کام ''گھر آنگن'' کی ترتیب ہے یہاں یہ جان لیجیے کہ گھر آنگن جاں نثار اختر کی رباعیوں کا مجموعہ ہے جسے عبدالستار دلوی نے اضافے کے ساتھ اردو ہندی رسم الخط میں مع طویل و مبسوط مقدمے کے ترتیب دیا ہے، اس مقدمے میں انہوں نے جاں نثار اختر

کی مکمل شاعری پر تفصیل سے بحث کی ہے اور خاص کر ان رباعیوں کے تعلق سے مفصل اظہار رائے کیا ہے، یہ مرتبہ کتاب جولائی 1976ء میں شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔

عبدالستار دلوی نے مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر میں تحقیقی زمرے میں چوتھا بڑا کام یہ کیا ہے کہ اپنی ایک ماتحت محققہ (ریسرچ آفیسر) راماسین گپت سے ہندی میں ''صاحب سنگھ کی ڈائری'' ترتیب دلوائی جو سنٹر سے شائع بھی ہوئی اور مقبول بھی۔

عبدالستار دلوی نے سنٹر میں ایک اور تحقیقی کام یہ کیا کہ ڈاکٹر گرناتھ دیویکر Dr.Gurunath V.Devekar سے ''باغ و بہار'' کو ہندی رسم الخط میں ترتیب دلوائی اور اس کو سنٹر سے شائع بھی کیا۔

عبدالستار دلوی نے سنٹر میں اپنے ایک ماتحت محقق اقبال احمد سے ہندی شاعر ''عبدالرحمٰن پریمی'' کا سراپا یعنی ''Nakhshikh Varnan'' ترجمہ کروائی جس کا نسخہ برج بھاشا میں تھا یہ کتاب شائع ہو کر داد حاصل کر چکی ہے۔

سنٹر کا ایک اور تحقیقی کام یہ ہے کہ آپ نے اپنے ایک ماتحت محقق حامد اللہ ندوی سے ''لکھنو کی لسانی خدمات'' پر کتاب لکھوا کر شائع کی ہے جو منظر عام پر آ کر مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔

مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر میں ان سات بڑی کتابوں کے علاوہ پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی اور کے وی آر وی راؤ وغیرہ کے لکچرز بھی کتابی شکل میں شائع ہو کر داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر میں آپ کی نگرانی میں دو پی ایچ ڈی بھی ہوئے ہیں (۱) ڈاکٹر گرناتھ دیویکر ''اردو ادب میں ہندو دیومالائی تلمیحات اور علامات'' (انگریزی میں) (۲) ڈاکٹر فاطمہ ہارون مومن ''اردو ناولوں کے نسوانی کردار'' (اردو میں)

مختصر یہ کہ سنٹر میں نہ صرف آپ نے خود تحقیق کی بلکہ اپنے ماتحتین سے بھی تحقیقی کام کروائے جو آپ کے ایک اعلیٰ محقق ہونے کی دلیل ہے۔

مجموعی طور پر عبدالستار دلوی مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر کے پندرہ سال ڈائرکٹر رہے اور آپ نے ان پندرہ سالوں میں سنٹر میں ایک نایاب لائبریری قائم کی، سو(100) سے زیادہ لکچرز و توسیعی خطبات منعقد کیے اور تحقیقی زمرے میں سات بڑی کتابوں کے علاوہ مختلف لکچرز بھی کتابی صورت میں منظرعام پر لائے گئے اور دو پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالرس نے آپ کی نگرانی میں اپنا ڈاکٹریٹ مکمل کیا۔سنٹر میں آپ کی مجموعہ علمی خدمات کے تعلق سے ایوب واقفؔ لکھتے ہیں:

''1967ء میں اپنی نوعیت کے اس بالکل نئے ادارے کی ذمہ داریاں انہوں نے قبول کرلیں۔ اس ادارے سے ڈاکٹر عبدالستار دلوی صاحب کی وابستگی 1982ء تک تھی۔اس مدت میں انہوں نے اپنی اعلیٰ انتظامی سوجھ بوجھ اور علمی و ادبی مشاقی کے سہارے ایک نوزائیدہ لسانی و تحقیقی ادارے کو ترقی وتعمیر کے کسی مرتبے تک پہنچایا اس کا ایک زمانہ معترف ہے''۔

(ممبئی کے ساہتیہ اکادمی انعام یافتگان:''شاعر،ادیب اور مترجم''،ص۔174)

مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر میں آپ کی پندرہ سالہ مجموعی علمی خدمات پر نظر ڈالیں تو ایوب واقفؔ کا بیان درست معلوم ہوتا ہے کیوں کہ آپ کے عمل اور ایوب واقفؔ کے بیان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

3.1.2۔ بانی جوائنٹ سکریٹری، مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی:

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر ریاست میں اردو کی بقاوترویج کے لیے ایک اردو اکادمی قائم کی جاتی ہے، یہ اردو اکادمی ریاست بھر میں مختلف شعبہ جات میں انعامات تقسیم کرتی ہے جیسے میٹرک میں امتیازی کامیابی پر طلبہ کو انعام 2+ میں امیتازی کامیابی پر طلبہ کو انعام،مختلف اصناف میں شاعروں اور ادیبوں کو انعامات، بیسٹ ٹیچر انعام وغیرہ وغیرہ، اس کے علاوہ بھی اردو اکادمی مختلف اسکیمات کو عمل میں لاتی ہے جن سے اردو زبان و ادب کو فائدہ پہنچے، اس کی ترقی ہو۔

عبدالستار دلوی مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکامی کے بانی جوائنٹ سیکریٹری کے عہدے پر بارہ سال (1975-1987) تک فائز رہے اس دوران خواجہ عبدالغفور (IAS OFFICER) اکادمی کے سیکریٹری تھے اور اراکین میں کرشن چندر، علی سردار جعفری، سکندرعلی وجد، راجندرسنگھ بیدی، عصمت چغتائی، اختر الایمان، مجروح سلطان پوری، داکٹر سعید نعیم الدین، ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی اور قاضی سلیم شامل تھے اور جب خواجہ عبدالغففو رکا انتقال ہوا تو آپ ایک سال قائم مقام سیکریٹری بھی رہے۔ یہاں یہ بھی جان لیں کہ 1996ء سے 2000 تک اور 2007ء سے 2011ء تک آپ دومرتبہ اکادمی کے چیرمن بھی رہے ہیں۔

عبدالستار دلوی بہ حیثیت جوائنٹ سیکریٹری پالیسیس بناتے تھے اور خواجہ عبدالغفور بہ حیثیت سیکریٹری اس کومنظوری دیتے، عملی جامہ پہناتے، ان میں سے چند پالیسیس یہ ہیں:

ا۔ اردو میڈیم میٹرک میں امتیازی کامیابی پرطلبہ کوانعام،

2۔ اردومیڈیم 2+ میں امتیازی کامیابی پرطلبہ کونعامات

3۔ ادیبوں اورشاعروں کوانعامات 4

4۔ بیسٹ ٹیچرایوارڈ

5۔ ترجمے پر ''پنڈت سیتو مادھوراؤ پگڑی ایوارڈ

6۔ سنت گیانیشورایوارڈ وغیرہ، ان پالیسیوں کے علاوہ اردواکادمی کے تحت ٹیچرٹریننگ کورسیس بھی چلائے جاتے جو اکادمی کے زیرانتظامی ہی انجام پاتے۔

مہاراشٹر اسٹیٹ اردوساہتیہ اکادمی کے جملہ اغراض ومقاصد میں سے ایک بڑا مقصد مراٹھی اور اردو کو قریب لانا ہے جس کے لیے آپ نے اکادمی کے تحت مختلف تعلیمی وادبی سیمینارس کا بھی انعقادعمل میں لایا جن کے عنوانات کچھ اس طرح ہیں ''مراٹھی اور اردو رشتے'' اور ''مراٹھی اور اردو تراجم'' وغیرہ وغیرہ۔

عبدالستار دلوی بہ حیثیت جوائنٹ سیکریٹری بنیادگزاروں میں سے ہیں، انہوں نے تجویز پیش کی تھی کہ

پنڈت سیتو مادھوراؤ پگڑی سے اقبال کے مجموعے کلام ''بانگِ درا'' کی منتخب نظموں کو مراٹھی زبان میں ترجمہ کروایا جائے اور کمیٹی نے آپ کی یہ تجویز منظور کر لی، جس کے پیشِ نظر پنڈت سیتو مادھوراؤ پگڑی نے ''بانگ درا'' کی منتخب نظموں کو مراٹھی نثر میں منتقل کیا جو اصل کے قریب ہیں اور اکادمی نے اس کو شائع بھی کیا ہے۔ آپ کی اس تجویز اور بانگ درا کے ترجمے کے تعلق سے محمد ایوب واقفؔ کا کہنا ہے:

> ''انہوں نے مراٹھی کے مشہور اسکالر جناب سیتو مادھوراؤ پگڑی سے علامہ اقبال کے مشہور مجموعے کلام ''بانگ درا'' کا مراٹھی میں ترجمہ کروا کر شائع کیا۔ سیتو مادھوراؤ پگڑی صاحب اردو اور فارسی کے جید عالم تھے۔ چنانچہ اپنے ترجمے میں فکرِ اقبال کی اصل اسپرٹ کو سمونے میں انہوں نے جو کوشش کی وہ بلاشبہ بہت ہی کامیاب کوشش تھی''۔

(ممبئی کے ساہتیہ اکادمی انعام یافتگان: شاعر، ادیب اور مترجم، ص:182)

عبدالستار دلوی کی تجویز پر پنڈت سیتو مادھوراؤ پگڑی نے ''بانگ درا'' کا جو ترجمہ کیا وہ ہر لحاظ سے کامیاب ہے، اس ترجمے کے علاوہ آپ نے اکادمی میں ایک اور ترجمہ کروایا اور وہ تھا مراٹھی کا مشہور ناول ''Shayamchi Aai'' جس کے تخلیق کار 'Sane Guruji' تھے، اس کا اردو ترجمہ سجاد موسوی نے ع کیا، اس کے علاوہ اس ناول پر مراٹھی میں فلم بھی بنائی گئی ہے۔

عبدالستار دلوی بارہ سال اکادمی کے جوائنٹ سیکریٹری رہے اس دوران انہوں نے اکادمی کی پالیسی سازی میں اہم رول ادا کیا ہے، متعدد سمینارس منعقد کیے ہیں، اردو سے مراٹھی اور مراٹھی سے اردو میں کتابیں بھی ترجمہ کروائی ہیں، جو کہ بہت کامیاب تراجم ثابت ہوئے ہیں۔

عبدالستار دلوی بارہ سال (1987-1975) مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی کے جوائنٹ سیکریٹری کے منصب پر فائز رہنے کے بعد 1996ء میں اکادمی کے چیرمین منتخب ہوئے تو آپ نے بہ حیثیت چیرمین نئی

پالیسیاں بنائی اور پرانی پالیسیوں میں ترمیم واضافہ بھی کیے، واقعہ یہ ہے کہ 1998ء میں آپ نے بہ حیثیت چیرمین اکادمی کے سب سے بڑے ایوارڈ کے لیے مشہور شاعر، ادیب ونقاد علی سردار جعفری کے نام کا اعلان کیا تو ایک مخصوص گروہ نے علی سردار جعفری کو فرقہ پرست بتاتے ہوئے مخالفت شروع کردی، آپ نے اس مخالفت کی پرزور مخالفت کی اور کہا کہ اگر علی سردار جعفری کو سنت گیا نیشور ایوارڈ نہیں ملا تو ''میں'' چیرمین شپ سے استعفیٰ دے دوں گا، غالباً اس وقت کی مہاراشٹر حکومت بھی مخالفین کی تائید میں تھی مگر وہ آپ کا استعفیٰ قبول کرنے کے بھی حق میں نہیں تھی، نتیجتاً آپ کا استعفیٰ رد ہوا اور علی سردار جعفری کو سنت گیا نیشور ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔

عبدالستار دلوی کا استعفیٰ قبول نہیں ہوا اور آپ کی چیرمین شپ 2000ء تک جاری رہی اور اس میعاد کے بعد 2007ء میں آپ کو دوبارہ اردو اکادمی کے چیرمین ہونے کا اعزاز ملا تو آپ نے پھر اکادمی کی پالیسیوں کا جائزہ لیا اور ان میں ردوبدل کیے، مختلف تعلیمی وادبی موضوعات پر سمینارس منعقد کیے اردو زبان وادب کو ریاست بھر میں فروغ دیا، ترجمے کے ذریعے اردو اور مراٹھی زبان وادب کو قریب کیا اور 2011ء تک اکادمی کے چیرمین برقرار رہے۔

عبدالستار دلوی دو مرتبہ اردو اکادمی کے چیرمین رہے اور اپنی چیرمین شپ میں انہوں نے ریاست کے ہر ضلع میں اردو کی صورت حال کو بہتر بنانے کی کوشش کی، پالیسی سازی کی سمینارس کروائے، غرض ریاست میں اردو زبان وادب کے لیے راہیں ہموار کیں۔

3.1.3۔ بانی صدر شعبۂ اردو کرشن چندر پروفیسر، ممبئ یونی ورسٹی:

لفظ 'شعبہ' کے لغوی معنی حصہ، شاخ اور محکمہ کے آتے یں جب کہ اصطلاحی معنی میں شعبہ سے مراد وہ شاخ اور محکمہ ہوتا ہے جو کسی مخصوص میدان میں کسی مخصوص مقصد کو حاصل کرنے کے لیے بنایا جاتا ہے، کسی بھی یونی ورسٹی میں ہر ایک مضمون (Subject) کے لیے علاحدہ شعبہ ہوتا ہے، جو اس مخصوص مضمون میں اعلیٰ تعلیم دینے کے علاوہ اس مضمون سے متعلق سیمینارس توسیعی خطبات اور پروجکٹس وغیرہ کا انعقاد عمل میں لاتا ہے، البتہ شعبہ کا ایک

مخصوص اشاعتی پروگرام بھی ہوتا ہے جس کے مقاصد ولائحہ عمل کے تحت مختلف موضوعات پر کتابیں مرتب، ترجمہ اور تصنیف کی جاتی ہیں، اسی طرح ایک متعینہ مدت میں طے شدہ مقاصد کو حاصل کیا جاتا ہے جس کے بعد مقاصد ولائحہ عمل کو اور ترقی دی جاتی ہے جن کو حاصل کرنے کے لیے شعبہ اپنی سرگرمیاں انجام دیتا رہتا ہے اسی طرح ایک مخصوص شعبے کے تحت ایک مخصوص مضمون کی ترقی و ترویج کی جاتی ہے۔

عبدالستار دلوی جب مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر میں ڈائرکٹر تھے تو انہوں نے ممبئی یونی ورسٹی میں شعبہ اردو کے عنقریب قیام کا اعلان نامہ دیکھا، خاص بات یہ ہے کہ شعبہ اردو کے قیام کے ساتھ ہی صدر شعبہ کے لیے کرشن چندر چیئر مختصر کر دی گئی تھی جب صدر شعبہ اردو اور کرشن چندر پروفیسر کی جائیداد کا اعلامیہ جاری ہوا تو آپ بھی درخواست دینے کے خواہش مند ہوئے اور درخواست دے بھی دی، یہاں دیگر درخواست گزاروں میں آدم شیخ اور ظ۔انصاری کے نام قابل ذکر ہیں اور جب ایک مخصوص گروہ کو یہ محسوس ہوا کہ انتخاب آپ ہی کا ہوگا کیوں کہ آپ تمام درخواست گزاروں میں سب سے زیادہ قابل، تجربہ کار اور انتظامی صلاحیت رکھتے ہیں تو اس گروہ نے اخباروں میں آپ کے خلاف مراسلے لکھنا شروع کر دیے اور بار بار یہ کہا جا رہا تھا کہ ''انتخاب کسی اہل زبان کا ہونا چاہیے'' چونکہ آپ کوکنی ہیں تو آپ کا انتخاب نہ ہو کر کسی یو پی والے اہل زبان کا ہونا چاہیے لیکن انتخاب تو قابلیت اور صلاحیت کی بنیاد پر ہونا چاہیے تھا اور آخر میں ہوا بھی وہی۔

3.1.3.1۔شعبۂ اردو کا قیام:

کسی نئے شعبے کا قیام عمل میں لانا بہت مشکل امر ہے کیوں کہ نئے شعبے کے لیے نئی عمارت، اساتذہ، طلبہ، نصاب اور لائبریری وغیرہ کا ہونا ضروری ہے اور ان سب سے بڑھ کر ان سب کی کارکردگی کو بہتر طور پر چلانے کے لیے ایک انتظامی امور کی صلاحیت رکھنے والے صدر کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔

عبدالستار دلوی نے ممبئی یونی ورسٹی میں شعبہ اردو کا قیام عمل میں لایا، یہاں وَہ صدر شعبہ کے ساتھ ساتھ کرشن چندر پروفیسر بھی بنائے گئے اور آپ کے انتخاب سے قبل جو گروہ آپ کے مخالف تھا وہ انتخاب کے بعد

مبارکباد دینے والوں میں سب سے پیش پیش تھا۔

عبدالستار دلوی نے 22 ستمبر 1982ء کو صدر شعبہ اردو و کرشن چندر پروفیسر کا عہدہ سنبھالا، یہ شعبہ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی کے عطیے سے قائم کیا گیا ہے اور مشہور افسانہ وناول نگار آنجہانی کرشن چندر کے نام سے موسوم ہے، لیکن شعبہ کا افتتاحی جلسہ 4 فروری 1983ء کو منعقد ہوا اس جلسے میں یونی ورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر رام جوشی نے استقبالیہ خطبہ پڑھا اور شعبہ کے اغراض ومقاصد بیان کیے جب کہ نامور شاعر، ادیب ونقاد علی سردار جعفری نے افتتاحی خطبہ دیا اور اس افتتاحی جلسے میں شریک شرکا میں جناب معین الدین حارث (مشہور صحافی دانشور انجمن اسلام ممبئی)، را۔بھی ۔جوشی (مراٹھی ادیب اور اردو سے مراٹھی مترجم) اور ڈاکٹر عبدالقدوس منشی (سابق چیرمین مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی) ودیگر شامل تھے۔

سوسالہ قدیم ممبئی یونی ورسٹی میں شعبہ اردو کے قیام سے پہلے بھی یونی ورسٹی کا ایک پوسٹ گریجویٹ بورڈ تھا جس کے تحت ایم اے اردو کورس چلایا جاتا تھا مگر شعبے کے قیام کے بعد مرکزی حیثیت شعبے کو حاصل ہوگئی اور یہ کورس شعبے کے تحت چلایا جانے لگا تو طلبہ کی تعداد پندرہ، بیس سے بڑھ کر سو، سوا سو ہوگئی، اس کے علاوہ اردو سے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے کورسس بھی نئے تعلیمی سال سے شروع کیے گئے۔

عبدالستار دلوی نے اپنی قابل شخصیت اور انتظامی صلاحیت سے اس نوزائیدہ شعبے کو جو استحکام بخشا ہے یہ اسی کی دین ہے کہ شعبہ کچھ ہی سالوں میں دوسری یونی ورسٹیوں کے شعبوں کے مدمقابل پیش کیا جاسکتا ہے۔

3.1.3.2۔کرشن چندر چیئر:

کرشن چندر اردو کے نامور افسانہ وناول نگار، ادیب اور مصنف ہیں، انہوں نے 32 افسانوی مجموعے، 47 ناول، 18 ڈرامے، بچوں کا ادب میں 11 کتابیں اور 2 رپورتاژ تخلیق کیے ہیں، آپ کے افسانوں میں ''زندگی کے موڑ پر'' کالو بھنگی اور ان داتا شہرت عام رکھتے ہیں، ناولوں میں ''شکست کے بعد'' ڈراموں میں ''دروازے کھول دو'' اور رپورتاژ میں ''پودے'' نمایاں مقام کے حامل ہیں۔

ممبئ یونی ورسٹی میں جب شعبہ اردو قائم ہوا تو اس میں ایک مخصوص چیئر ''کرشن چندر چیئر'' کے نام سے مختص کی گئی جو صدر شعبہ کے لیے ہی تھی۔ اس تعلق سے عبدالستار دلوی لکھتے ہیں:

''اس شعبے کو اردو کے ممتاز مصنف، ادیب، افسانہ نگار اور ناول نگار آنجہانی کرشن چندر کو ان کے شایان شان خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے کرشن چندر چیئر کے نام سے معنون کیا گیا تھا۔''

(ادبی ولسانی تحقیق اصول وطریق کار، ص۔9)

شعبہ اردو مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی کے عطیے سے قائم کیا گیا ہے اور کرشن چندر چیئر کے اغراض و مقاصد بھی وہی ہیں جو مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی کے ہیں لیکن سب سے اہم مقصد مراٹھی کو اردو سے اور اردو کو مراٹھی سے قریب لانا ہے۔

عبدالستار دلوی بانی صدر شعبہ اردو وکرشن چندر پروفیسر منتخب ہوئے اور تقریباً پندرہ سال (1982-1997) تک اسی عہدے پر سرفراز رہے چناں چہ آپ کے دورِ صدارت میں شعبے نے جو ترقی کی ہے اس کا ایک زمانہ معترف ہے۔

3.1.3.3۔ بہ حیثیت تحقیق کے نگران:

لفظ تحقیق کے لغوی معنی تفتیش، دریافت اور چھان بین کے آتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے مطابق:

''اصطلاحاً یہ ایک طرز مطالعہ کا نام ہے جس میں موجود مواد کے صحیح یا غلط کو بعض مسلمات کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے۔''

(ادبی ولسانی تحقیق اصول وطریق کار، ص۔111)

ڈاکٹر سید عبداللہ کے لیے تحقیق طرز مطالعہ کا نام ہوسکتا ہے مگر بقول پروفیسر مظفر علی شہ میری تحقیق پانچ

مراحل کے مجموعے کا نام ہے اور یہ پانچ مراحل اس طرح ہیں: 1۔مسئلہ دریافت کرنا 2 ۔معلومات جمع کرنا 3۔ رائے قائم کرنا 4۔ بحث تیار کرنا اور 5۔ نتیجہ اخذ کرنا۔ان پانچ مراحل کو طے کر لینے کے بعد ایک عمدہ تحقیق وجود میں آتی ہے ویسے تو کوئی بھی تحقیق حرف آخر نہیں ہوتی مگر یہ پانچ مراحل تحقیق شکوک سے پاک ہوتی ہیں کیوں کہ اس میں ہر مسئلہ پر ہر زاویے سے بحث کی جاتی ہے اور نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔

تحقیق ایک مشکل امر ہے کیوں کہ اس میں محقق کو مختلف دشوار گزار مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے ان دشوار گزار مرحلوں سے گزرنے کے لیے محقق میں چند اوصاف کا ہونا ضروری ہے۔عبدالستار دلوی کے مطابق محقق میں ان اوصاف کا ہونا لازمی ہے:

''محقق کے اوصاف کی فہرست میں مندرجہ ذہنی قویٰ کا ہونا ضروری ہے:

1۔ قوتِ استدلال : اخذیاتی اور تخلیقی

2۔ قوت حافظہ : ادراکی مفصل اور مبنی بر دلائل

3۔ مراقبہ (ارتکازِ فکر) : مصبوط اور طویل

4۔ ذہنی صداقت : اپنی جانب اور موضوع کی جانب

5۔ شوق اور حوصلہ : بنیادی تخلیقی عمل سے متعلق

6۔ تجسس : مستعد اور فعال عمل

(ادبی ولسانی تحقیق اصول وطریق کار،ص۔22)

ایک محقق میں مندرجہ بالا اوصاف کا ہونا لازمی تصور کیا جاتا ہے تو کیا اس محقق کے لیے ایک رہنما کا ہونا ضروری نہیں؟ بالکل ضروری ہے کیوں کہ محقق ناتجربہ کار رہتا ہے اس لیے اسے ایک تجربہ کار رہنما کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔

یونی ورسٹیوں میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے محققین کے لیے ایک رہنما کو منتخب کیا جاتا ہے، جو محقق کے تحقیقی مراحل میں پیش آنے والی دشواریوں کو حل کرنے میں مدد کرتا ہے، محقق کے تحقیقی مسودے پر نظر ثانی کرتا ہے اور مسودے کی نوک پلک درست کرتا ہے، غرض رہنما موضوع کے انتخاب سے لے کر مقالے کو یونی ورسٹی میں داخل کرنے تک کے ہر مرحلے میں محقق کی رہنمائی کرتا ہے اسی لیے محقق کی رہنمائی کے لیے رہنما میں بھی چند اوصاف کا ہونا ناگزیر ہے۔ عبدالستار دلوی رہنما کے اوصاف سے متعلق فرماتے ہیں:

> ''مشورہ دیتے وقت راہ نما کو غیر جانبدار اور نرم ہونا چاہیے۔ اس کو چاہیے کہ وہ پوری فراخ دلی کے ساتھ محقق کی دشواریوں کو سمجھنے اور ان کا حل پیش کرنے میں اور محقق کے پیش کردہ دلائل کی تردید میں اپنے احساس برتری یا کسی قسم کے دباؤ کا استعمال نہ کرے۔ اسے چاہیے کہ وہ اپنے دلائل کے مخالف دلائل کو بھی اگر وہ قابل یقین ہیں، منظور کر لے یعنی رہنما کا طرز عمل ایسا ہونا چاہیے کہ محقق کی آزادی، اس کا حوصلہ اور تجسس وغیرہ کسی طرح کم نہ ہو سکیں بلکہ بڑھتا ہی رہیں۔''

(ادبی ولسانی تحقیق اصول وطریق کار، ص۔ 27)

عبدالستار دلوی کے بیان کیے گئے رہنما کے اوصاف اگر ہر رہنما میں موجود ہوں تو رہنما اپنے فرض کو بہ خوبی انجام دے سکتا ہے جس کی وجہ سے محقق بھی اپنی تحقیق بہتر طور پر کر سکتا ہے۔

عبدالستار دلوی بہ حیثیت استاد ایک مددگار، مخلص اور ہمدرد دل رکھتے ہیں مگر بہ حیثیت نگران وہ ایک اصول وضوابط کے پابند، سخت مزاج اور محنت پسند شخصیت ہیں، بس یہ سمجھئے کہ یہ بہ حیثیت استاد ہر ممکن طریقے سے اپنے شاگردوں کی مدد کرتے ہیں جب کہ بہ حیثیت نگران وہ چاہتے ہیں کہ ان کا محقق محنت ومشقت کرے، تن آسانی سے کام نہ لیں، جائز طریقوں ہی کو اپنائیں اور وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ان کے محقق تمام اصول وضوابط کی

پابندی کریں، کثرت مطالعہ سے اپنے اندر قابلیت پیدا کریں اوران کوسخت مزاج کہنے کا یہ مطلب ہرگز بھی نہیں ہے کہ وہ اپنے محققین کی پریشانیوں کوخاطر میں نہ لاتے ہوں دراصل وہ اپنے محققین کی پریشانیوں کوبھی نرم دلی سے سنتے ہیں اورحل تجویز کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ خودایک عمدہ محقق اور بہترین نگران ثابت ہوئے ہیں۔

عبدالستار دلوی صدرشعبہ اردو وکرشن چندر پروفیسر کے عہدے پر پندرہ سال فائز تھے اوران پندرہ برسوں میں آپ کی رہنمائی میں پانچ ریسرچ اسکالرس نے ڈاکٹریٹ کی اور دونوں نے ماسٹرآف فلاسفی (ایم فل) کی ڈگری لی۔ان ریسرچ اسکالرس کے نام اورموضوع کچھ اس طرح ہیں۔

1۔ ڈاکٹر رشید آثار، تحقیقی موضوع ''کرشن چندراور یشپال کی کہانیوں کا تقابلی مطالعہ''۔

2۔ ڈاکٹرکلثوم ابوالبشر، تحقیقی موضوع ''ڈاکٹرعندلیب شادانی: حیات اورکارنامے'' ۔

3۔ ڈاکٹرسعیدہ اختر پٹیل، تحقیقی موضوع ''مہاراشٹر کی اردومثنویوں کاتحقیقی وتنقیدی مطالعہ''۔

4۔ ڈاکٹرعطاءالرحمٰن صدیقی ندوی، تحقیقی موضوع ''اردوشاعری میں اسلامی تلمیحات''۔

5۔ ڈاکٹر شیخ حیدرعلی اندوروالا، تحقیقی موضوع ''اردو اور عربی میں انقلاب اور آزادی کی شاعری۔ایک تقابلی مطالعہ''

ماسٹرآف فلاسفی (ایم فل) کے ریسرچ اسکالرس اور تحقیقی موضوع:

1۔ سیدعباس مجتہد، تحقیقی موضوع ''یوسف ناظم''

2۔ دل افروز خان، تحقیقی موضوع ''شہربھیونڈی کی اردوخدمات''

یہاں میں یہ واضح کردوں کہ ڈاکٹرمعین الدین جینا بڑے نے ''عارف الدین عاجز اورنگ آبادی دیوان کی تحقیق مع مقدمہ'' کے موضوع پرآپ کی نگرانی میں تحقیقی کام مکمل کیالیکن آپ کی سبکدوشی کے بعد نئے

صدر وکرشن چندر پروفیسر، پروفیسر یونس اگاسکر کی نگرانی میں یونی ورسٹی میں ڈاکٹریٹ کے لیے داخل کیا اور آپ نے ڈاکٹر معین الدین جینا بڑے کے اس غلط رویے کے خلاف یونی ورسٹی انتظامیہ کو لکھا مگر بعد میں آپ ہی نے اپنا بڑا پن دکھاتے ہوئے انہیں معاف کر دیا۔

عبدالستار دلوی کی زیرِ نگرانی میں مکمل ہوئے ان مقالوں کے موضوعات پر اگر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ موضوعات کتنے متنوع ہیں اور آپ کی گرفت ادب کے مختلف گوشوں پر کتنی مضبوط ہے دراصل ادب کے ذخائر پر گرفت حاصل کرنے کے لیے ذوق ادب کے ساتھ ساتھ دور رس نگاہیں بھی ہونی چاہیے۔ ادبی ذخائر پر آپ کی گرفت کے تعلق سے مقبول احمد تشنہ رقم طراز ہیں:

> ''دلوی صاحب کا ذوق ادب اور دور رس نگاہیں اردو ادب کے لامحدود ذخائر پر اس طرح مسلط ہیں جیسے زمین کی وسعتوں پر آسمان کا یہ شامیانہ پھیلا ہوا ہے۔ طلبائے تحقیق کے نگران کی حیثیت سے ڈاکٹر دلوی کو اردو کی نایاب کتابوں کے بارے میں مکمل معلومات حاصل ہیں۔ اردو کی اہم کتابوں کے مختلف نسخہ جات ہندوستان اور دنیا کی مختلف لائبریریوں اور کتب خانوں میں کہاں کہاں پھیلے ہوئے ہیں، اس کی مکمل معلومات آپ کو دلوی صاحب سے حاصل ہو سکتی ہیں''۔

(ماہنامہ 'کتاب نما' دہلی، پروفیسر عبدالستار دلوی نمبر، مضمون پروفیسر دلوی: ایک دلنواز شخصیت، فروری، 2006، ص۔ 26-25)

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ عبدالستار دلوی نے اپنی مرتبہ کتاب ''ادبی ولسانی تحقیق اصول وطریق کار'' میں نگران کے جو اوصاف بیان کیے ہیں ان اوصاف پر وہ خود بہ حیثیت تحقیق کے نگران مکمل طور پر عمل پیرا ہیں۔

3.1.3.4۔ لکچرز، توسیعی خطبات و سمینارس:

کسی بھی ادارے میں لکچرز، توسیعی خطبات و سمینارس منعقد کرنے کے لیے ادارے کے منتظم کو باذوق اور اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کا حامل ہونا ضروری ہے کیوں کہ ادارے میں منعقد لکچرز، توسیعی خطبات و سمینارس کی

کامیابی کا انحصار منتظم کی انتظامی صلاحیت اور اس کے ذوق ہی پر منحصر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ منتظم میں انتظامی صلاحیتوں کی غیر موجودگی میں بھی لکچرز و خطبات منعقد ہو سکتے ہیں مگر وہ کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو سکتا۔

عبدالستار دلوی نے بہ حیثیت صدر شعبہ اردو کرشن چندر پروفیسر (1997-1982ء) شعبہ اردو میں کثیر تعداد میں لکچرز و سمینارس کا اہتمام کیا ہے یہ لکچرز و سمینارس آپ کی اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کی وجہ سے کامیاب بھی ہوئے ہیں اور بعض سمینارس میں تو شرکا کی تعداد ہال کی نشستوں سے بھی بڑھ جاتی تھی مگر ان نشستوں کی کمی کو وقت رہتے پورا کر لیا جاتا تھا۔

شعبہ اردو ممبئی یونی ورسٹی کا پہلا اجتماع شعبے کا افتتاحی جلسہ تھا جس میں استقبالیہ کلمات اور شعبہ کے اغراض و مقاصد یونی ورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر رام جوشی نے بیان کیے اور افتتاحی خطبہ نامور شاعر، ادیب و نقاد علی سردار جعفری نے دیا تھا اس جلسے میں ممبئی کے ادبی حلقوں کی مشہور ہستیاں موجود تھیں۔

چوں کہ شعبۂ اردو میں صدر شعبہ کے لیے کرشن چندر چیئر مختص کر دی گئی تھی تو صدر شعبہ اردو پروفیسر عبدالستار دلوی نے صدر شعبہ و کرشن چندر پروفیسر منتخب ہوتے ہی آنجہانی کرشن چندر پر قومی سمینار کا انعقاد کر ڈالا، یہ سمینار اگست 1983ء میں منعقد ہوا تھا اس کا موضوع ''کرشن چندر فن اور شخصیت'' تھا اور اس میں کرشن چندر کے ہم عصروں میں سے راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، خواجہ عبدالغفور، علی سردار جعفری، عزیز قیسی، یوسف ناظم، پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر صادق، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی اور پروفیسر گیان چند جین وغیرہ شامل تھے دراصل یہ سمینار کرشن چندر کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے تھا اور یہ سمینار شعبہ اردو کا پہلا کامیاب سمینار تھا۔

شعبۂ اردو کا تیسرا اجتماع سمینار کی شکل میں منعقد ہوا اس سمینار کے تمام مقالہ نگار ایم اے اردو کے طلبہ و طالبات تھے اس سمینار میں طلبہ و طالبات نے پوری خود اعتمادی کے ساتھ مقالات پڑھے، بقول عبدالستار دلوی طلبہ کی عملی تربیت بھی ہمارا ایک مقدس ترین فرض بن جاتا ہے اور بمبئی یونی ورسٹی کا شعبہ اردو اپنے اس فرض کی تکمیل میں پوری طرح سرگرم ہے۔ انہوں نے بہ حیثیت صدر شعبہ کے اس نوزائیدہ شعبے کو ترقی دے کر دوسرے شعبوں کے

مدمقابل پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے نوجوان طلبہ وطالبات کی عملی تربیت کا بھی خیال رکھا اور نہ صرف خیال رکھا بلکہ ان کے لیے باقاعدہ سمینار کا اہتمام کیا یہ ایک غیر معمولی بات ہے۔

شعبہ اردو کا چوتھا اجتماع نومبر 1983ء میں لکچر کے روپ میں منعقد ہوا۔ اس لکچر کا موضوع ''جدید اردو شاعری کی تفہیم'' تھا۔ اس لکچرر کے صدر نامور شاعر اختر الایمان تھے اور مقررین میں محمود سروش اور حسن نعیم مدعو تھے اور موضوع پر دونوں مقررین کی تقاریر کے بعد صدر جلسہ اختر الایمان نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ ''شاعری کو نئی اور پرانی کے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا اتنا ضرور ہے کہ ہر دور کی ضروریات اور عصری تقاضوں کے مطابق اس کی ہیئت اور آہنگ بدلتا رہتا ہے۔'' یہ لکچر شعبہ اردو کا ایک کامیاب لکچر تھا۔

شعبہ اردو کا ایک اور اجتماع سمینار کی شکل میں یکم فروری 1984ء کو منعقد ہوا اس سمینار کا موضوع ''ادبی و تنقیدی کتابوں پر تبصرہ'' تھا۔ اس سمینار کی خاص بات یہ تھی کہ یہ طلبہ کے لیے تھا جس میں تین طلبہ اور تین طالبات نے مقالات پیش کیے جہاں کل چھ مقالات میں سے تین مقالات مشہور شاعر مخدوم محی الدین کے شعری مجموعے ''بساطِ رقص'' کے تبصروں پر مبنی تھے وہیں دو مقالات نظیرا کبرآبادی کی انفرادی شاعری سے متعلق تھے۔ اور ایک مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیف ''غبارِ خاطر'' کے فنی رموز پر مشتمل تھا۔ اور طلبہ کے لیے منعقد اس دوسرے سمینار میں طلبہ وطالبات نے پہلے سمینار سے زیادہ جوش وخروش اور خود اعتمادی دکھائی۔ یہ سمینار شعبہ کے کامیاب سمینارس میں سے ایک ہے۔

شعبہ اردو کا ایک اور اجتماع سلسلہ وار لکچرز کی شکل میں منعقد ہوا جو 7،8 اور 9 فروری 1984ء کو ہوئے تھے۔ ان لکچرز کے مقرر آپ کے استاد محترم ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی تھے یہ لکچرز ایک ہی موضوع کی سلسلہ وار کڑیاں تھیں، جس کا موضوع ''دکنی اور گجری زبان وادب'' تھا اور یہاں ڈاکٹر مدنی کے عالمانہ لب ولہجہ اور موضوع پر گرفت نے ان لکچرز کو کامیابی ہم کنار کر دیا۔

شعبہ اردو کا اگلا پروگرام ''غالبؔ اور ان کی شاعری'' پر سمینار تھا جس کی صدارت نامور شاعر مجروحؔ

سلطان پوری نے کی تھی اور اس سمینار کی خاص بات یہ تھی کہ مراٹھی، اردو اور فارسی کے جید عالم ومورخ پنڈت سیتو مادھوراؤ پگڑی نے غالبؔ کی شاعری کے ارتقاء کو تاریخی پس منظر میں پیش کیا۔اس کے علاوہ دوسرے مقررین نے بھی عالمانہ تقاریر کیں ان دوسرے مقررین میں حسن نعیم اور عزیز قیسی قابل ذکر ہیں یہ سمینار شعبے کا اب کا سب سے کامیاب سمینار تھا۔

شعبہ اردو کا اگلا پروگرام 22 تا 24 دسمبر 1985ء کو سہ روزہ قومی سمینار کی شکل میں وجود میں آیا اس سمینار کا موضوع ''دکنی اردو'' تھا، اور اس سمینار میں دکنی اردو کے مختلف پہلوؤں پر 24 مقالات پڑھے گئے۔لہٰذا یہ سمینار شعبہ کا کامیاب سمینار تھا اس سمینار کی صدارت ڈاکٹر رفیق ذکریا نے کی اور کلیدی خطبہ اردو، فارسی اور مراٹھی کے جید عالم ومورخ پنڈت سیتو مادھوراؤ پگڑی نے دیا۔

چارروزہ قومی سمینار بہ موضوع ''اردو املا اور رسم الخط'' شعبہ کا ایک اور سمینار ہے اس سمینار کا افتتاح علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر سید حامد نے کیا اور شرکا میں پروفیسر مسعود حسین خان، پروفیسر گیان چند جین، پروفیسر رشید حسن خان، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور پروفیسر اسلم مرزا کے نام قابل ذکر ہیں، اس سمینار کے موضوع کی نوعیت کے پیشِ نظر شہر کے اردو اسکولوں کے اساتذہ نے بھی بڑے انہماک سے شرکت کی۔

''دکنی اردو'' اور ''اردو املا اور رسم الخط'' یہ دونوں سمینار یو جی سی کے مالی تعاون سے منعقد کیے گئے تھے۔ شعبہ کے منعقدہ ان دونوں سمیناروں کے تعلق سے عبدالستار دلوی لکھتے ہیں:

> ''گزشتہ دس برسوں میں شعبۂ اردو نے گرچہ پچاس سے زیادہ سمینارس، سمپوزیم منعقد کیے ہیں تاہم دو سمینار کچھ ایسی تاریخی نوعیت کے ثابت ہوئے کہ ان کی صدائے بازگشت تا دیر ہندوستان کے طول وعرض میں سنائی دیتی رہی اور سارے ملک کی توجہ ان سمیناروں کی وجہ سے شعبہ اردو کی جانب مرکوز ہوگئی۔ یہ

سمینار(۱)دکنی اردواور(۲)اردواملااوررسم الخط۔''

(شعبۂ اُردو بمبئ یونی ورسٹی کے قیام کے دس سال، درس وتدریس اورعلم وادب کی خدمات کا

دور، غیرمطبوعہ)

شعبۂ اُردو کا ایک اوراجتماع سلسلہ وار لکچرز کی شکل میں منعقد ہوا یہ سلسلہ وار لکچرز پروفیسر نذیر احمد (سابق صدر شعبۂ فارسی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی) نے دیے، یہ لکچرز 22یا24 مارچ 1987ء کو تصحیح اور تحقیق متن پر دیے گئیے تھے، غالباً شعبے کے دوسرے لکچرز وسمینارس کی طرح یہ لکچرز بھی بہت کامیاب رہے۔

شعبۂ اُردو نے نامور شاعر جاںنثار اختر کے فکروفن پر بھی ایک قومی سمینار کا اہتمام کیا تھا۔ یہ سمینار بھی ہر اعتبار سے کامیاب رہا۔

علی سردار جعفری کا تعلق آپ سے اور شعبہ اردو بمبئ یونی ورسٹی دونوں سے کافی گہرا تھا اور جب علی سردار جعفری نے اپنی زندگی کی اسّی بہاریں (80 Years) مکمل کرلیں تو آپ نے ان کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد کیا جس کی صدارت ڈاکٹر رفیق ذکریا نے کی یہ جلسہ شعبے کا ایک یادگار جلسہ تھا۔

ان لکچرز وسمینارس کے علاوہ بھی شعبے میں مختلف علمی، ادبی ولسانی موضوعات پر لکچرز وسمینارس منعقد ہوتے رہے ہیں، عبدالستار دلوی نے بہ حیثیت صدر شعبہ کے شعبہ میں جواجتماعات اور تقریبات منعقد کیں تھیں ان کے تعلق سے مقبول احمد تشنہ کا خیال ہے:

> ''اپنے طلبہ کے مفادات کے پیش نظر وہ شعبہ اردو میں اکثر وبیشتر ایسی تقریبات منعقد کرتے رہتے جو طلبہ کے ذہنی تربیت کے لیے انتہائی مثبت کردار ادا کرتی ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے اپنے شعبے میں ملک گیر اور علاقائی وعالمی پیمانے پر کئی ایسے اجتماعات کا اہتمام کیا ہے جو تاریخ اردو میں ایک یادگار حیثیت کے حامل رہیں گے۔ شعبہ اردو کی ان مصروفیات اور رنگارنگ تقریبات کو دیکھ کر یونی ورسٹی

کی ذمہ دار شخصیتوں اور دیگر شعبہ جات کے صدور نے بار ہا یہ اعتراف کیا ہے کہ
غیر نصابی لیکن مفید سرگرمیوں کے سلسلے میں شعبہ اردو یونی ورسٹی کا فعال ترین شعبہ
ہے۔''

(ماہنامہ 'کتاب نما' دہلی، پروفیسر عبدالستار دلوی نمبر، مضمون: پروفیسر دلوی: ایک دلنواز شخصیت، فروری، 2006ء، ص۔25)

عبدالستار دلوی نے شعبہ میں لکچرز و سیمینارس منعقد کرتے ہوئے اپنے طلبہ و طالبات کی ذہنی تربیت تو کی ہی ہے اس کے ساتھ ساتھ نوزائیدہ شعبہ کو بھی ترقی دے کر یونی ورسٹی کے دوسرے شعبہ جات اور دوسری یونی ورسٹیوں کے اردو شعبوں میں شعبہ اردو بمبئی یونی ورسٹی کو ایک فعال و سرگرم شعبہ بنا دیا۔

3.1.3.5۔شعبہ کا اشاعتی پروگرام:

کسی بھی شعبے کا ایک اشاعتی پروگرام ہوتا ہے یہ پروگرام سالانہ مجلّے کی شکل میں بھی ہوسکتا ہے اور کسی ایک موضوع پر ایک کتاب کی شکل میں بھی ہوسکتا ہے ایسے پروگراموں میں زیادہ تر کتابیں منعقدہ سمیناروں کے مقالات کا مجموعہ بھی ہوسکتیں ہیں یا پھر کسی مخصوص موضوع پر مرتبہ کتاب بھی ہوسکتی ہے، اس کے علاوہ کسی دوسری زبان کی مشہور تصانیف کے ترجمے بھی ہوسکتے ہیں۔

عبدالستار دلوی نے صدر شعبہ اردو و کرشن چندر پروفیسر کا عہدہ سنبھالتے ہی یونی ورسٹی انتظامیہ کو ایک تجویز پیش کی جس کے تحت شعبہ اپنا ایک اشاعتی پروگرام ''اردو نامہ'' کے عنوان سے بنائے گا، اور اس پروگرام کے تحت شعبہ ہر سال ایک کتاب کی اشاعت عمل میں لائے گا، یہ کتاب مرتبہ، ترجمہ یا انتخاب ہوسکتی ہے جس کو یونی ورسٹی کے اربابِ حل وعقد نے منظور کرلیا اور اپنے پندرہ سالہ صدارتی دور میں آپ نے شعبہ کے ''اردو نامہ'' پروگرام کے تحت سات غیر معمولی کتابیں شائع کیں جن میں آپ کے حسن انتخاب اور کامیاب تراجم کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

''اردو نامہ'' کے اشاعتی پروگرام کے تحت شعبے سے شائع ہونے والی پہلی کتاب ''ادبی ولسانی تحقیق اصول وطریق کار'' ہے۔ یہ کتاب فن تحقیق کے مختلف پہلوؤں پر ماہرین علم وادب کومضامین کا ایک حسین انتخاب ہے یہ کتاب شعبے نے اپنے قیام کے دوسرے ہی سال یعنی دسمبر 1984ء میں شائع کردی اوراپنی اشاعت کے بعد یہ کتاب ہندوستان کے ساتھ ساتھ پاکستان میں بھی دادوتحسین وصول کرچکی ہے۔اس کتاب پرآپ نے جو طویل ومبسوط مقدمہ لکھاہے وہ خودایک علاحدہ کتاب کی شکل میں سندھی میں ترجمہ ہوااس کے مترجم Baldev Matlani ہیں۔ان کواس ترجمے پرساہتیہ اکادمی کا ترجمہ ایوارڈ 1999ء بھی ملاہے۔سندھی میں اس کاعنوان ''Funey Tahqiq Ain Unja Usool'' ہے۔

''اردو نامہ'' پروگرام کے تحت شعبہ اردو سے شائع ہونے والی دوسری کتاب ''ساوتری'' ہے دراصل ساوتری مشہورمراٹھی ناول نگار پروفیسر پرشوتم شیورام ریگنے کے مراٹھی ناولٹ کا اردوترجمہ ہےاوراس ترجمہ کے مترجم عبدالستاردلوی ہیں یہ ترجمہ شدہ ناولٹ تقریباً اسی 80 صفحات پرمشتمل ہے۔ یہ کتاب مارچ 1986ء میں منظرعام پرآئی اورمقبول بھی ہوئی۔

شعبہ اردو کے ''اردونامہ'' پروگرام کے تحت شائع ہونے والی تیسری کتاب ''رن آنگن'' ہے، واضح رہے کہ رن آنگن مراٹھی ناولٹ ہےجس کےتخلیق کارو شرام بیڈیکر ہیں۔اورعبدالستاردلوی نے اس مراٹھی ناولٹ کواردو میں ترجمہ کرکے شعبہ اردو بمبئی یونی ورسٹی سے شائع کیاہے، یہ ناولٹ تقریباً 140 صفحات پرمشتمل ہےاور پہلی بار اردومیں مارچ 1987ء میں شائع ہوکر دادحاصل کرچکاہے۔

شعبہ اُردو کے ''اردونامہ'' پروگرام کےتحت اشاعت عمل میں آنے والی اگلی کتاب ''دکنی اردو'' ہے دسمبر 1985ء میں منعقدہ ''دکنی اردو'' سیمنار کے مقالات کا مجموعہ ہے، واقعہ یہ ہے کہ عبدالستاردلوی کو ہمیشہ سے دکنی اردو پرایک مفصل کتاب کی کمی محسوس ہوتی رہتی تھی جس کا سبب دکنی اردوسیمناررہتا اورسیمنار کےتقریباً دوسال بعد تاخیرہی سے صحیح کتاب کی اشاعت ہوئی،س کتاب میں دکنی اردو کےمختلف پہلوؤں پر 24 مقالات موجود ہیں اور

تمام مقالہ نگاروں نے موضوع پر اپنی مضبوط گرفت کو مقالوں کی شکل میں پیش کیا ہے۔ یہ کتاب 480 صفحات پر مشتمل ہے اور 1987ء میں اس کو شعبے سے شائع کیا گیا ہے۔

شعبہ اردو بمبئی یونی ورسٹی کے ''اردو نامہ'' پروگرام کے تحت شائع ہونے والی ایک اور کتاب ''اولوکتا'' ہے دراصل اولوکتا مشہور مراٹھی ناول نگار پروفیسر پرشوتم شیورام ریگے کا مراٹھی ناولٹ ہے جس کو عبدالستار دلوی نے اردو میں ترجمہ کیا ہے یہ کتاب تقریباً 65 صفحات پر مشتمل ہے اور مارچ 1988ء میں پہلی بار منظر عام پر آ کر شہرت دوام حاصل کر چکی ہے۔

''اردو نامہ'' پروگرام کے ذریعے شائع ہونے والی اگلی کتاب ''تصحیح و تحقیق متن'' ہے جو پروفیسر نذیر احمد کے دیے گئے سلسلہ وار لکچرز کا مجموعہ ہے اور یہ لکچرز 22 تا 24 مارچ 1987ء کو شعبے میں دیے گئے تھے یہ مجموعے مارچ 1988 میں شائع ہوا تو متنی تنقید اور تصحیح متن کے دلدادہ حضرات نے اسے خوب پسند کیا۔

شعبہ اردو بمبئی یونی ورسٹی کے ''اردو نامہ'' پروگرام کی جانب سے شائع ہونے والی اگلی کتاب ''کرشن چندر شخص اور ادیب'' ہے۔ یہ کتاب اگست 1983ء میں شعبے میں منعقدہ قومی سمینار کے مقالات کا مجموعہ ہے جس کو صدر شعبہ اردو پروفیسر عبدالستار دلوی نے مرتب کیا ہے یہ مجموعہ 324 صفحات پر محیط ہے اور کرشن چندر ہر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

عبدالستار دلوی نے اپنے پندرہ سالہ دور صدارت میں سات مختلف کتابیں ''اردو نامہ'' پروگرام کے تحت شعبے سے شائع کیں ہیں جو مختلف موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ یہ کتابیں شائع ہو کر کافی مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔

عبدالستار دلوی بانی صدر شعبہ اردو کرشن چندر پروفیسر تقریباً پندرہ سال رہے ان پندرہ سالوں میں آپ نے پانچ پی ایچ ڈی اسکالروں اور دو ایم فل اسکالروں کی رہنمائی کی۔ شعبے میں متعدد لکچرز و سمیناروں کا بھی انعقاد عمل میں لایا اور سات کتابوں کو اشاعتی پروگرام کے تحت شائع بھی کیا۔ شعبہ اردو بمبئی یونی ورسٹی میں آپ کی مجموعی

علمی خدمات کے تعلق سے ڈاکٹر فصیح احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''دلوی صاحب کی غیر معمولی اور شبانہ روز ریاضت نے بمبئی یونی ورسٹی میں شعبہ اردو کو دوسرے شعبہ جات کے جھرمٹ میں ایک قابل تعریف مقام دلایا ہے۔ اوراس کوشش کی بنا پر یہ نوزائیدہ شعبہ، ہندوستان کی دوسری سربرآوردہ مقتدر اور قدیم یونی ورسٹیوں میں پروقار رسوخ کا مالک ہے۔اس رسوخ کی شناخت بھی میرا دوست میرا چھوٹا بھائی عبدالستار دلوی ہے''۔

(ماہنامہ ''کتاب نما'' دہلی، پروفیسر عبدالستار دلوی نمبر، مضمون: میرا دوست میرا چھوٹا بھائی، فروری 2006ء، ص۔22)

عبدالستار دلوی کی شخصیت میں خدمت اردو کا جذبہ اور انتظامی صلاحیتیں دونوں موجود ہیں ان دونوں خصوصیات کے اشتراک کا نتیجہ ہے کہ آپ نے نہ صرف سو سالہ قدیم یونی ورسٹی میں شعبہ اردو قائم کیا بلکہ اس کا دوسرے شعبہ جات پر اثر و رسوخ بھی بنایا، اس بات کی تصدیق ڈاکٹر فصیح احمد صدیقی کے بیان سے بھی ہو جاتی ہے۔

3.1.4۔ بانی اردو سکشن، ڈپارٹمنٹ آف اسلامک لنگوئجس، عین شمس یونیورسٹی مصر:

انتظامی صلاحیتیں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ایک وہ جو خداداد ہوتیں ہیں اور دوسری وہ جو انسان اپنی خواہش سے محنت و مشقت کر کے سیکھتا ہے جن کو سالوں تک بروئے کار لا کر تجربہ حاصل کرتا ہے اور انسان کے تجربہ ہی کی بنیاد پر اس کی صلاحیتیوں کو مانا جاتا ہے۔

عبدالستار دلوی کی انتظامی صلاحیتیں اور تعلیمی قابلیت دونوں مل کر ان کی شخصیت کی تشکیل کرتے ہیں وہ بھی ایک ایسی شخصیت جس کی انتظامی صلاحیتیں خداداد ہیں خدا کی ودیعت کردہ ہیں اور تعلیمی قابلیت دانشوروں کی صحبت اور برسوں کی کڑی محنت سے حاصل کی گئی ہیں، ان دونوں کے امتزاج سے آپ کی جو شخصیت ابھرتی ہے وہ ایک ادارہ ساز کی ہے ادارہ سازی کا آپ تجربہ بھی رکھتے ہیں اور شوق بھی۔

عبدالستار دلوی کا ادارہ سازی کا تجربہ اور شوق ہی انہیں عین شمس یونی ورسٹی، مصر تک لے گیا، 1992ء میں جب آپ صدر شعبہ اُردو بمبئی یونی ورسٹی تھے تب عین شمس یونی ورسٹی کے انتظامیہ نے یونی ورسٹی گرانٹ کمیشن (UGC) کے توسط سے آپ سے ربط پیدا کیا اور ایم اے اردو اور ایم فل کورسس کے لیے نصاب تیار کرنے کی خواہش ظاہر کی تب آپ نے نصاب تیار کر کے دے دیا مگر آپ کو اندازہ ہو گیا کہ عین شمس یونی ورسٹی اردو ذریعے سے اعلیٰ تعلیمی کورسس جیسے ایم اے اور ایم فل شروع کرنے جارہی ہے اور اس واقعے کے تقریباً دو سال بعد 1994ء میں آپ کو UGC سے فون کال آیا کہ مصری حکومت تہذیبی وثقافتی تبادلے Cultural Exchange کے تحت عین شمس یونی ورسٹی کے ڈپارٹمنٹ آف اسلامک لنگویجس میں اردو سکشن کے قیام کے لیے آپ کی خدمت حاصل کرنا چاہتی ہے تو آپ نے اس دعوت نامے کو قابل فخر اور اعزاز محسوس کیا اور اپنی خدمت دینے کا اعتراف بھی کر لیا، اردو کے مشہور محقق ومدوین پروفیسر رشید حسن خان جو آپ کو اپنا مخلص جانتے تھے وہ اپنے ایک خط مورخہ 18 اگست 1994ء میں آپ کے اس انتخاب کے لیے مبارک باد دیتے ہوئے یقینِ کامل جتاتے ہیں کہ اس کام کو آپ سے بہتر کوئی اور انجام نہیں دے سکتا:

> ''مصر جانا مبارک ہو۔ اس کا مجھے یقین ہی نہیں یقین کامل ہے کہ آپ کی بے مثال تنظیمی صلاحیتیں وہاں بھی اپنے جوہر دکھائیں گی اور اردو کا شعبہ خصوصی امتیاز کے ساتھ قائم ہوگا۔ جس نے بھی انتخاب کیا، صحیح تر انتخاب کیا۔ مجھے بے حد مسرت ہوئی اس اطلاع سے میرے بس میں ہوتا تو وہاں آ کر مبارک باد دیتا۔''

(ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینا (مرتب)، رشید حسن خان کے خطوط، جلد دوم، ص۔ 479)

لیکن اس وقت ہندوستان میں طاعون (Plague) پھیلا ہوا تھا، Plague سے متاثرہ ریاستوں میں مہاراشٹر، گجرات، کرناٹک، اتر پردیش، مدھیہ پردیش اور نئی دہلی کے کچھ علاقے شامل تھے اور اس کی مدت

26 اگست سے 18 اکتوبر 1994 رہی، Plague کی وجہ سے ہندوستان سے باہر جانے والی ساری فلائٹس (Flights) منسوخ کردی گئی تھیں جس کے نتیجہ میں آپ ایک ماہ کی تاخیر سے مصر پہنچے۔لیکن مصری حکومت نے آپ کو شاندار استقبالیہ دیا، اس کے بعد آپ مصر میں ہندوستان کے سفارت خانہ Indian Ambassy گئے وہاں ہندوستانی سفیر اروندھتی رائے سے ملے تب اروندھتی رائے نے آپ سے جو پہلا جملہ کہا وہ یہ تھا کہ ''میں ہندوستان کی سیاسی سفیر ہوں اور آپ ہندوستان کے تہذیبی سفیر ہیں۔'' بقول عبدالستار دلوی اروندھتی رائے ایک فراخ دل خاتون تھیں، اروندھتی رائے سے ملاقات کے بعد آپ قاہرہ میں عباسیہ علاقے میں موجود عین شمس یونی ورسٹی کیمپس پہنچے جہاں آپ کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا جس کے بعد آپ نے کیمپس میں ڈپارٹمنٹ آف اسلامک لنگوئجس کا دورہ کیا، اس ڈپارٹمنٹ میں عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کے سکشنس پہلے ہی سے موجود تھے اب آپ نے اپنی نگرانی میں یہاں اردو زبان وادب کا سکشن قائم کیا اور پہلے سال سے ایم اے اردو کورسس کا اعلان کیا تو وہ طلبہ وطالبات جو آپ کے ایک ماہ تاخیر سے مصر پہنچنے کی وجہ سے فارسی ایم اے میں داخلہ لے چکے تھے مگر جب انہیں پتہ چلا کہ ہندوستان سے پروفیسر عبدالستار دلوی آئیں ہیں اور اردو ایم اے کورسس شروع ہو رہا ہے تو باون (52) طلبہ وطالبات فارسی ایم اے کورس چھوڑ کر اردو ایم اے کورس میں آ گئے، اب مشکل یہ تھی آپ عربی نہیں جانتے تھے اس سے ترسیل (Communication) میں دشواریاں تھیں مگر عربی اور اسلامک کلچر کالج میں آپ کے مضامین تھے تو ان کی مدد سے آپ نے اپنا ایک مخصوص تدریسی طریقے کار (Teaching Style) بنالیا تھا، جس سے آپ طلبہ کو درس وتدریس دیا کرتے تھے اور طلبہ وطالبات بھی اس نئی زبان کو سیکھنے میں بہت ذوق شوق اور محنت کا مظاہرہ کرتے تو ان کی محنت دیکھ کر آپ کو بھی حوصلہ ملتا، جب ایم اے اردو کورسس مکمل ہوا تو یہ ہی طلبہ ایم فل میں پہنچ گئے لہٰذا عین شمس یونی ورسٹی کے ڈپارٹمنٹ آف اسلامک لنگوئجس میں اردو سکشن قائم کرنے کے علاوہ آپ نے یہاں ایک اردو لائبریری کی بھی تاسیس کی جس میں ہندوستان سے حاصل کرکر کے آپ نے پندرہ سو (1500) کتابیں جمع کرلی تھیں، یہ ایک غیر معمولی بات ہے۔عین شمس یونی ورسٹی میں آپ کی مجموعی

علمی خدمات سے متعلق محافظ حیدر فرماتے ہیں:

''اداروں کے قیام کے سلسلے میں ایک اور طرہ جوان کی دستار فضیلت میں جلوہ افروز ہے وہ ہے مصر کی عین شمس یونی ورسٹی میں شعبہ اردو کا قیام اور ایک اردو لائبریری کی تاسیس۔ عین شمس یونی ورسٹی کی ضرورت پوری کرنے کے لیے حکومت ہند نے پروفیسر دلوی کی سفارش کی اور انہوں نے وہاں قیام کر کے وہ کارنامہ انجام دیا جس سے مصر کے علمی حلقوں میں بھی ان کا نام نا قابل فراموش رہے گا۔''

(ماہنامہ 'کتاب نما' دہلی، پروفیسر عبدالستار دلوی نمبر، مضمون 'اردو کا خاموش خادم' فروری، 2006ء، ص۔19)

عبدالستار دلوی نے تقریباً دو سال عین شمس یونی ورسٹی کیمپس میں گزارے اور اپنی علمی و ادبی خدمات سے ڈپارٹمنٹ آف اسلامک لنگوئجس میں اردو سکشن اور اردو لائبریری کا قیام عمل میں لایا اور آپ نے اپنی ادارے ساز شخصیت سے جتنے بھی ادارے قائم کیے ہیں ان سب میں سے یہ ایک ادارہ غیر ملکی ہے۔

3.1.5۔ بانی ڈائرکٹر حضرت مخدوم علی مہائمی میموریل اور ینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور لائبریری

تقسیم سے پہلے ہندوستان میں کثیر تعداد میں صوفی بزرگوں کے مزار درگاہوں کی شکل میں ملتے تھے، تقسیم ملک کے بعد اب بھی یہ درگاہیں بڑی تعداد میں ہندوستان میں موجود ہیں، ان درگاہوں پر نگرانی مخصوص خاندان کے لوگ کرتے ہیں مگر کوئی یہ نہیں سوچتا کہ ان صوفی بزرگوں کی تعلیمات کیا تھیں وہ دنیا کو کون سا پیغام دینا چاہتے تھے اور ان کی تصانیف کون کون سی ہیں لیکن ان درگاہوں پر جا کر غیر مذہبی رسومات ادا کرنا، بڑے اہتمام سے صندل اور عرس منانا ضروری تصور کیا جاتا ہے اور ان سب میں نت نئی رسومات کا اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے۔

حضرت مخدوم علی مہائمیؒ چودھویں صدی کے بزرگ گزرے ہیں۔آپ وحدت الوجود کے پیروکار تھے اوراسی کی تعلیم بھی دیتے تھے۔آپ اسپین کے مشہور صوفی بزرگ حضرت محی الدین ابن عربیؒ سے ذہنی رشتہ رکھتے تھے اورآپ سے مستفیض ہونے والوں میں مذہب کا کوئی امتیاز نہیں تھا، جہاں آپ نے اپنی کئی تصانیف یادگار چھوڑیں ہیں وہی آپ کو ہندوستان کے پہلے مفسر قرآن ہونے کا شرف حاصل ہے،آج بھی آپ کا مزار ممبئی کے مہائم علاقے میں موجود ہےاور چھ سو برس کے طویل عرصے میں کئی مرتبہ اس مزار کی تعمیر وتزئین ہوچکی ہےاوراس مشہور درگاہ کا ٹرسٹ انگریزی حکومت کے دور میں 1900 میں قائم ہوااوراس سےقبل نورنگے خاندان اس درگاہ کی نگرانی کرتا تھا۔ٹرسٹ کے قائم ہونے کے بعداس کے تین ٹرسٹی بنائے گئےجن کے نام یہ ہیں:

1۔ نواب زادہ نصراللہ خان

2۔ سردارسید علی خان

3۔ محمد حسن مقبہ

ملک کی آزادی کے بعد 17اپریل 1952ءکواسٹنٹ چیریٹی کمشنر بمبئی کے یہاں اس ٹرسٹ کو دوبارہ رجسٹرڈ کیا گیا کیوں کہ اس کا مقصد درگاہ میں مفت مذہبی تعلیم دینا تھا۔اس بار بھی اس کے تین ٹرسٹی بنائے گئے جو اس طرح ہیں:

1۔ مولوی محمد یوسف ہیندادے

2۔ ڈاکٹر سید عبدالقادرالعیدوس

3۔ حاجی محمود باولا

اسی طرح ایک بعد دیگر ٹرسٹیاں منتخب ہوتے رہےاورٹرسٹ کوآگے بڑھاتے رہے۔یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا ہے۔

عبدالستار دلوی کو ہمیشہ محسوس ہوتا رہا کہ حضرت مخدوم علی مہائمیؒ پر تحقیقی کام ہونا چاہیے مگران کواس بات کا بھی

شدید احساس تھا کہ وہ خود اس کام کو سرانجام نہیں دے سکتے کیوں کہ وہ عربی، فارسی، فقہ اور قرآن و حدیث کے اسکالر نہیں ہیں اسی لیے وہ ہر وقت اس کام کے لیے دمناسب محقق کی تلاش میں رہتے تھے جس کے چلتے آپ نے کئی مولانا اصحاب سے اس کام کو کرنے کی خواہش ظاہر کی مگر سب نے اس کام کو دشوار کن بتاتے ہوئے دامن بچالیا۔مگر غالباً 1973ء میں آپ کی ملاقات مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی سے ہوئی جو احمد سیلر اسکول میں ٹیچر تھے اور جب آپ نے مولانا پرواز اصلاحی سے اس کام کو کرنے کی خواہش ظاہر کی تو وہ تیار ہو گئے مگر چوں کہ وہ اسکول ٹیچر تھے اسی لیے اس کام پر ہونے والے اخراجات کو برداشت کرنے سے قاصر تھے اسی لیے آپ نے اپنے ایک دوست ڈاکٹر کریم الدین نائک سے مالی تعاون لیا جس کے بعد مولانا پرواز اصلاحی نے مختلف مقامات کا دورہ کر کے بڑی محنت سے ''حضرت مخدوم علی مہائمی احوال و آثار'' کتاب لکھی اور اس کے مسودے کو آپ کے سپرد کر دیا تب آپ نے ڈاکٹر کریم الدین نائک کے مالی تعاون سے اس مسودے کو طباعت سے آراستہ کیا جو 1976ء میں منظر عام پر آئی۔

حضرت مخدوم علی مہائمی چیریٹیبل ٹرسٹ کے ذمہ داران نے محسوس کیا کہ حضرت کی تصانیف اور حضرت کے ہم عصروں کے تعلیمات کو عام کرنے کے لیے ایک تحقیقی مرکز کا قیام ہونا چاہیے اس سلسلے میں وہ بمبئی شہر کی مختلف ذی علم شخصیات سے ربط میں رہے مگر ان کی نظریں عبدالستار دلوی پر آ کر ٹک گئیں کیوں کہ آپ نے اس ٹرسٹ سے کوئی تعلق نہ ہوتے ہوئے بھی حضرت کے احوال و آثار پر کتاب لکھنے کے لیے مولانا پرواز اصلاحی کو تحریک دی تھی اور اس کے ساتھ آپ کی ادارہ ساز شخصیت کا بھی بڑا دخل رہا۔لہٰذا 2006ء میں آپ نے اپنی ڈائرکٹر شپ میں حضرت مخدوم علی مہائمی میموریل اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور لائبریری قائم کی اور سب سے پہلے آپ نے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے حضرت مخدوم علی مہائمیؒ پر لکھے گئے تین نایاب مضامین کو دستیاب کر کے 2007ء میں کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے جس کا پیش لفظ ٹرسٹ کے چیرمین ایڈوکیٹ عبدالصمد خطیب نے لکھا ہے، اس کتاب کی ضخامت صرف 94 صفحات ہیں، مگر اس کی اہمیت کہیں زیادہ ہے۔

عبدالستار دلوی نے بہ حیثیت ڈائرکٹر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے حضرت کی ''تفسیرِ رحمانی'' کو دوبارہ شائع کرنے کا منصوبہ بنایا۔اسی کے ساتھ ساتھ اپنی ذاتی ملکیت میں موجود حضرت کی کتاب ''اجلۃ التائید'' کا مخطوطہ بھی ایڈٹ کر کے شائع کروانے کے لیے دیا لیکن ٹرسٹ کے ذمہ داران نے اسے کھو دیا، علاوہ ازیں آپ نے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں حضرت پر سالانہ لکچرز وغیرہ کا بھی پروگرام بنایا تھا مگر اس پر عمل نہ ہو سکا۔

عبدالستار دلوی نے اپنی ڈائرکٹر شپ میں ٹرسٹ میں ایک لائبریری کی بھی تاسیس کی ہے جس میں ایک سال کی قلیل مدت میں آپ نے اسلامیات، تصوف، تاریخ اور دیگر مضامین پر مشتمل چھ ہزار کتابیں بطور عطیہ جمع کی ہیں یہ کتابیں ذی علم حضرات نے آپ کی وساطت سے لائبریری کو عطیہ دی ہیں۔

2008ء میں ٹرسٹ کے چیرمین ایڈوکیٹ عبدالصمد خطیب کے انتقال کے بعد ٹرسٹ کے ٹرسٹیان نے کہہ دیا کہ اب ہمیں ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور لائبریری نہیں چلانی ہے تو آپ نے بھی اپنی ڈائرکٹر شپ سے استعفیٰ دے دیا جس کے بعد سے اب تک نہ تو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے کوئی کتاب شائع ہوئی ہے اور نہ ہی لائبریری میں موجود کتابوں میں کوئی اضافہ ہوا ہے مگر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور لائبریری کا پروپگنڈہ اب بھی جاری ہے۔

عبدالستار دلوی کی شخصیت ادارہ ساز ہے اور آپ نے اپنی اس شخصیت سے متعدد ادارے قائم کیے ہیں، مگر حضرت مخدوم علی مہائمی میموریل اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور لائبریری کا قیام آپ کے لیے کسی چیلنج سے کم نہیں تھا کیوں کہ اب تک آپ نے جو ادارہ سازی کی تھی وہ ادبی نوعیت کی تھی اور یہ ایک مخصوص ادارہ درگاہ ٹرسٹ تھا جہاں ادبی قابلیت دکھانے کی کوئی جگہ نہیں تھی لیکن عربی اور اسلامک کلچر سے آپ کا Back Ground اور تاریخ دانی سے آپ کی دلچسپی نے آپ کو اس چیلنج کو پورا کرنے میں بھر پور تعاون دیا۔

عبدالستار دلوی نے اپنے کثرت علم اور انتظامی صلاحیتوں سے مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر اور لائبریری، مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی، شعبہ اردو بمبئی یونی ورسٹی، عین شمس یونی ورسٹی کے ڈپارٹمنٹ آف اسلامک لنگوئجس کا اردو سکشن اور حضرت مخدوم علی مہائمی میموریل اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور لائبریری جیسے مہتم

بالشان اداروں کی ادارہ سازی کی ہے۔اوران اداروں میں سے صرف عین شمس یونی ورسٹی کا اردو سکشن ایک بیرون ملک میں قائم کیا گیا ادارہ ہےاس کے علاوہ باقی سب ادارے اندرون ملک بالخصوص شہر ممبئی میں قائم کردہ ادارے ہیں اور یہ ادارے آج بھی رواں دواں ہیں۔

3.2۔ دیگر علمی خدمات

اگر کسی کی شخصیت ذی علم ہوتو وہ کسی کالج یا یونی ورسٹی کا استاد بن سکتا ہے،لیکن اگر کسی کے پاس علم کے ساتھ ساتھ منظم کی بھی صلاحیت موجود ہوتو وہ درس وتدریس کے ساتھ ساتھ مختلف اداروں اور انجمنوں سے منسلک ہوکر علمی خدمات بھی انجام دے سکتا ہے جیسے کسی مخصوص ادارے کا رکن کسی انجمن کا ڈائرکٹر یا پھر کسی یونی ورسٹی کے طلبہ وطالبات کے لیے مہمان استاد وغیرہ وغیرہ۔

عبدالستار دلوی کی شخصیت متنوع ہے۔وہ جہاں بہ حیثیت استاد مختلف اردو شعبوں سے وابستہ ہیں وہیں پر بہ حیثیت ادارہ ساز مختلف اداروں کی ادارہ سازی بھی انجام دے چکے ہیں اس کے علاوہ بھی انہوں نے مختلف اداروں وانجمنوں سے منسلک ہوکر علم وادب کی بے لوث خدمت کی ہے اور ابھی بھی اسی کام میں منہمک ہیں۔

3.2.1۔ ڈائرکٹر دکن مسلم ایجوکیشن اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، پونے

دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ، پونے پہلی مرتبہ 30 اکتوبر 1915ء کو 1860ء کے چیریٹی کمیشن ایکٹ کے تحت رجسٹرڈ ہوا اور آزادی کے بعد دوسری مرتبہ 1950ء کے بمبئی پبلک ٹرسٹ ایکٹ کے تحت رجسٹرڈ ہوا اور انسٹی ٹیوٹ نے 30 اکتوبر 2015ء کو اپنے سو سال مکمل کر لیے ہیں۔

دکن مسلم ایجوکیشن میں ایک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا قیام عمل میں لایا گیا تو 2001ء میں عبدالستار دلوی اس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر منتخب ہوئے اور 2005ء تک اسی عہدے پر فائز رہے اس درمیانی عرصے میں آپ نے بہ حیثیت ڈائرکٹر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں مختلف علمی وادبی سرگرمیاں انجام دیں جیسے لکچرز، سمینارس،

سمپوزیمس اور متعدد تحقیقی کام وغیرہ وغیرہ۔

3.2.1.1۔سمینار و کانفرنس

عبدالستار دلوی نے بہ حیثیت ڈائرکٹر دکن مسلم ایجوکیشن اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (2005-2001) میں تقریباً سات اجتماعات، سمینارس و کانفرنس کی شکل میں کیے۔

عبدالستار دلوی کی ڈائرکٹر شپ میں منعقد ہونے والا پہلا اجتماع سہ روزہ قومی سمینار ہے جس کا موضوع ''جنوبی ہند میں اردو زبان و ادب کی تدریس کے مسائل'' ہے، یہ سمینار دکن مسلم ایجوکیشن اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پونے اور اردو ٹیچنگ اور ریسرچ سینٹر لکھنؤ کے باہمی اشتراک سے 26 تا 28 ستمبر 2002ء کو منعقد ہوا۔ یہ سمینار اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک نئے طرز کا سمینار تھا جس کی وجہ سے یہ بے حد کامیاب رہا۔

عبدالستار دلوی کی ڈائرکٹر شپ میں ہونے والا دوسرا اجتماع سہ روزہ قومی سمینار تھا جس کا موضوع یہ ہے ''Interaction between Persian Urdu and other Indian Languages'' دکن مسلم ایجوکیشن اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے یہ سمینار کلچر ہاؤس آف دی اسلامک ریپبلک آف ایران، ممبئی کے اشتراک سے 12 تا 14 دسمبر 2002ء کو منعقد کیا۔ اور یہ کامیابی سے بھی ہمکنار رہوا۔

عبدالستار دلوی کی سرپرستی میں ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں وجود میں آنے والا تیسرا اجتماع دوروزہ قومی سمینار بہ موضوع ''دکنی اردو زبان و ادب اور تہذیب'' ہے یہ سمینار بھی دوسرے سمینارس کی طرح کامیاب رہا۔

عبدالستار دلوی کی زیرنگرانی انسٹی ٹیوٹ کا چوتھا اجتماع ''اقبال'' سمینار تھا اس سمینار میں اقبال کے فکر وفن پر مقالات تو پڑھے ہی گئے اور ساتھ ساتھ اقبال کی غزلوں اور نظموں کو ترنم میں گایا بھی گیا جس کو سامعین و قارئین نے بہت پسند کیا۔

عبدالستار دلوی نے اپنی ڈائرکٹر شپ میں پانچواں اجتماع ایک روزہ قومی سمینار بہ موضوع ''پریم چند

شخصیت اور فکر موجودہ تناظر میں'' کیا جو پریم چند کے ''125 جنم دن کے موقع پر بہ روز جمع 8 اکٹوبر 2004 کو منعقد ہوا۔ یہ سمینار بھی انسٹی ٹیوٹ کے دوسرے سمینار کی طرح کامیاب رہا۔

عبدالستار دلوی کی ڈائرکٹر شپ میں ہونے والا چھٹا اجتماع سہ روزہ قومی کانفرنس کی شکل میں منعقد ہوا جس کا عنوان تھا۔ ''All India Persian Teachers Conference'' یہ کانفرنس ادبی حلقوں میں بے حد مقبول ہوئی۔ عبدالستار دلوی کی ڈائرکٹر شپ میں ہونے والے ان اجتماعات میں مہاراشٹر کے علمی و ادبی حلقوں کی خاص و عام ہستیاں شریک ہوتیں تھیں۔

3.2.1.2۔ تحقیقی کام

کسی بھی تحقیق مرکز (Research Institute) کے قیام کا مقصد اس میں تحقیقی کام کو انجام و فروغ دینا ہوتا ہے۔ اس کام کی ذمہ داری اس انسٹی ٹیوٹ کے سربراہ کی ہوتی ہے کہ وہ کس طرح اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتا ہے۔ چاہیے تو خود تحقیق کر سکتا ہے یا پھر اپنے ماتحتین سے تحقیق کروا سکتا ہے یہ دونوں ہی طریقے رائج نہیں۔

عبدالستار دلوی نے بہ حیثیت ڈائرکٹر پہلے طریقے کو ترجیح دی اور خود تحقیقی کام میں جٹ گئے۔ اور اس کا نتیجہ ''پونے اور ممبئی میں فارسی کے ممتاز محقق خان بہادر شیخ عبدالقادر سرفراز احوال و آثار'' کتاب کی شکل میں مئی 2003ء میں منظر عام پر آیا ہے، یہ کتاب تین حصوں میں پر مشتمل ہے اور اسکی ضخامت 125 صفحات ہیں۔ یہ کتاب خان بہادر شیخ عبدالقادر سرفراز پر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

عبدالستار دلوی نے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں 26 تا 28 ستمبر 2002 کو ایک سمینار بہ عنوان ''جنوبی ہند میں اردو زبان و ادب کی تدریس کے مسائل'' منعقد کیا تھا۔ اس سمینار میں پڑھے گئے سولہ (16) مقالات کو آپ نے اپنے بسیط و سیر حاصل پیش لفظ کے ساتھ 2004 میں انسٹی ٹیوٹ ہی سے شائع کیا۔ یہ دونوں ہی کتابیں موضوع کے اعتبار سے منفرد ہیں جن سے آپ کے ذوق ادب اور دور رس نگاہوں کا پتہ چلتا ہے۔

عبدالستار دلوی نے اپنی ڈائرکٹر شپ میں انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری کو بھی وسعت دی، اس کو Up to Date کیا ہے، انسٹی ٹیوٹ کو دارالمصنفین اعظم گڑھ اور انڈوعرب سوسائٹی کی جانب سے سینکڑوں کتابوں کا تحفہ آپ ہی کی وساطت سے ملا ہے اور آج کل یہ لائبریری، انعامدار پبلک لائبریری کے نام سے موسوم ہے۔

2001ء سے 2005ء کے درمیانی عرصے میں بہ حیثیت ڈائرکٹر آپ نے انسٹی ٹیوٹ میں متعدد سمینارس کا انعقاد کیا، تحقیقی کتابیں شائع کیں اور لائبریری کو وسعت بھی دی اور آپ کی ان بے لوث خدمات کی وجہ سے انسٹی ٹیوٹ کی تاریخ میں آپ کی ڈائرکٹر شپ کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

3.2.2۔ مہمان پروفیسر، شعبۂ اردو، یونی ورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد:

موجودہ دور میں یہ روایت عام ہو چکی ہے کہ کوئی ریٹائرڈ پروفیسر ہو یا ادیب وشاعر اس کو یونی ورسٹیوں میں مہمان پروفیسر Visiting Professer منتخب کیا جاتا ہے اور کم از کم چھ ماہ یا ایک سال کے لیے ان کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں تا کہ ان کے علم وادب اور تجربے سے نئی نسل کے طلبہ وطالبات فیض یاب ہو سکیں۔

عبدالستار دلوی 1997ء میں صدر شعبۂ اردو وکرشن چندر پروفیسر بمبئی یونی ورسٹی کے عہدے سے سبکدوش ہوئے تو مختلف ادارے اور انجمنوں نے آپ کی خدمات حاصل کیں ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی شعبہ اردو، یونی ورسٹی آف حیدرآباد بھی ہے۔ جس نے تعلیمی سال ademic Year میں (2006-2007) آپ کو اپنی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو میں مہمان پروفیسر کی حیثیت سے منتخب کیا اور اس کی معیاد چھ ماہ رہی۔

3.2.2.1۔ دوزبانیں، دوادب

2005ء کے اواخر میں پروفیسر گیان چند جین کی متنازع فیہ تصنیف ''ایک بھاشا۔ دولکھاوٹ' دوادب'' شائع ہوئی اور اس کتاب کے شائع ہونے کی خبر اردو والوں کو شمس الرحمٰن فاروقی کے تبصرے سے ہوئی، اس کے بعد دو ایک اور تبصرے اردو رسائل میں شائع ہوئے تو آپ کو اس کتاب کو پڑھنے کا اشتیاق پیدا ہوا اور جب کتاب ممبئی

میں دستیاب نہیں ہوئی تو آپ دلی پہنچ گئے وہاں ایجوکیشنل پبلی شنگ ہاؤس دہلی سے کتاب حاصل کی، اسی اثنا میں شعبہ اردو، ممبئی یونی ورسٹی نے اس کتاب پر ایک مکالمہ رکھا۔ جس میں آپ کے علاوہ پروفیسر اسلم مرزا و دیگر شامل تھے، مکالمے کے اختتام پر آپ نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ ''میں اس کتاب کے جواب میں ایک کتاب لکھوں گا'' اس مکالمے کی رپورٹ انگریزی روزنامے ٹائمس آف انڈیا Times of India نے شائع کر دی تو یہ خبر عام ہوگئی کہ پروفیسر عبدالستار دلوی، پروفیسر گیان چند جین کی کتاب ''ایک بھاشا: دولکھاوٹ۔ دوادب'' کے جواب میں ایک مدلل کتاب لکھیں گے اسی دوران آپ نے اپنے مہمان پروفیسر کے عہدے کا چارج لیا۔ یہاں آپ کے ذمہ کوئی کلاس نہیں تھی مگر آپ شعبے کے طلبہ و طالبات اور ریسرچ اسکالرس کے ساتھ ادبی موضوعات پر صحت مند بحث و مباحث کرتے۔

آپ نے جولائی تا اکٹوبر 2006ء کے درمیانی تین ماہ کے عرصے میں ''دو زبانیں، دو ادب'' کتاب لکھی اور آپ چاہتے تھے کہ یہ کتاب پروفیسر جین کی زندگی میں شائع ہوجائے مگر ایسا ہو نہ سکا۔ ادھر کتاب شائع ہوئی ادھر پروفیسر جین کے انتقال کی خبر آئی۔ وہ اس کتاب کو پڑھ نہ سکے البتہ اردو والوں نے اس کتاب کو خوب سراہا کیوں کہ اس کتاب میں پروفیسر جین کی کتاب کے تمام اعتراضات کے جوابات مدلل انداز میں پیش کیے گئے ہیں، اس کتاب کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ کتاب کا اسلوب معترض ہوتے ہوئے بھی نرم اور شائستہ ہے، جو صرف اور صرف آپ ہی کا ہوسکتا ہے۔

3.2.2.2۔ پنڈت سیتو مادھوراؤ پگڑی، مورخ و ادیب:

پنڈت سیتو مادھوراؤ پگڑی (1910-1996) ایک مترجم، مورخ و ادیب اور ماہر لسانیات تھے، آپ نے اپنی پچاس سے زیادہ تصانیف یادگار چھوڑیں ہیں۔ جن میں سے کچھ کے نام یہ ہیں:

(1) چھتر پتی شیواجی

(2) شیواجی اور سوراجیہ

(3) اٹھارویں صدی کا دکن

(4) مراٹھا تاریخ کے مطالعے

(5) طہماس نامہ

(6) مراٹھا مغل تعلقات

(7) حیدرآباد میں تحریک آزادی

(8) مرٹھواڑے کا نثری ادب

(9) ہندی سوراج

(10) جنگ پانی پت اور مراٹھے اوراونگ زیب وغیرہ وغیرہ

آپ کولسانیات سے گہری دلچسپی تھی جس کے چلتے آپ نے اردو، فارسی، مراٹھی، کنڑ، ہندی، بنگال، تامل، تلگواور انگریزی وغیرہ زبانوں پر عبور حاصل کر چکے تھے اور جب آپ مرٹھواڑہ میں سرکاری ملازمت میں تھے تب آپ نے وہاں کی قبائلی زبانیں گونڈی اور کولامی بھی سیکھی، نہ صرف سیکھی بلکہ ان زبانوں کی قواعد بھی لکھی اس کے علاوہ آپ کو ترجمے سے بھی شغف تھا جس کے تحت آپ نے اردو سے مراٹھی، مراٹھی سے اردو اور اردو سے انگریزی میں بھی تراجم کیے ہیں، جہاں آپ نے طہماس نامہ کو انگریزی میں ترجمہ کیا۔ وہیں فردوسی کے شاہ نامہ کے چار ہزار اشعار کو مراٹھی میں ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ دیوان غالبؔ اور اقبالؔ کی بانگ درا کو مراٹھی نثر میں تبدیل کیا ہے، پنڈت سیتو مادھوراؤ پگڑی کی شخصیت مختلف الجہات شخصیت تھی جس سے ہم سب کو واقف ہونا ضروری ہے۔

جب عبدالستار دلوی مہمان پروفیسر کے عہدے پر تھے تب اسکول آف ہیومانیٹزم کے ڈین انگریزی پروفیسر، پروفیسر سدھارکر مراٹھے تھے۔ آپ اکثر ڈین آفس جاتے اور وہاں پروفیسر مراٹھے سے مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال کیا کرتے تھے اسی دوران ایک روز بات سے بات نکلی اور پنڈت سیتو مادھوراؤ پگڑی کا ذکر ہوا تو آپ

نے پروفیسر مراٹھے کے سامنے تجویز رکھی کہ شعبہ اردو میں پنڈت ستیو مادھوراؤ پگڑی پر سمینار ہونا چاہیے تا کہ اردو والے ان کی خدمات سے متعارف ہوسکیں تو پروفیسر مراٹھے نے جواب میں کہا'' آپ ایک مختصر سی درخواست دیجیے۔'' درخواست دیتے ہی منظور ہوگئی اور گرانٹ منظور ہونے کے اندرون ایک ماہ میں ''پنڈت ستیو مادھوراؤ پگڑی' مورخ و ادیب'' سمینار منعقد ہوا، بقول عبدالستار دلوی اس میں آپ کی مدد کرنے والے صرف اور صرف پروفیسر مظفر علی شہ میری تھے یہاں سب سے پہلے مقالہ نگار اوران کے موضوعات کا انتخاب ہوا، مقالہ نگاروں میں داؤد دلوی، ڈی پی جوشی، ڈاکٹر داؤد اشرف، ڈاکٹر رام پنڈت، ڈاکٹر فاطمہ بیگم، لکشمی سالوی، محمد حسین پرکار، وقار قادری، پروفیسر احمد انصاری، یعقوب راہی، منیشاء یشوردھن اور پگڑی صاحب کے بھائی راگھویندر پگڑی شامل تھے۔ مقالہ نگاروں نے پگڑی صاحب کو الگ الگ حیثیتوں سے پیش کیا اور جب Linguistics Department کے پروفیسر اوما مہشور راؤ کو معلوم ہوا کہ شعبہ اردو پگڑی صاحب پر سمینار کا انعقاد کر رہا ہے تو وہ شعبہ اردو میں آپ سے ملنے آئے اور کہا کہ'' پگڑی صاحب ایک ماہر لسانیات ہیں اور آج تک کبھی لسانیات والوں نے ان پر سمینار کرنے کے بارے میں نہیں سوچا۔ لیکن شعبہ اردو اور اردو والے ان کی خدمات کے اعتراف میں ان پر سمینار کر رہے ہیں یہ ایک غیر معمولی بات ہے۔ 'میں' بھی اس سمینار میں مقالہ پڑھوں گا۔'' اس وقت کے صدر شعبہ اردو پروفیسر محمد انور الدین کی زیر سرپرستی یہ سمینار 7 تا 9 نومبر 2006 کو منعقد ہوا تو استقبالیہ کلیمات صدر شعبہ اردو نے پیش کیے اور کلیدی خطبہ عبدالستار دلوی نے دیا، اس کے بعد تین دن مقالات کا سلسلہ جاری رہا۔ سمینار میں شعبے کے طلبہ و طالبات، ریسرچ اسکالرس، اساتذہ، شہر حیدرآباد کا پورا ادبی حلقہ اور صدر حیدرآباد مراٹھی سوسائٹی ڈی پی جوشی D.P.Joshi اور ان کی اہلیہ و مراٹھی پروفیسر اوشا تائی و دیگر حضرات شرکاء میں شریک تھے ، اور سمینار کی کامیابی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ دوران سمینار آڈوٹوریم میں نشستوں کی کمی محسوس کی گئی، اس کامیاب سمینار کے منتظم کی حیثیت سے عبدالستار دلوی لائق تحسین ہیں۔ اس سمینار کے تعلق سے پروفیسر محمد انور الدین اپنے استقبالیہ کلمات میں کہتے ہیں:

''ہمارے شعبے نے تا حال 36 سمینار وسمپوزیم اور 126 توسیعی خطبات کا انعقاد عمل میں لایا ہے۔ آج یہ سمینار بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔لیکن یہ گزشتہ تمام سمیناروں سے کچھ ہٹ کے ہے۔ یہ UPE اسکیم کے تحت شعبہ اردو میں منعقد ہونے والا پہلا سمینار ہے۔ اپنے موضوع اور مباحث کے اعتبار سے بھی یہ سمینار ہمارے سابقہ سمیناروں سے مختلف ہے۔''

(''پنڈت ستیو مادھوراؤ پگڑی،مورخ وادیب''،ص:13)

پروفیسر محمد انورالدین اپنے استقبالیہ خطبے میں آگے اس سمینار کے منتظم پروفیسر عبدالستار دلوی کے متعلق فرماتے ہیں:

''اس سمینار کی ترتیب وانعقاد میں اردو اور مراٹھی کے مشہور محقق اور عالم پروفیسر عبدالستار دلوی کی خدمات کا اعتراف ضروری ہے۔انھیں کی تگ ودو اور دلچسپی اور رہنمائی میں ہم نے یہ سمینار منعقد کیا ہے۔''

(''پنڈت ستیو مادھوراؤ پگڑی،مورخ وادیب''،ص:16-15)

عبدالستار دلوی نے ''پنڈت ستیو مادھوراؤ پگڑی:مورخ وادیب'' سمینار کے انعقاد میں اپنی تمام انتظامی صلاحیتوں اور علمی وادبی سوجھ بوجھ سے کام لیا ہے جس کی وجہ سے یہ سمینار بھی آپ کے منعقدہ تمام تر سمیناروں کی طرح بے حد کامیاب رہا۔

7 تا 9 نومبر 2006ء کو سمینار منعقد ہوا۔30 نومبر 2006ء کو ڈین پروفیسر مراٹھے وظیفے پر سبکدوش ہوئے، جنوری 2007ء میں پروفیسر محمد انورالدین نے اپنی صدارتی معیاد مکمل کر لی تو ایک سال Sabatic Leave لے لی، اب صدر شعبہ کا عہدہ پروفیسر محمد بیگ احساس نے سنبھال لیا، ادھر دوسری طرف ڈائرکٹر U P E پروفیسر رتن لال ہنگلو نے سمینار کے مقالات کو شائع کرنے کے لیے گرانٹ منظور کر دی تو

3 فروری 2007ء میں کتاب طباعت سے آراستہ ہوگئی۔

عبدالستار دلوی نے چھ ماہ کی معیاد شعبہ اردو یونی ورسٹی آف حیدرآباد میں گزاری۔ اس معیاد میں آپ نے پروفیسر گیان چند جین کی کتاب کا جواب ''دوزبانیں۔ دوادب'' کی شکل میں مدلل انداز میں لکھا اور ''پنڈت سیتو مادھوراؤ پگڑی'' مورخ و ادیب'' سیمنار کروایا، شعبہ اردو یونی ورسٹی آف حیدرآباد کی تاریخ میں آپ کی ان غیر معمولی خدمات کو ہمیشہ سراہا جائے گا۔

3.2.3۔ ڈائرکٹر، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی:

انجمن اسلام ممبئی کے مسلمانوں کے لیے قائم کیا گیا یہ ایک تعلیمی ادارہ ہے۔ جسے 1874ء میں جسٹس بدرالدین طیب جی اور محمد علی روگھے (دوم) نے قائم کیا ہے اور اس انجمن کا مقصد ممبئی کے مسلمانوں میں ثانوی تعلیم کو فروغ دینا ہے، انجمن اسلام کو ترقی دینے میں بدرالدین طیب جی اور محمد علی روگھے کے علاوہ منشی غلام محمد محی الدین دلوی، قمر الدین طیب جی اور عبداللہ دھرمی کے نام قابل ذکر ہیں، انجمن اسلام نے بعد کے زمانے میں بھی اپنے اسلاف کی کوششوں کو آگے بڑھانے کی سعی کی ہے جس کے چلتے انہوں نے لڑکوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کی تعلیم پر بھی توجہ دی ہے، انجمن اسلام کے تحت 20 سکنڈری اسکولس، 15 پرائمری اسکولس، 15 اپر پرائمری اسکول، 10 جونیر کالجس، 12 ڈگری کالجس، 4 پولی ٹکنیک کالجس، 10 دیگر انسٹی ٹیوشن، 2 ہاسٹلس، 2 سہارا یونٹس، 3 یتیم خانے اور 2-Proposed Institutions چلائے جاتے ہیں۔

1948ء میں انجمن اسلام نے انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے نام سے ایک ثقافتی و ادبی ادارے کی بنیاد ڈالی جس کی شہرت ملک و بیرون ممالک میں ہوئی اور اس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے قیام کا مقصد اردو زبان و ادب کی خدمت کرنا ہے، یہ واضح رہے کہ اس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے قیام میں سابق صدر انجمن اسلام سیف طیب جی، سابق پرنسپل اسماعیل یوسف کالج ڈاکٹر بذل الرحمٰن، پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی، پروفیسر محمد ابراہیم ڈار اور مشہور قانون داں آصف علی اصغر فیضی کی کوششیں شامل ہیں۔

پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی کے بانی ڈائرکٹر ہیں اور ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی اسٹنٹ ڈائرکٹر عبدالرزاق قریشی بھی انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ رہے ہیں اوراب انجمن کے صدر ڈاکٹر ظہیر قاضی ہیں اور ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر پروفیسر عبدالستار دلوی ہیں جو 2007ء سے تا حال اس عہدے پر فائز ہیں۔

3.2.3.1۔سہ ماہی ''نوائے ادب''

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے اغراض ومقاصد کچھ اس طرح ہیں:

1۔ ایم اے کی تعلیم کا انتظام۔

2۔ پی ایچ ڈی اور دوسرے تحقیقاتی کام کرنے والوں کی اعانت۔

3۔ تحقیقاتی کام کرنے والے اداروں اور جامعوں سے تعاون۔

4۔ ایک جامعہ کتب خانے کا قیام۔

5۔ مختلف کتب خانوں کے اردو کے مخطوطات کی فہرست وترتیب۔

6۔ نایاب مخطوطات ومطبوعات کی اشاعت۔

7۔ اردو سے متعلق ایک علمی وتحقیقاتی سہ ماہی رسالے کا اجراء۔

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے جملہ سات اغراض ومقاصد میں سے ایک اہم مقصد اردو کے ایک علمی وتحقیقی سہ ماہی رسالے کا اجراء ہے اور انسٹی ٹیوٹ نے اس سہ ماہی رسالے کو ''نوائے ادب'' کے نام سے تعبیر کیا ہے۔

رسالے ''نوائے ادب'' کی خصوصیات:

1۔ اردو زبان وادب سے متعلق مختلف پہلوؤں پر بحث وتحقیق۔

2۔ گجرات ودکن کی غیر مطبوعہ اردو تصانیف کی اشاعت۔

3۔ اردو سے متعلق تحقیقاتی کاموں کی اطلاع۔

4۔ اردو کے علمی وادبی رسائل کے مضامین کی تلخیص واشاعت۔

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے قیام کے ساتھ ہی سہ ماہی رسالے نوائے ادب کا اجراء عمل میں لایا گیا تو اس کے پہلے ایڈیٹر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے بانی ڈائرکٹر پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی تھے اور اب 2007ء سے اس کے ایڈیٹر وریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر پروفیسر عبدالستار دلوی ہیں۔ آپ ایڈیٹر کی حیثیت سے نوائے ادب کا اداریہ لکھتے ہیں اور اکثر وبیشتر اداریہ کا موضوع تحقیق ہوتا ہے جیسے تحقیق میں چوری اور موجود دور میں تحقیق وغیرہ وغیرہ، اس کے علاوہ آپ کے اداریہ عصر حاضر کے Burning Topics پر ہوتے ہیں اور نوائے ادب نے اردو زبان وادب کی نامور ہستیوں پر خصوصی نمبر بھی شائع کیے ہیں جیسے علامہ شبلی نعمانی نمبر، اقبال نمبر، سرسید نمبر اور علی سردار جعفری نمبر وغیرہ وغیرہ۔

غرض ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کی ایڈیٹر شپ میں سہ ماہی رسالے ''نوائے ادب'' کا معیار بلند ہے اور مستقبل روشن۔

3.2.3.1۔ پبلیکیشن

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے جملہ مقاصد میں سے ایک مقصد نایاب مخطوطات ومطبوعات کی اشاعت ہے اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے انجمن نے اپنا ایک پبلیکیشن بھی قائم کر رکھا ہے جس کے تحت آپ کی ڈائرکٹرشپ میں تقریباً سات کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جن کی فہرست اس طرح ہے:

1۔ ''اقبال اور بمبئی'' از پروفیسر عبدالستار دلوی

2۔ ''مقالات پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی'' مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی

3۔ ''مقالات پروفیسر محمد ابراہیم ڈار مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی

4۔ ''شاہ وجیہ الدین علوی گجراتیؒ: احوال و آثار'' از مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی، معہ پیش لفظ پروفیسر عبدالستار دلوی

5۔ ''مبادیات تحقیق'' از عبدالرزاق قریشی، مع مقدمہ، پروفیسر عبدالستار دلوی

6۔ سید عبدالستار گلشن آبادی اور قصیدۂ بردہ'' از سعیدہ اختر پٹیل معہ مقدمہ پروفیسر عبدالستار دلوی

7۔ ''ادبی ولسانی تحقیق و تقابلی ادب اصول وطریق کار'' از پروفیسر عبدالستار دلوی

یہ ساتوں کتابیں کم یاب و نایاب ہیں جس میں ترمیم و اضافے کر کے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے ان کو دوبارہ شائع کیا ہے۔

3.2.3.3۔ محققین کی رہنمائی

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے جملہ مقاصد میں سے دو مقاصد تحقیق سے متعلق ہیں، پہلا تو یہ کہ پی ایچ ڈی اور دوسرے تحقیقاتی کام کرنے والوں کی اعانت۔ اور دوسرا تحقیقاتی کام کرنے والے اداروں اور جامعوں سے تعاون، ن دونوں مقاصد کے پیش نظر انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کو رہنما بن کر محققین کی راہ نمائی کرنی پڑتی ہے۔

عبدالستار دلوی بہ حیثیت ڈائرکٹر ایک رہنما کا کردار بھی ادا کرتے ہیں جس کے پیش نظر آپ کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کے ریسرچ اسکالرس بھی تحقیق کرتے ہیں اور غیر سندی تحقیقی محققین بھی تحقیق کرتے ہیں دراصل آپ مختلف ادارے و انجمنوں سے وابستہ ہیں مگر بنیادی طور پر آپ ایک استاد و رہنما ہیں چونکہ آپ نے اپنے تدریسی کیریر کی شروعات ہی سے متعدد ریسرچ اسکالر کی رہنمائی کی ہے کیوں کہ فن تحقیق اور اس کے اصول وطریق

کار سے آپ کو گہری دلچسپی بھی ہے اس لحاظ سے محقق جیسا بھی ہو سندی تحقیق والا یا غیر سندی تحقیق والا آپ اس کی رہنمائی میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے جس کی وجہ سے آپ ایک معیاری رہنما ثابت ہو چکے ہیں۔

3.2.3.4۔ لکچرز و سمینارس

کوئی بھی ادبی ادارہ ہو اور اس میں لکچرز و سمینارس نہ ہوں یہ ممکن نہیں کیوں کہ ادب میں کسی کی خدمات کا اعتراف کرنا ہو یا کسی کی صدی منانی ہو یا پھر کسی ادیب و شاعر کو خراج عقیدت پیش کرنا ہو لکچر و سمینار اس کا بہترین ذریعہ ہوتے ہیں۔

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بھی ایک ادبی و ثقافتی ادارہ ہے جو اپنی دوسری سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ لکچرز و سمینارس کا انعقاد عمل میں لاتا ہے کچھ لکچرز کے تو نام بھی متعین ہیں اور وہ ہر سال دیے جاتے ہیں جیسے مصطفیٰ فقیہ میموریل لکچر، معین الدین حارث میموریل سیرت لکچر اور پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی میموریل لکچر، یہ تینوں لکچرز وقفے وقفے سے ہر سال منعقد کیے جاتے ہیں ان کے علاوہ تعلیمی و علمی موضوعات پر سمینارس کا بھی انعقاد ہوتا ہے جیسے اردو ذریعہ تعلیم اور بمبئی کے اردو اسکولوں کے اساتذہ وغیرہ وغیرہ۔

ان تمام کارکردگیوں کے علاوہ بھی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں لکچرز ہوتے رہتے ہیں مثال کے طور پر مولانا ابوالکلام آزاد کے یوم پیدائش پر خصوصی لکچر، اقبال کے یوم وفات پر اقبال پر بنی ادبی فلم کی نمائش جسے نامور شاعر فیض احمد فیض نے Direct کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں آئے دن کوئی نہ کوئی لکچر و سمینار ہوتے رہتے ہیں جس سے انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کے ادبی ذوق وشوق کا پتہ چلتا ہے۔

عبدالستار دلوی نے بہ حیثیت ڈائرکٹر دکن مسلم ایجوکیشن اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، پونے، مہمان پروفیسر شعبہ اردو یونی ورسٹی آف حیدر آباد اور ڈائرکٹر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی میں اپنی علمی خدمات انجام دیں ہیں اور امید ہے کہ مستقبل میں بھی دیتے رہیں گے، آپ نے اپنی بے لوث علمی خدمات کے ذریعہ ان اداروں کو جو استحکام بخشا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔

قدرت نے ہم سب کو الگ الگ خوبیوں سے نوازا ہے، کسی کو کچھ ملا ہے تو کسی کو کچھ اور، کوئی اعلیٰ تعلیم سے نوازا گیا ہے تو کوئی انتظامی صلاحیتیں پاکر ادارہ ساز بن گیا ہے، یا پھر کوئی اعلیٰ تعلیم اور منتظم کی صلاحیتیں دونوں کے متوازن انداز میں مل جانے کی وجہ سے اعلیٰ معیار کے ادارے کا منتظم بنا دیا گیا ہے مگر عبدالستار دلوی کے یہاں یہ سب خوبیاں یکجا ہو گئی ہیں، وہ ایک ذی علم شخصیت ہیں، انہوں نے متعدد اداروں کی ادارہ سازی کر کے خود کو بہترین ادارہ ساز ثابت کر دیا ہے اور پہلے سے رواں دواں اداروں و انجمنوں سے منسلک ہو کر اپنی اعلیٰ تعلیم اور انتظامی صلاحیتوں کی وجہ سے ایک عمدہ منتظم کہلائے جاتے ہیں۔

oOo

﴿باب چہارم﴾

عبدالستار دلوی کی ادبی خدمات

4۔ عبدالستاردلوی کی ادبی خدمات

4.1۔ عبدالستاردلوی: بہ حیثیت مرتب

4.1.1۔انتخاب کلام مصحفی

4.1.2۔انتخاب کلام چکبست

4.1.3۔من سمجھاون

4.1.4۔اردو میں لسانیاتی تحقیق

4.1.5۔رانی کیتکی کی کہانی

4.1.6۔امرت بانی

4.17۔گھر آنگن

4.1.8۔ادبی ولسانی تحقیق اصول وطریق کار

4.1.9۔دکنی اردو

4.1.10۔کرشن چندر، شخص اورادیب

4.1.11۔نوائے سروش

4.1.12۔علی سردار جعفری: شخص، شاعراورادیب

4.1.13۔جنوبی ہند میں اردو زبان وادب کی تدریس کے مسائل

4.1.14۔حضرت مخدوم علی مہائمی (تین مقالات)

4.1.15۔مقالات پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی

4.1.16۔مقالات پروفیسر محمد ابراہیم ڈار

4.1.17۔مبادیات تحقیق

4.1.18۔مولانا ابوالکلام آزاد: ایک مطالعہ

4.2۔ عبدالستار دلوی: بہ حیثیت محقق ونقاد

4.2.1۔نئی تحریریں

4.2.2۔پونے کے مسلمان

4.2.3۔پونے اور ممبئی میں فارسی کے ممتاز محقق، خان بہادر پروفیسر شیخ عبدالقادر سرفراز

(احوال وآثار)

4.2.4۔اقبالؔ کا ایک ممدوح عظیم سنسکرت شاعر اور مفکر ''بھرتری ہری''

(تحقیقی وتنقیدی مقدمے کے حوالے سے)

4.2.5۔اقبال اور بمبئی

4.2.6۔مہاتما گاندھی، اردو، اقبالؔ اور دوسرے مضامین

4.2.7۔متفرق تحقیقی وتنقیدی مضامین

4.3۔ عبدالستار دلوی: بہ حیثیت مترجم یا بہ حیثیت قومی یکجہتی سفیر

4.3.1۔ مراٹھی ناولوں کا اردو ترجمہ

4.3.1.1۔ ساوتری

4.3.1.2۔ رن آنگن

4.3.1.3۔ اولوکتا

4.3.2۔مراٹھی کہانیوں کے اردو تراجم

4.3.2.1۔ سات روپے دس آنے

4.3.2.2۔ انتہاء

4.3.3۔ مراٹھی شاعری کے اردو تراجم

4.3.3.1۔ بیرسٹر

4.3.3.2۔ خاموش! عدالت جاری ہے

4.3.4.3۔ مراٹھی شاعری کے اردو تراجم

4.3.4.1۔ پیائدان

4.3.4.2۔ تشنگی

4.3.4.3۔ ٹھہری نہیں یہ رات ذرا بھی

4.3.4.4۔ مراٹھی نظمیں

4.3.5۔ انگریزی سے اردو تراجم

4.3.5.1۔ اقبالؔ شاعر اور سیاست داں 1995

4.3.5.2۔ ذکر ایڈنبرا

4.3.5.3۔ اقبالؔ کا ایک ممدوح عظیم سنسکرت شاعر اور مفکر بھرتری ہری (نظموں کے تراجم کے حوالے سے)

4.3.5.4۔ انٹرویو

4.4۔ عبدالستار دلوی: بہ حیثیت شاعر

4.5۔ عبدالستار دلوی: بہ حیثیت مدیر یا بہ حیثیت ادبی صحافی

4.6۔ عبدالستار دلوی کے پڑھے گئے سمینارس، لکچرز و توسیعی خطبات

4.7۔ عبدالستار دلوی کے قلم زد پیش لفظ

4.8۔ عبدالستار دلوی: بہ حیثیت محرک یا تحریک کار

4۔ عبدالستار دلوی کی ادبی خدمات

کوئی بھی ادیب جب کسی تحریر کو وجود میں لاتا ہے تو وہ ادب کے تینوں شعبوں (تخلیق، تحقیق اور تنقید) میں سے کسی ایک سے متعلق ہوتی ہیں۔ جس کی وجہ سے ادب کے اس مخصوص شعبے میں نہ صرف اضافہ ہوتا ہے بلکہ ادب میں اس ادیب کی اہمیت بھی قائم ہو جاتی ہے۔ لیکن بعض ادیب ایسے بھی ہوتے ہیں جو اب کے ایک سے زائد شعبوں میں اپنے قلم کے جوہر دکھاتے ہیں۔ جس کی بنا پر ان کی شناخت بحیثیت محقق، بحیثیت ناقد اور بحیثیت تخلیق کار کے قائم ہوتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی ادیب میں بیک وقت عمدہ محقق، بہترین نقاد اور کامیاب تخلیق کار کی خوبیاں یکجا ہو سکتی ہیں؟ ہاں یہ ممکن ہے اگر اس ادیب کی شخصیت میں تحقیقی مادے کے ساتھ ساتھ محنت شاقہ کی بھی صلاحیت موجود ہو تو وہ عمدہ محقق بن سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں وسیع مطالعہ اور بالغ نظری ہو تو وہ بہترین نقادوں کی صف میں کھڑا ہو سکتا ہے۔ ان خصوصیات کی موجودگی میں اگر اس کی طبیعت میں تخلیق عنصر بھی ہو تو وہ کامیاب تخلیق کار کی شکل میں اپنے آپ کو پیش کر سکتا ہے اور اردو ادب میں ہمہ جہت ادیب و قلم کاروں کی کمی نہیں ہے۔ جنھوں نے ادب کے مختلف شعبوں کو بیک وقت میں مالا مال کیا ہے۔ اگر ہم ماضی اور حال کے ایسے ہی ادیب و قلم کاروں کی ایک فہرست مرتب کریں جنھوں نے ادب کے ایک سے زائد یا یوں کہیے تینوں شعبوں میں غیر معمولی کارنامے انجام دیے ہیں تو اس فہرست میں ایک نمایاں نام عبدالستار دلوی کا ہوگا جنھوں نے ادب کے تحقیقی شعبے میں تدوین متن کے تحت قدیم متون کو مرتب کر کے انھیں ادب میں محفوظ کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ادب کے تنقیدی شعبے میں اپنی بالغ نظری اور وسیع مطالعے کے ذریعے مختلف انواع موضوعات پر تحقیقی و تنقیدی تصانیف و مضامین سپرد قلم کیے ہیں جن کی حیثیت آج کی نئی نسل کے لیے حوالہ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے ادب کے تخلیقی شعبے میں بہ حیثیت شاعر کئی عمدہ نظموں کا اضافہ بھی کیا ہے۔ نیز آپ کے نثری و شعری تراجم میں بھی تخلیقی عنصر غالب نظر

آتا ہے۔ان تمام باتوں کو پیش نظر رکھ کر اب ہم عبدالستار دلوی کی ادبی خدمات کا جائزہ مختلف حیثیتوں سے لیں گے۔

عبدالستار دلوی کی جملہ تصانیف میں اکثریت مرتب کردہ کتب کی ہے جو آپ کو بہ حیثیت مرتب ادب میں ایک اعلیٰ مقام عطا کرتی ہیں۔آپ کی مرتب کردہ کتب میں نمائندہ شعرأ کے انتخابِ کلام اور مجموعوں پر تفصیلی مقدمے،قدیم متون پر مدلل،مقدمے اور قدیم محققین کے تحقیقی وتنقیدی مضامین کے مجموعوں پر پر مغز مقدمے شامل ہیں۔آپ کے قلم سے نکلے ہوئے ان مختلف انواع مقدمات کے فنی محاسن ومعیوب پر نظر ڈالنے سے پہلے آیئے فن مقدمہ نگاری کا مختلف جائزہ لے لیں۔

اردو ادب میں مقدمہ نگاری کی روایت بہت قدیم ہے۔مگر اس کو باقاعدہ صنف ادب کا درجہ حاصل نہیں۔اس کے باوجود اردو کی ہر اہم اور غیر اہم تصنیف پر خود مصنف کا یا پھر کسی دوسری اہم شخصیت کا لکھا ہوا مقدمہ یا دیباچہ ضرور اردو میں اس فن کے لیے مقدہ، دیباچہ، پیش لفظ،تمہید اور تعارف وغیرہ اصطلاحیں استعمال ہوتیں ہیں۔ جن میں سے مصنف خود اپنے عنوان کا انتخاب کرلیتا ہے۔ اسی طرح انگریزی میں Preface, Introduction اور Preamble وغیرہ اصطلاحیں مروج ہیں جن کو انگریزی ادیب اپنے مقدموں کی سرخیاں بناتے ہیں۔اگر ہم ہندی کتابوں پر لکھے گئے مقدموں کا مشاہدہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ہندی ادیب بھومیکا، پرستاؤنا اور آمکھ جیسی اصطلاحوں کو اپنے لیے منتخب کرتے ہیں۔اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مقدمہ نگاری کی روایت نہ صرف اردو ادب میں رائج ہے بلکہ اس کا رواج دوسری زبانوں کے ادبیات میں بھی عام ہے۔

کسی بھی کتاب کا مقدمہ اس کتاب کا آئینہ ہوتا ہے جس سے اس کا قاری مصنف کی سوچ وفکر اور غرض و عافیت سے واقف ہوسکتا ہے۔حبیب الرحمٰن خان شیروانی،مقدماتِ عبدالحق کے مقدمے میں ایک اچھے مقدمے کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

''اگر مقدمہ نگار مطالب کتاب میں ترقی پیدا کرسکے اور پڑھنے والوں کے لیے

مناسب موقع مزید معلومات بہم پہنچائے اس طرح کہ یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کتاب پڑھوا رہا ہے تو اس کو کمال مقدمہ نگاری ماننا چاہیے۔''

حبیب الرحمٰن خان شیروانی کی اس تعریف کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مقدمہ نگار مقدمے میں نہ صرف کتاب کے مطالب میں اضافہ کرسکتا ہے بلکہ قاری کو مزید معلومات دے کر اس کتاب سے متعلق جستجو کو بھی بڑھا سکتا ہے۔

بعض اردو ادیب تقریظ، مقدمہ، دیباچہ، پیش لفظ اور تعارف وغیرہ کو ہم معنی یا مترادف تسلیم کرتے ہیں، جو اپنی فکر و خیالات کی مناسبت سے ان میں سے کسی ایک عنوان کا انتخاب کر لیتے ہیں۔ ڈاکٹر آمنہ صدیقی بھی ان اصطلاحوں کو مترادفات تصور کرتے ہوئے کہتی ہیں:

''تقریظ، دیباچہ، پیش لفظ، مقدمہ یہ سب الفاظ بڑی حد تک مترادف ہیں۔ ممکن ہے از روئے لغت ان میں بہت فرق ہو۔ لیکن از روئے استعمال تو یہ ایک ہی سانچے ہیں جن میں پیش پا افتادہ باتوں، مصنف کی تعریف اور کتاب کی تعریف کو ڈھال کر کسی بھی کتاب کی ضخامت بڑھائی جا سکتی ہے۔''

(افکار عبدالحق، ص۔12)

ڈاکٹر آمنہ صدیقی ان تمام اصطلاحوں کو مترادفات تصور کرتی ہیں، جس کی وجہ بھی وہ پیش کر چکی ہیں۔ اس کے برخلاف پروفیسر آل احمد سرور ان تمام اصطلاحوں میں فرق کو واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''تبصروں، دیباچوں، مقدموں اور تعارفوں میں عام طور پر جو تنقید ملتی ہے اس میں تنقید کے علاحدہ علاحدہ رنگ ہیں۔ دراصل ان میں سے ہر ایک کا میدان الگ الگ ہے۔ دیباچہ یا تعارف کتاب صاحب کتاب کا تعارف ہوتا ہے۔ اس کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ اس کی قدر و قیمت متعین نہیں کرتا۔ متعین کرنے میں

مدد دیتا ہے۔ مقدمہ اس لیے ذرا آگے بڑھ جاتا ہے کہ وہ قدر و قیمت بھی متعین
کرتا ہے اور قول فیصل بھی پیش کر دیتا ہے۔''

(''تنقید کیا ہے''، ص۔193)

ڈاکٹر آمنہ صدیقی اور پروفیسر آل احمد سرور دونوں ادیبوں کی قیمتی آرا کو دیکھنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ یہ تمام اصطلاحیں مترادفات نہیں ہیں بلکہ ان میں نمایاں فرق ہے کیوں کہ ان اصطلاحوں کو مترادفات بتاتے ہوئے ڈاکٹر آمنہ صدیقی نے جو اظہار خیال کیا ہے وہ پروفیسر آل احمد سرور کی وضاحت کے سامنے کمزور محسوس ہوتا ہے۔

کوئی بھی مصنف یا مرتب خود مقدمہ لکھتا ہے یا پھر کسی علمی و ادبی شخصیت سے لکھواتا ہے تو ان میں اختصار اور بالخصوص رواداری سے کام لیا جاتا ہے جس کی وجہ سے یہ مقدمے تعارفی اور رسمی قسم کے ہو جاتے ہیں۔ ان میں تحقیق و تنقید کا فقدان نظر آتا ہے اور اس نوعیت کے مقدمے اپنا تاثر بھی قائم نہیں کر پاتے۔ اس کے برخلاف وہ مقدمے جو طریق تحقیق اور فن تنقید کے اصولوں کے تحت لکھے جاتے ہیں ان میں مقدمہ نگار کی محنت و ریاضت خلوص و ایمانداری کے ساتھ ساتھ تفصیلی وضاحت بھی شاملِ حال رہتی ہے تو ایسے مقدمات تعارفی سطح سے بالاتر ہو کر تحقیقی و تنقیدی سطح تک جا پہنچتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان مقدمات کو ادب میں اعلیٰ تنقیدی نمونوں کی حیثیت سے بھی تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ یا پھر وہ اصل کتاب پر اضافی حیثیت رکھتے ہیں نیز عربی زبان سے مقدمہ تاریخ ابن خلدون اور اردو زبان سے مقدمہ شعر و شاعری کو مثالوں کے تحت پیش کیا جا سکتا ہے۔

4.1۔ مرتب کردہ کتب:

4.1.1۔ انتخاب کلام مصحفیؔ:

مصحفیؔ اردو زبان کا ایک نمائندہ غزل گو شاعر ہے۔ جس نے دلی کی محفلوں کے اجڑنے کے بعد لکھنؤ کا

رخ کیا۔ جہاں انشاؔ، جرأتؔ اور رنگینؔ کی شاعری کے چرچے پہلے سے تھے۔ اس پس منظر میں مصحفیؔ کی شاعرانہ خصوصیات پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی دہلوی زبان اور دہلوی طرز شاعری اب لکھنوی فضا میں آ کر ایک منفرد رنگ اختیار کر جاتی ہے۔ کیوں کہ ان کی شاعری میں وہی سادگی، بے ساختگی، نرمی، گھلاوٹ اور تاثیر ہے جو دہلوی شعرأ کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کی زبان کا لب ولہجہ، الفاظ کا انتخاب اور رکھ رکھاؤ، سنجیدگی متانت دہلویت سے قریب ہے۔ اس کے برخلاف مجموعی لکھنوی شاعری میں ایک کھلا ڈلا پن ہے۔ لکھنؤ کی زبان میں تصنع و بناوٹ کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ نتیجتاً مصحفیؔ کی دہلوی طرز کی شاعری جب لکھنوی فضا سے میل کھاتی ہے تو اس سے مصحفیؔ کا ایک نیا رنگ ابھر کے سامنے آتا ہے۔ جسے ہم مصحفیؔ کے کلام کی انفرادیت بھی کہہ سکتے ہیں۔

''انتخابِ کلام مصحفی''عبدالستار دلوی کی نہ صرف پہلی ادبی کاوش ہے بلکہ یہ آپ کی پہلی مرتبہ تصنیف بھی ہے۔ جس نے آپ کو اردو دنیا سے متعارف کروایا۔ یہ تصنیف مئی 1960ء میں جدید کتاب گھر دہلی سے شائع ہوئی۔ جس کی ضخامت معہ آپ کے مبسوط مقدمے کے 86 صفحات ہے۔ اور اس دور میں اس کی قیمت ایک روپیہ نئے پیسے مقرر کی گئی تھی۔

عبدالستار دلوی انتخاب کلام مصحفی کو پیش کرنے کی وجہ بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس وقت مصحفیؔ کا کلام دستیاب نہیں ہوتا تھا یہی وجہ انتخاب کلام مصحفی کی محرک بنی۔ واقعہ یہ ہے کہ مصحفی کے کلام کے جتنے دیوان اور کلیات شائع ہوئے ہیں۔ وہ سب تقریباً 1967ء کے بعد کے ہیں۔ لیکن مصحفیؔ کے تذکرے اس سے قبل چھپ چکے تھے۔

عبدالستار دلوی نے اس انتخاب کو 1960ء میں ترتیب دیا۔ اس وقت مصحفی کے کلام کا ایک ضخیم انتخاب آپ کے پیش نظر رہا۔ جو اندازاً 1910ء کے آس پاس شائع ہوا ہوگا۔ جس پر مرتب کلام کا نام بھی غیر محفوظ ہے اور یہ انتخاب آپ کو انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری میں دستیاب ہوا۔ بقول عبدالستار دلوی انہوں نے اس تقریباً پچاس سال پرانے انتخاب سے استفادہ کرکے اپنے انتخاب کلام کی ترتیب وتدوین کی ہے جس میں مصحفیؔ کے ہر رنگ کے اشعار شامل ہیں۔

تنقید کے ابتدائی نقوش تذکروں میں ملتے ہیں اور تذکروں میں موجود تنقیدی آرا ہی سے اس دور کے تنقیدی مزاج کا پتہ چلتا ہے۔اگر ہم تذکروں میں مصحفی سے متعلق تنقیدی آرا دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ تقریباً تمام تذکرہ نگاروں نے مصحفی کو محض مقلد قرار دیا ہے اور مصحفی کو مقلد ٹھہرانے والے تذکرے، تذکرۂ شعراء اردو از حسن دہلوی، طبقات الشعراء از قدرت اللہ قاسم، گلزار ابراہیم از علی ابراہیم خلیل، تذکرہ عشقی از وجیہ الدین عشق، گلشن ہند از مرزا علی لطف، عمدہ منتخبہ از میر محمد خان سرور، مجموعہ نغز از قدرت اللہ قاسم، طبقات سخن از محی الدین عشق و مبتلا، تذکرہ نادر از مرزا کلب حسین خان نادر، دستور الفصاحت از حکیم سید احمد علی خان یکتا، گلشن بے خار از شیفتہ، تذکرہ ابن طوفان از ابن امین اللہ طوفان، بہار بے خزاں از احمد حسین کاکوری، گلستان بے خزاں از میر قطب الدین باطن، تذکرہ خوش معرکہ زیبا از سعادت خان ناصر، سراپا سخن از سید محسن علی محسن، سخن شعراً از عبدالغفور خان نساخ، بزم سخن از عبداللہ العمادی، شمع انجمن از سید محمد صدیق حسن خان، آبِ حیات از محمد حسین آزاد اور تذکرہ خندہ گل از عبدالباری آسی وغیرہ وغیرہ ہیں۔

کہتے ہیں وقت کے ساتھ ساتھ نظریے بدلتے ہیں اور ان بدلتے نظریوں کی وجہ سے ادیب وشعراء کی قدر و منزلت بھی بدلتی ہے۔ مصحفی کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ جہاں قدیم تذکرہ نگاروں نے ان کے کلام میں ان کا کوئی منفرد رنگ نہیں پایا وہیں جدید ناقدین نے مصحفی کے کلام کی انفرادیت کو بخوبی سمجھا۔جس کے نتیجے میں ان کے کلام کو کئی مرتبہ دیوان، کلیات یا انتخاب کی شکل میں شائع کیا جا چکا ہے۔ان مرتبین میں عبدالستار دلوی کے علاوہ پروفیسر نوالحسن نقوی، پروفیسر نثار احمد فاروقی، عابد رضا بیدار اور افسر صدیقی امروہی وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔وہیں دوسری طرف ادب میں معتبر ناقدین کی صنف میں کھڑے نقادوں نے آپ کے کلام و شاعری پر تفصیلی انداز میں تحقیقی و تنقیدی مضامین قلم بند کیے ہیں۔ جن میں ڈاکٹر سید عبداللہ، مولانا حسرت موہانی، فراق گورکھپوری، مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر قاضی عبدالودو، ڈاکٹر سعیدہ وارثی اور ڈاکٹر یعقوب عامر وغیرہ وغیرہ کے نام دیے جا سکتے ہیں۔

انتخاب کلام مصحفی کے مقدمے میں عبدالستار دلوی مصحفی کے منفرد رنگ سے متعلق لکھتے ہیں کہ مصحفی نے

ہر استاد کے رنگ میں کہنے کی کوشش کی ہے مگر یہ کہنا صحیح نہیں کہ مصحفی محض مقلد تھے اور ان کا کوئی مخصوص کارنامہ نہیں ہے۔ ہر مبتدی شاعر اپنے پیشرو شاعروں کے جذبات واحساسات سے ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جس کے دوران شاعر کا اپنا رنگ ابھر کے آتا ہے۔ مصحفی کے منفرد رنگ سے متعلق ڈاکٹر سید عبداللہ بھی عبدالستار دلوی کی متذکرہ بالا رائے سے متفق نظر آتے ہیں:

''اردو شاعری میں مصحفی کا ایک خاص مقام ہے۔خصوصاً اردو غزل کے ارتقاء میں ان کا کلام ایک اہم منزل کا حکم رکھتا ہے۔ان کی ہمہ رنگی کے باوجود......ان کا اپنا بھی ایک رنگ ہے اور یہی وہ رنگ ہے جس نے مصحفی کو مصحفی بنایا۔''

(''ولی سے اقبال تک''۔ص۔169-170)

مصحفی نے اپنے زمانے کے استاد شعراء کے طرز خاص میں شاعری کرتے کرتے اپنا ایک منفرد انداز ایجاد کر لیا جس نے خود مصحفی کو استاد شعراء کی صف میں لا کھڑا کر دیا۔

عبدالستار دلوی اپنے مقدمے میں مصحفی کی انفرادیت بتانے کے بعد کہتے ہیں کہ میر، سودا اور درد کی شاعرانہ خصوصیات کو ایک جگہ جمع کر لیا جائے تو مصحفی کا اپنا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔یعنی کے میر کے درد وغم، سودا کے نشاط اور درد کے تصوف کا مجموعہ ہم کو مصحفی کی شاعری میں دیکھنے کو ملتا ہے۔عبدالستار دلوی نے مقدمے میں آگے اپنی اس رائے کی وضاحت اس طرح کی ہے:

''مصحفی کا کلام میر کے جذبے کی شدت اور درد کے بصیرت افروز پیام کا اپنے اندر احساس رکھتے ہوئے ایک کامیاب سا نقش ہے۔ میر کے اس شدت جذبات اور درد کے تصوف کو بہت کم برتا جا سکا ہے اور اسی وجہ سے مصحفی کی یہ کوشش لائق صد آفرین ہے۔'' (''انتخاب کلام مصحفی''۔ص۔4)

نشاطیہ طرز کو تو تقریباً ہر شاعر اپناتا ہے مگر میر کا سا درد اور درد کی طرح تصوف کو اپنانا کوئی معمولی کارنامہ

نہیں ہے چوں کہ مصحفؔی نے یہ کارنامہ کر دکھایا ہے تو وہ اس کے لیے داد و تحسین کے حقدار ہیں۔

عبدالستار دلوی اپنے مقدمے میں آگے چل کر یہ سوالات اٹھاتے ہیں کہ دلی کے اجڑنے کا اثر میرؔ، سوداؔ اور دردؔ کی شاعری پر پڑ سکتا ہے تو کیا مصحفؔی کی شاعری پر نہیں پڑ سکتا؟ ناقدین مصحفؔی کی شاعری کو کیوں مقلدانہ شاعری کہتے ہیں جب کہ مصحفی کی شاعری خود مصحفی کے اپنے مشاہدات و تجربات کی عکاس بھی تو ہو سکتی ہے؟ ان دونوں سوالوں کا وہ یہ جواز بھی پیش کرتے ہیں کہ جن عصری حالات سے میرؔ، سوداؔ اور دردؔ کی شاعری گزری ہے وہی عصری حالات مصحفؔی نے بھی دیکھیں ہیں تو کیا یہ ممکن نہیں کہ مصحفؔی نے اپنے ان ہی عصری حالات سے متاثر ہو کر اس طرح کی شاعری کی ہو، نہ کہ استاد شعراء سے متاثر ہو کر جس کو ہمارے ناقدین ''تقلید کا دھوکا'' تصور کرتے ہیں۔ وہ تو مصحفؔی کی اپنی تخلیقی اپج کا بھی نتیجہ ہو سکتی ہے۔آپ کے اس جواز پر غور و فکر کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ ایسا ہونا ممکن ہے۔

مصحفؔی کی شاعری پر دلّی کے استاد شعراء کے اثرات دیکھ لینے کے بعد یہ بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم مصحفؔی کی شاعری پر اثر انداز ہونے والے لکھنوی استاد شعراء یعنی انشاؔ، جرأتؔ اور رنگینؔ کے اثر یا تاثر کو بھی جان لیں۔عموماً کہا جاتا ہے کہ مصحفی کی شاعری میں خارجیت کو بتانے کے لیے انشاء جرأت اور رنگین سے متاثرہ کلام کو پیش کیا جا سکتا ہے لیکن یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ مصحفؔی نے لکھنوی کی ناساز گار فضا میں رہ کر بھی دلّی کی روایتِ غزل کو قائم رکھنے کی کوشش کی جس کے تحت انہوں نے انشاؔ، جرأت اور رنگینؔ کے جیسی بے اعتدالیوں سے اپنا دامن پاک رکھا۔

عبدالستار دلوی اپنے مقدمے میں زور دے کر کہتے ہیں کہ مصحفؔی کی شاعری میں جو خارجی اثرات نمایاں ہیں وہ انشاؔء، جرأتؔ اور رنگینؔ کے اثر کا نتیجہ نہیں بلکہ وہ تو لکھنوی فضا اور مجموعی ماحول کا اثر ہے۔ اس رائے کی وضاحت وہ اس طرح پیش کرتے ہیں:

''مصحفؔی کو کسی طرح جرأتؔ اور انشاؔ اور رنگینؔ کا مقلد قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیوں کہ

مصحفی کے ہاں وہ کھلا ڈلا رنگ نہیں ہے جوان شاعروں کی خصوصیت ہے۔ بلکہ اس کے برعکس مصحفی کے یہاں ایک خاص قسم کا ٹھہراؤ، متانت اور سنجیدگی ملتی ہے۔'' (''انتخابِ کلام مصحفی''۔ص۔5)

ڈاکٹر سعیدہ وارثی بھی مصحفی کے کلام پر لکھنوی ماحول کے اثر سے متعلق عرض کرتیں ہیں:

''مصحفی جس کی ذہنی ساخت کی تکمیل دلی میں ہوئی جس کی شخصیت اور مزاج کی تعمیر دلی کی فضا اور ماحول میں ہوئی جس کے شعور کی پختگی اور اخذ وقبول کا زمانہ درد، میر اور سوز کی ڈالی ہوئی ٹھوس، صالح اور مستحکم روایتوں کے سائے میں گزرا وہ لکھنو کی رنگا رنگی اور سطحی فضا میں انشا، جرأت اور رنگین جیسے شعراء سے کیسے مصالحت کرسکتا تھا۔لیکن مصحفی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اس بدلے ہوئے ماحول کا ساتھ دیا اور ادبی وضع کے ساتھ اپنی مخصوص انفرادیت بھی قائم رکھی۔''

(''مطالعہ مثنویات مصحفی''ص:8-7)

مصحفی کے کلام کی خارجیت، عبدالستار دلوی کی پیش کردہ وضاحت اور ڈاکٹر سعیدہ وارثی کی تفصیل رائے کی روشنی میں ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ مصحفی کی شاعری میں جو خارجی عناصر ملتے ہیں وہ انشا، جرأت اور رنگین کے زیر اثر نہیں ہے بلکہ وہ تو مجموعی لکھنوی ماحول کا اثر ہے۔

عبدالستار دلوی اپنے مقدمے میں مصحفی کو قدیم وجدید رنگ کے پیش نظر دلی اور لکھنو کی درمیانی کڑی سے تعبیر کرتے ہیں جو بعد میں ایک دبستان کی صورت اختیار کرگئی، اس سیاق وسباق میں فراق گورکھپوری مصحفی کو آواز بازگشت تصور کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''جس طرح وہ عمر بھر بے وطن تھا، اسی طرح اس کی غزلیں بھی دلی اور لکھنؤ کے دوراہے پر آواز بازگشت کی طرح گونج رہی ہے۔''

(''اندازے'' ص:67)

مصحفی کے کلام سے اس طرز کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

اے مصحفی تو واں سے کیوں روٹھ کے آیا تھا
دیوانے تری خاطر کڑھتا ہے وطن سارا

روئے وطن نہ دیکھا تو نے جو مصحفی پھر
شاید کے جھینکتے تو اپنے وطن سے نکلا

مختصراً کہا جائے تو مصحفی کی شاعری دبستان دلی اور دبستان لکھنؤ کے میل سے پیدا ہونے والی ایک منفرد انداز کی شاعری ہے۔ جو بعد میں خود ایک علاحدہ دبستان کی شکل اختیار کر گئی ہے اور اس دبستان کے شعراء تلامذۂ مصحفی ہیں جنہوں نے مصحفی کے بعد اس مخصوص دبستان کو آگے بڑھایا۔

عبدالستار دلوی نے جب انتخاب کلام مصحفی کو ترتیب دیا تب وہ تقریباً تئیس (23) سال کی عمر میں ایم اے اردو کے طالب علم تھے لیکن اس کم و بیش پانچ صفحے کے مختصر سے مقدمے میں انہوں نے مصحفی کی عظمت، اُن کی شاعری کی افادیت اور ان کی انفرادیت کی پہچان کا خوب جائزہ لیا ہے۔

انتخاب کلام مصحفی کے پر مغز مقدمے کے بعد انتخاب کلام کو دیکھنے سے ان کے حسنِ نظر اور شاعرانہ ذوق کا پتہ چلتا ہے۔ یہ ان کی پہلی کاوش وہ بھی طالب علمی کے زمانے میں قابل داد ہے۔

4.1.2۔انتخاب کلام چکبستؔ:

برج نرائن چکبستؔ کو قوم پرست اور محبّ وطن شاعر کہا جاتا ہے کیوں کہ ان کی شاعری کا ایک بڑا حصہ انقلابی اور وطنی شاعری پر مبنی ہے۔ جس کی وجہ ان کی روایت کی اندھی تقلید سے بیزاری ہے۔

چکبستؔ کے دیوان میں غزلیں اور نظمیں دونوں کا انداز ایک ہی سا لگتا ہے۔ کیوں کہ انھوں نے نہ صرف نظموں میں سیاسی و انقلابی مضامین باندھے ہیں بلکہ ان کی کئی غزلیں بھی ایسی مل جاتیں ہیں جن میں انھوں نے تسلسل بیان سے کام لیا ہے مگر غزل کی روایات اور اشارے کو استعمال کرنے کا ان کا مخصوص انداز ہی ان کی نظم و غزل کو ایک دوسرے سے ممیّز کرتا ہے۔

چکبستؔ نے اپنے دیوان کو ''صبح وطن'' کے نام سے موسوم کیا۔ جس کے اب تک تقریباً چار ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ یہ دیوان تین حصوں پر مشتمل ہے۔ جس کے پہلے حصے میں حب الوطنی کی شاعری ہے۔ جب کہ دوسرے حصے میں اصلاحی شاعری ہے۔ علاوہ ازیں تیسرے حصے میں سیاسی وقومی لیڈروں کے شخصی مرثیے قلم بند ہیں۔ ''صبح وطن'' کے ان تینوں حصوں کی شاعری کو دیکھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ چکبستؔ نے اپنی شاعری کی مناسبت ہی سے اس دیوان کا نام ''صبح وطن'' رکھا ہے۔ اس تعلق سے ڈاکٹر افضال احمد کے الفاظ دیکھیے:

> ''انھوں نے اپنے دیوان کا نام صبح وطن اس رعایت سے رکھا کہ اس میں وطن سے متعلق اس پر شیدا ہونے والوں سے متعلق اور وطن کے عام حالات سے یہ دیوان پر ہے۔''

(''چکبستؔ: حیات اور ادبی کارنامے''۔ ص:13)

''انتخابِ کلام چکبستؔ'' کے دیوان ''صبح وطن'' کا ایک طویل سا انتخاب ہے۔ جس کو عبدالستار دلوی نے ترتیب دے کر اگست 1960ء میں عارف پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع کیا ہے۔ جس کی ضخامت 160 صفحات اور قیمت ڈھائی روپے ہے۔

عبدالستار دلوی اپنے طویل مقدمے کے آغاز میں قدیم شاعری سے لے کر آزادؔ اور حالیؔ تک اور ان کے توسط سے اقبالؔ اور چکبستؔ تک پہنچتے ہیں۔ ان کی اس تفصیلی تمہید کا مختصر خلاصہ یہ ہے۔ قدیم اردو شاعری کے موضوعات عشق و عاشقی، گل وبلبل، ہجر و وصال ہی تک محدود رہے۔ محمد قلی قطب شاہ اور نظیرؔ اکبرآبادی کے علاوہ

تقریباً سبھی نے اس قدیم روایت کی آبیاری کی لیکن انجمن پنجاب کے قیام سے اردو شاعری میں بالخصوص اردو نظم میں نمایاں تبدیلیاں وجود میں آئیں۔ جس میں کرنل ہالرائیڈ کی ایماء پر آزادؔ اور حالیؔ نے موضوعاتی نظموں کو فروغ دیا۔ چوں کہ اس دور میں حقائق کو بیان کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے انجمن پنجاب تحریک سے اردو شاعری میں ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ آزادؔ اور حالیؔ کی اس جدید روایت کو ان کے بعد آنے والی نسل یعنی شبلیؔ، ظفرؔ، سرورؔ، جوشؔ اور کیفیؔ نے آگے بڑھایا۔ جنہوں نے نہ صرف موضوعاتی شاعری کی بلکہ شاعری میں اپنے عصری ماحول، جنگ آزادی اور سیاسی و انقلابی موضوعات کا اضافہ بھی کیا۔ اس مخصوص ماحول میں جو شعراء منظرنامے پر ابھرے ان میں اقبالؔ، چکبستؔ اور اکبرؔ نے اپنی اپنی مخصوص طرز کی شاعری کی۔

عبدالستار دلوی مقدمے میں تمہید کے بعد چکبستؔ کی غزل گوئی پر تفصیلی طور پر کہتے ہیں کہ چکبستؔ نے غزلیں، نظمیں، رباعیاں اور قطعات وغیرہ کہے ہیں۔ جن میں غزلوں کی تعداد ساٹھ (60) کے قریب ہے۔ جو ان کو غزل گو کہنے کے لیے کافی ہے۔ البتہ یہ کہ ان کی نظموں کے مقابلے میں غزلیں مختصر ہیں۔ یعنی ان کا حجم کم ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ غزلیں کہنا پسند نہیں کرتے تھے یا پھر کہہ نہ پاتے تھے بلکہ اس کی وجہ تو ان کا جذبہ حب الوطنی اور جذبہ اصلاح ہے۔ جو ان کو نظم تک لے جاتا ہے۔ ان کی غزل کے موضوعات میں تنوع ہے وہ اپنی غزلوں میں روایتی عشقیہ مضامین کے ساتھ ساتھ اپنے عصر حاضر کے سیاسی، سماجی، معاشی اور اخلاقی موضوعات کو بھی بیان کرتے ہیں۔ وہ مقدمے میں آگے چکبستؔ کی غزل کے موضوعات سے متعلق یوں لکھتے ہیں:

> ''چکبستؔ کی غزلوں میں حسن و عشق کے روایتی مضمون ہی نہیں بلکہ موجودہ دور کی روح بھی جھلکتی ہے۔ وہ کائنات کے گیسوؤں کو سنوارتے ہیں، سماج، سیاست، معاشی اور اقتصادی زبوں حالی اور نفاق اور گبر و مسلمان۔ چکبستؔ کی غزلوں کے محبوب مضامین ہیں۔''
> (''انتخاب کلام چکبستؔ''۔ ص:13)

چکبستؔ کو بچپن ہی سے شاعری کا ذوق و شوق تھا۔ جس کے چلتے انہوں نے اردو شاعری کے استاد شعراء

کے کلام کو نہ صرف دلچسپی سے پڑھا بلکہ اس کا اثر بھی قبول کیا۔ اس سلسلے میں عبدالستار دلوی اپنے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ چکبستؔ کا تعلق چوں کہ لکھنؤ سے ہے اسی لیے ان کی شاعری پر دبستان لکھنو کے دو ممتاز شعراء آتشؔ اور انیسؔ کا اثر با آسانی دیکھنے کو ملتا ہے۔ جہاں انہوں نے انیسؔ سے متاثر ہو کر اپنی نظمیں اور شخصی مرثیے مسدس کی ہیئت میں کہے ہیں وہیں آتش کے زیر اثر مرصع سازی اور معنویت کو آگے بڑھایا اور اسی کے ساتھ ساتھ اردو شاعری کو صنعت گری کے علاوہ موضوع اور خیال کی نئی نئی وسعتوں سے روشناس کرایا ہے۔ چکبستؔ نے اپنی شاعری میں چونچلوں اور معاملہ بندی کو کم کر کے حیات و کائنات کے مسائل کو اپنی شاعری میں پیش کیا۔

عبدالستار دلوی اپنے مقدمے میں چکبستؔ کی شاعری سے متعلق کہتے ہیں کہ چکبستؔ نے لکھنوی شاعر ہونے کے باوجود اپنی شاعری میں خارجیت کے ساتھ ساتھ داخلیت کو بھی ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ وہ مقدمے میں آگے وضاحت کرتے ہیں کہ چکبستؔ کی شاعری میں داخلیت غالبؔ اور حالیؔ کے زیر اثر داخل ہوئی ہے۔ ان کے خیال میں غالبؔ کی ظاہری و معنوی خصوصیات کو جس کامیابی سے چکبستؔ نے اپنایا ہے اس سے چکبست کی شاعرانہ خصوصیات کا اندازہ ہوتا ہے اور انہوں نے حالیؔ کے ذیل میں لکھا ہے کہ چکبستؔ حالیؔ کے فلسفہ شعر اور اصول شعر سے بے حد متاثر ہیں۔ جس کی عملی مثالیں چکبستؔ کی شاعری میں دیکھنے کو مل جاتیں ہیں۔

عبدالستار دلوی اپنے مقدمے میں چکبستؔ کی غزل گوئی پر تفصیلی نظر ڈالنے کے بعد ان کی نظموں کو اپنا موضوعِ بحث بناتے ہیں۔ ان کی رائے میں چکبستؔ کی نظمیہ شاعری میں ہمیں بلند مقصدیت، اہم مطمحِ نظر، عصری سیاسی اور سماجی حالات و واقعات اور سب سے زیادہ جذبہ حب الوطنی دکھائی دیتا ہے۔ وہ مقدمے کے اگلے صفحات میں اس رائے کی وضاحت یوں کرتے ہیں کہ چکبست اقبالؔ کے بعد وہ تنہا شاعر ہیں جن کے کلام میں حب الوطنی کے عناصر سب سے زیادہ ہیں۔ انہوں نے وطن کی محبت کا جو راگ گایا ہے اسکی دھیمی لے اور نغمگی چکبست کا اپنا کارنامہ ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کی نظمیں پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے گویا حب الوطنی کے جذبات سے ایک سیلاب امڈ آتا ہے۔ اور اس طرح کی نظموں میں جذبہ اور عقل کا امتزاج ملتا ہے۔ چکبستؔ کے مونوگراف کے مصنف

سرسوتی سرن کیفؔ (صحافی وشاعر) بھی چکبستؔ کی حب الوطنی کے متعلق اظہار رائے کرتے ہوئے آپ کے ہم نوا نظر آتے ہیں:

> ’’ان کی غزلوں اور نظموں میں کل ملا کر 2025اشعار ہیں۔ ان میں سے 689 شعر یعنی 34.2 فیصد متعلق حب الوطنی ہیں۔ جہاں تک حب الوطنی کی شاعری کے تناسب کا سوال ہے اردو کا کوئی شاعر چکبستؔ کے پاس پھٹک نہیں سکتا۔‘‘ (چکبستؔ ،ص:78)

اردو شاعری اور خاص کر اردو نظم میں اقبالؔ کا مرتبہ بہت بلند ہے مگر جب جذبہ حب الوطنی کا تذکرہ ہوتا ہے تو اقبالؔ کے مقابلے میں چکبستؔ پیش پیش نظر آتے ہیں۔

مقدمہ نگار چکبستؔ کی نظموں کی خصوصیات بتاتے بتاتے اچانک تعجب کا اظہار کرتے ہیں کہ اردو جیسی ملک گیر زبان میں چکبستؔ سے پہلے کسی شاعر نے ہندوستان کے عظیم تاریخی کارناموں کو اپنی شاعری کا موضوع نہیں بنایا۔ چکبستؔ نے ہندو دھرم کی ایک مقدس کتاب ’’رامائن‘‘ کے ایک سین کو موضوع بنا کر اپنی ایک یادگار نظم ’’رامائن کا ایک سین‘‘ لکھی ہے جو اپنی ڈرامائیت، تاثیر وقت اور موقع کے لحاظ سے اور الفاظ کے Diction کی وجہ سے اردو کی بہترین نظموں میں شمار کی جاتی ہے۔ علاوہ بریں ڈاکٹر افضال احمد نے اپنی کتاب ’’چکبستؔ: حیات اور ادبی کارنامے‘‘ میں نظم ’’رامائن کا ایک سین‘‘ کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے اس بات کا خلاصہ کیا ہے کہ چکبستؔ نے نہ صرف رامائن کے اس ایک سین کو نظم کیا تھا بلکہ وہ پوری رامائن کو ایک ایک سین کر کے نظم کے قابل میں ڈھالنا چاہتے تھے جس کے چلتے انہوں نے رامائن کے دوسرے سینس کو بھی نظم کر لیا تھا۔ لیکن وہ چکبستؔ کی زندگی میں کہیں شائع نہ ہو سکے۔ مگر چکبستؔ کے سوانح نگار ڈاکٹر افضال احمد نے ان کو دریافت کر کے اپنی کتاب میں ضمیمہ کے طور پر شامل کر لیا ہے۔ چکبستؔ نے ہندو دھرم کی مقدس کتاب رامائن کے علاوہ بھگوان شری کرشن اور ماتا کا درجہ رکھنے والے جانور، گائے کو موضوع بنا کر نظمیں کہی ہیں جو ان کی بہترین نظموں میں سے ہیں۔

عبدالستار دلوی اپنے مقدمے میں چکبستؔ کی غزلوں اور نظموں کی خصوصیات بتانے کے بعد ہندوستان میں مغربی تہذیب اور ہندوستانی تہذیب پر اس کے اثرات کا سیر حاصل جائزہ لیتے ہیں۔اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں کہ چکبستؔ نے مغرب کے ہر اچھی چیز کو قبول کرنے کی ترغیب دلائی اور ایسی چیزوں سے جو ہماری تہذیب، تاریخ، روایات اور مزاجوں کے موافق نہ تھیں۔ان کی تکذیب کی۔آپ کی اس رائے سے سرسوتی سرن کیفؔ بھی متفق نظر آتے ہیں:

> ''وہ آنکھ بند کر کے پرانی لکیر پر چلنے کے خلاف تھے اور آنکھ بند کر کے یورپ کی تہذیب کی نقل کے بھی خلاف تھے۔وہ سماجی اصلاح کا منطقی طریقہ اپنانا چاہتے تھے۔جس میں دونوں تہذیبوں کے اچھے عناصر لے کر انہیں ایک گھٹی ہوئی تہذیب کی صورت میں یکجا کر دیا جائے۔'' (چکبست۔ص:71)

عبدالستار دلوی مقدمے میں آگے لکھتے ہیں کہ چکبستؔ کو اپنے ملک کی سیاسی غلامی سے زیادہ اپنے ملک کی ذہنی غلامی تکلیف دیتی تھی کیوں کہ وہ تہذیب فرنگی کی کورانہ تقلید کو پسند نہیں کرتے تھے۔اس ضمن میں سرسوتی سرن کیفؔ بھی تقریباً ایسے ہی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انہوں نے مغربی تہذیب کی اندھا دھن تقلید کی ذہنیت کی ڈٹ کر مخالفت کی ہے اور وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ان کے ہم وطن اپنی تہذیب کے لطیف عناصر پر فخر کریں۔

چکبستؔ کی شاعری ان کی غزل و نظم کا احاطہ کرتے ہوئے یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ چکبستؔ جب ہم عصر ماحول سے متاثر ہو کر شاعری کر رہے تھے تب ان کے ہم عصر شعراؑ کس طرز کی شاعری کو اپنا رہے تھے۔یوں کہیے کہ چکبستؔ اور ان ہم عصر شعراء کی شاعری میں کیا فرق ہے۔اس فرق کو جاننے کے لیے جب ہم اس دور کے شعراء کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں تین عظیم شاعر چکبستؔ، اقبالؔ اور اکبرؔ گزرے ہیں۔جنہوں نے اپنی اپنی طرز شاعری کے ذریعے مغرب کی اندھا دھن تقلید کے خلاف ردعمل ظاہر کیا۔ جہاں اس کام کے لیے

اکبرؔ نے طنز ومزاح کا سہارا لیا وہیں اقبالؔ نے خالص اسلامی اصولوں کی بنا پر ایک مستقبل کی دنیا کے قیام کا تصور پیش کیا۔ان دونوں کے برخلاف چکبستؔ نے قدیم روایتوں اور نئی سوچ کو یکجا کر کے ایک نئے سماج کی تشکیل کی بات کہی۔اقبالؔ اور چکبستؔ کے طرزِ بیان میں فرق کو واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر افضال احمد کہتے ہیں:

''چکبستؔ اور اقبالؔ میں یہی فرق ہے کہ اقبال پرانی عظمتوں کو یاد دلاتے ہیں۔ حال کی بربادی کی وجہ بیان کرتے ہیں اور مستقبل کو درست کرنے کا خود ایک طریقہ بتاتے ہیں۔لیکن چکبستؔ پرانی عظمتوں اور حال کی بربادی تو پیش کرتے ہیں لیکن مستقبل کے لیے خود کوئی ایسا طریقہ پیش نہیں کرتے جس سے مستقبل روشن اور شاندار ہو۔وہ محض سیاسی لیڈروں اور مدبروں کے خیالات کی ترجمانی کر دیتے ہیں۔'' (''چکبست: حیات اور ادبی کارنامے''۔ص:116)

چکبستؔ کے کلام کے مطالعے اور ڈاکٹر افضال احمد کی رائے کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ چکبستؔ صرف اور صرف زمانہ حال کے شاعر تھے۔کیوں کہ انہوں نے اپنے کلام میں مستقبل سے متعلق کوئی زاویہ نگاہ پیش نہیں کیا۔

عبدالستار دلوی اپنے مقدمے میں چکبستؔ کی غزلوں اور نظموں پر سیر حاصل گفتگو کرنے کے بعد ''صبح وطن'' کے آخری حصے میں موجود شخصی مرثیوں پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ان کا ماننا ہے کہ چکبستؔ نے اپنے سیاسی اور قومی لیڈروں کی موت پر اظہار افسوس کرتے ہوئے ان کے محاسنِ ظاہری و باطنی کو ان مرثیوں میں اجاگر کیا ہے۔ اس کے بعد وہ اردو میں شخصی مرثیوں کی روایت کو پس منظر کے طور پر بیان کرتے ہیں ور چکبستؔ کے شخصی مرثیوں سے کچھ مسدس بند مثالوں کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

عبدالستار دلوی مقدمے کے آخری حصے میں بتاتے ہیں کہ یہ انتخاب چکبستؔ کے دیوان ''صبح وطن'' کی کم یابی کے پیش نظر طالب علموں کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مرتب کیا گیا ہے۔کیوں کہ اس انتخاب کو ترتیب دیتے وقت آپ خود ایم اے کے طالب علم تھے تو اس کم یاب کلام کی اہمیت کو آپ سے بہتر اور کون جان سکتا تھا۔لہٰذا چکبستؔ کے کلام کی کمیابی آپ کے انتخاب کلامِ چکبست کی محرک بنی۔

انتخاب کلام چکبستؔ کے پرمغز مقدمے اور انتخاب کلام کے بغور مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے دوران طالب علمی میں چکبستؔ کے کلام کا مطالعہ، کمیابی کے باوجود کس قدر گہرائی سے کیا ہے۔ کیوں کہ وہ مقدمے میں پہلے چکبستؔ کے کلام پر بے باکانہ تنقیدی رائے دیتے ہیں اور آگے چل کر وضاحت بھی پیش کرتے ہیں جو ایک طالب علم کے لیے اور وہ بھی کم و بیش دو مہینے کی قلیل مدت میں پیش کرنا آسان نہیں تھا۔ دراصل وہ اس انتخاب سے دو مہینے پہلے یعنی مئی 1960ء میں ''انتخاب کلامِ مصحفی'' کو اردو داں طبقے میں متعارف کروا چکے تھے۔ آپ کے دونوں انتخابات کو اس دور کے ادبی حلقوں میں خوب سراہا گیا۔

4.1.3۔ من سمجھاون:

''من سمجھاون''، صوفی بزرگ و شاعر شاہ تراُب چشتی کی دکنی نظم ہے جو انہوں نے مراٹھی کوی رام داس کی مناچے شلوک سے متاثر ہو کر کہی ہے۔ جس کو عبدالستار دلوی نے اپنے طویل و مبسوط مقدمے کے ساتھ 1965ء میں اردو مرکز بمبئی سے شائع کیا ہے اور اس کی ضخامت نوے (90) صفحات ہیں۔

''من سمجھاون کی ابتدأ پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی (ڈائرکٹر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی) کے پیش لفظ سے ہوتی ہے جو آپ کے لیے پیر مغاں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چوں کہ آپ نے ایک طویل عرصہ پروفیسر ندوی کی شاگردی میں گزارا ہے اور اس طویل عرصے میں انہوں نے نہ صرف آپ کی حوصلہ افزائی کی ہے بلکہ ہمیشہ تحقیقی میدان میں پیش رفت کی تلقین کرتے رہے۔ جس کا نتیجہ من سمجھاون کی شکل میں ظاہر ہوا۔

پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی نے اپنے ''پیش لفظ'' میں بھکتی تحریک، جین مت، بدھ مت، تجدید برہمنیت، ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد، صوفیائے کرام کی انسان دوستی اور وحدت الوجود کے فلسفے پر گفتگو کرتے کرتے مراٹھی کوی رام داس کی مناچے شلوک کا احاطہ کیا ہے اور آگے یہ بھی بتایا ہے کہ دس سال قبل خود ان کی ملکیت میں من سمجھاون کا نسخہ تھا جس کو انہوں نے ترتیب و تدوین کی غرض سے اپنے دوست ڈاکٹر دیورے کے سپرد کیا تھا لیکن ڈاکٹر دیورے کی اچانک موت سے یہ امر حقیقت نہ بن سکا مگر اپنے شاگرد خاص کی اس پہل پر وہ مسرت کا

اظہار کرتے ہیں۔

من سمجھاون میں پیش لفظ کے بعد عبدالستار دلوی کے قلم سے نکلا ہوا دیباچہ ہے جس کی ابتدا وہ ان الفاظ سے کرتے ہیں:

> ''شاہ تراب کی نظم ''من سمجھاون'' میرے علم میں پہلی بار کتابی صورت میں شائع ہورہی ہے۔ ''من سمجھاون'' کی ترتیب کا خیال دو سال قبل میرے ذہن میں تھا۔مگر اپنی گونا گوں مصروفیات کی وجہ سے میں اسے اب تک مرتب نہیں کر سکا۔ موجودہ ترتیب سے بھی میں کچھ بہت زیادہ خوش نہیں ہوں۔اور اس کی بڑی وجہ اس کے دیگر قلمی نسخوں کا ہمہ ست نہ ہونا ہے۔گوکہ میں نے امکان بھر کوشش کی تھی کہ میں خود دیگر نسخے بھی دیکھ لوں تا کہ ان کا بمبئی کے زیر نظر نسخے سے مقابلہ کیا جاسکے۔اب بھی میں یہی سوچ رہا ہوں کہ دیگر نسخوں سے مقابلہ کیے بغیر میں اسے شائع نہ کروں لیکن اس نظم کے موضوع اور مراٹھی سے اس کے تعلق نے اس قدر رجھایا کہ اب طباعت میں تاخیر منظور نہ ہوئی۔''

(''من سمجھاون''،مرتبہ:عبدالستار دلوی،ص:9)

دیباچے میں اپنے اس اعتراف کے بعد وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ اگر اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن کی ضرورت پیش آئی تو اس وقت کتاب کی تمام خامیوں کو دور کیا جائے گا۔

من سمجھاون میں پیش لفظ اور دیباچے کے بعد کی منزل مقدمہ ہے جو کم و بیش چالیس (40) صفحات پر مشتمل ہے۔جس کی طویل تمہید میں آپ نے ہندوستان میں مسلم حکومت کے قیام ہندوؤں پر اسلامی تہذیب کے اثرات،نو وارد مسلمانوں کے مذہبی جذبات،ان کی انسان دوستی و بھائی چارگی اور ہندوستانیوں سے ان کی پر خلوص رواداری کا سیر حاصل جائزہ لیا ہے جو سیاسی،سماجی،تاریخی،تنقیدی،لسانی اور تقابلی ہر اعتبار سے مفید ہے۔

مقدمے میں انہوں نے مہاراشٹر میں مسلم صوفیا کی مختصر تاریخ بیان کرنے کے بعد مراٹھی کے مشہور شعراء گیانیشور، ایکناتھ، تکارام، نادیو کے ساتھ ساتھ رام داس (جو مناچے شلوک کے شاعر ہیں) کی حیات وتعلیمات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

عبدالستار دلوی کے مطابق رام داس کا اصل نام نارائن ہے۔ اور وہ 1608ء میں جامبھ گاؤں، جلگاؤں، مہاراشٹر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سریا جی پنت اور ماں کا نام رانو بائی تھا۔ دراصل رام داس اپنے بھائی گنگا دھر عرف رامی رام داس سے عمر میں تین سال چھوٹے تھے۔ جب رامی رام داس پندرہ سال کے ہوئے تو ان کے والد نے انہیں منتر سکھانے کا ارادہ کیا اور اس کی اطلاع جب رام داس کو ہوئی تو انہوں نے بھی منتر سیکھنے کی خواہش ظاہر کی مگر عمر کی کمی (بارہ سال) کے سبب ان کی اس خواہش کو نظر انداز کر دیا گیا جس کے نتیجے میں رام داس نے غصے میں گھر چھوڑ دیا۔ پروفیسر سیدہ جعفر رام داس کے گھر چھوڑنے کی دوسری دو وجوہات یوں بیان کرتیں ہیں:

> ''جب ان کی عمر بارہ سال تھی وہ گھر سے بھاگ کر ناسک کے قریب تکالی کے قصبے میں پہنچے۔ اس واقعے کی ایک یہ بھی وجہ بیان کی جاتی ہے کہ ان کی والدہ شادی کر کے انہیں گرہستی کے بندھن میں باندھ دینا چاہتی تھی اور اس سے گھبرا کر وہ بھاگ نکلے تھے۔ دوسری وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ رام داس کے بھائی گنگا دھر انہیں روحانیت کی طرف راغب ہونے سے منع کرتے تھے کیوں کہ ابھی ان کی عمر صرف بارہ سال ہی تھی۔''

(''من سمجھاون''مرتبہ: پروفیسر سیدہ جعفر، ص:116)

اسی تعلق سے ڈاکٹر جمال شریف لکھتے ہیں:

''رام داس کی شادی بارہ سال کی عمر میں ہوئی۔ شادی کے وقت (پنڈت کے

منہ سے نکلا ہوا) ایک لفظ ساوٗدھان سن کر بھاگ گئے۔''

(''دکن میں اردو شاعری وؔلی سے پہلے''،ص:793)

رام داس کے گھر چھوڑنے سے متعلق عبدالستار دلوی، پرفیسر سیدہ جعفر اور ڈاکٹر جمال شریف کی مختلف آرائیں میں سے ہم عبدالستار دلوی کی رائے کو ہی تسلیم کر سکتے ہیں کیوں کہ انہوں نے اپنے مقدمے میں آگے بیوی بچوں سے متعلق رام داس کی سوچ کو یوں بیان کیا ہے:

''عام طور سے سادھو اور سنتوں سے خاندانی زندگی اور بیوی بچوں سے بیزاری ظاہر کی ہے لیکن رام داس اس ضمن میں مہاراشٹر کا وہ ممتاز سادھو ہے جس نے اس منفی نظریے حیات کی سختی سے مخالفت کی اور اسے اثبات رنگ و آہنگ عطا کیا۔'' (''من سمجھاون'' مرتبہ:عبدالستار دلوی،ص:9)

چوں کہ عبدالستار دلوی کی دونوں آراء ایک دوسرے سے مربوط دکھائی دیتی ہیں۔ جب کہ پروفیسر سیدہ جعفر اور ڈاکٹر جمال شریف دونوں کی آراء رام داس کی اگلی زندگی کے واقعات سے میل نہیں کھاتیں۔اسی لیے ان کا ماننا مشکل نظر آتا ہے۔

بقول عبدالستار دلوی رام داس نے گھر چھوڑنے کے بعد ٹاکلی گاؤں پنچوٹی کے رام مندر میں بارہ سال عبادت کی اور اسی دوران ایک دن شری رام نے ان کو درشن دیے جس کے بعد انہوں نے پورے ملک کی تیرتھ یاترا کی اور اس یاترا کے دوران رام داس نے مذہبی گروہوں کی مذہب اور زندگی سے دوری کو مذہب اور سماج کے حق میں خطرناک محسوس کیا۔جس کے چلتے انہوں نے ملک بھر میں کئی مٹھ قائم کیے۔ جہاں پر ان کے چیلوں نے ان کی تعلیمات کو عام کیا۔ یہاں آپ کے چیلوں میں اودھو گوسوامی ،کلیان سوامی ، اننت کوی بھیم سوامی ،ستیو باسوامی اور کیشو سوامی قابل ذکر ہیں۔ نیز اس سلسلے میں شیواجی کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ رام داس کے عظیم مہاراشٹر کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے والی شخصیت شیواجی ہی کی تھی۔ ان کی زندگی کا آخری وقت سجن گڑھ کے قلعے میں گزرا

جہاں ان کے عقیدت مندوں کا سلسلہ لگا رہتا تھا اور 1681ء میں یہیں انہوں نے وفات پائی۔

عبدالستار اپنے مقدمے میں رام داس اور ان کی تعلیمات کو بیان کرنے کے بعد ان کی جملہ تصانیف اور ان میں سے مناچے شلوک کا خصوصی ذکر کر کے کہتے ہیں کہ شاہ تراب کی صراحت کے مطابق ''من سمجھاون'' رام داس کی پوتی کا جواب ہے جس میں انہوں نے اس کے سب رمز کھولے ہیں:

ای اس کی من کی پوتی کا جواب ہے
کہ جس کا رام داس جگ میں خطاب ہے
مراٹھی بات میں پوتی وہ بولیا
میں اس کا رمز سب دکھنی میں کھولیا
بھی اس کا نام من سمجھاون ہے رکھا
لیکن سربسر ہندی ہے بھاکا

عبدالستار دلوی مقدمے میں اب اس موقع پر من سمجھاون کے شاعر شاہ تراب کے حالاتِ زندگی اور تصانیف پر تفصیلی انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔ ان کے مطابق تراب کی پیدائش 1100ھ کے ربع آخر یا بارہویں صدی کے ربع اول میں ہوئی ہوگی۔ اس لیے کہ شاہ تراب کی ایک نظم ''گیان سروپ'' کی کتابت (جس کا مخطوطہ ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد میں محفوظ ہے۔) 1121ھ میں ہوئی جس میں انہوں نے اپنے تئیں بالک بالا، لکھا ہے اگر کتابت کی طرح اسی کو سنہ تصنیف بھی مان لیا جائے تو بالک بالا کے پیشِ نظر ان کی پیدائش کا زمانہ متذکرہ بالا 1100ھ کے قریب ہی کا ہوگا۔ پروفیسر سیدہ جعفر بھی اس ضمن میں کچھ اسی طرح کے خیالات کا اظہار کرتیں ہیں:

''گیان سروپ کا سنہ کتابت 1121ھ ہے اس لیے ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ نظم 1121ھ یا اس سے چند سال قبل کی تصنیف ہے۔ اگر 1121ھ میں بھی شاہ تراب نے گیان سروپ لکھی تھی اور اس میں وہ خود کو بالک بالا کہتے ہیں تو ہم

قیاس کر سکتے ہیں کہ وہ سنہ 1103ھ تا1105ھ میں پیدا ہوئے ہوں گے۔''

(''من سمجھاون''مرتبہ: پروفیسر سیدہ جعفر،ص:116)

عبدالستار دلوی اور پروفیسر سیدہ جعفر شاہ تراب کی نظم ''گیان سروپ'' کے مخطوطے کی کتابت کی بنا پر کہتے ہیں کہ شاہ تراب کی پیدائش 1100ھ یا اس کے آس پاس ہوئی ہوگی۔ مگر ڈاکٹر جمیل جالبی ان قیاس آرائیوں کو رد کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''شاہ تراب نے اپنے دیوان میں ایسے اشارے کیے ہیں جن سے ان کے حالات زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ شاہ تراب نے ایک غزل میں بتایا کہ ترتیب و فکر دیوان ایک سال میں مکمل ہوا۔ اور اس وقت سنہ 1170ھ اور 1756 تا 1757ھ تھا۔ ''گل خورشید'' اس کا مادۂ تاریخ ہے............اس حساب سے ان کا سال پیدائش 1130ھ ہوتا ہے۔ اس سے یہ بات بھی پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ ''گیان سروپ'' کے جس نسخے پر سنہ کتابت 1121ھ/1709ھ درج ہے وہ محض کتابت کی غلطی ہے۔''

(''تاریخِ ادب اردو'' جلد دوم، ص245-243)

عبدالستار دلوی پروفیسر سیدہ جعفر دونوں کی پیش کردہ تاریخ پیدائش کے مقابلے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی بتائی ہوئی تاریخ پیدائش صحیح معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ عبدالستار دلوی اور پروفیسر سیدہ جعفر کے قیاس کی بنیاد شاہ تراب کی نظم ''گیان سروپ'' کا وہ نسخہ ہے جو کاتب کا لکھا ہوا ہے۔ شاہ تراب کا قلمی نسخہ نہیں۔ اس کے برخلاف ڈاکٹر جمیل جالبی شاہ تراب کے جس دیوان کا ذکر کر رہے ہیں وہ دنیا میں دیوان تراب کا واحد معلوم قلمی نسخہ ہے۔

عبدالستار دلوی نے اپنے مقدمے میں آگے بتایا ہے کہ شاہ تراب، میراں جی شمس العشاق، برہان الدین جانم، امین الدین علی اعلیٰ اور پیر بادشاہ حسینی کے سلسلے میں مرید تھے اور تراب کے مرشد پیر بادشاہ حسینی نے ان

کے علم وعمل سے متاثر ہوکر 1150ھ میں انہیں خلیفہ مقرر کر کے رشد وہدایت کے لیے تر نامل روانہ کیا۔اس پورے واقعہ کا ذکر تراب نے اپنی مثنوی ''ظہور کلی'' میں کیا ہے۔اور خلافت ملنے کے بعد وہ ''گنج الاسرار'' کے نام سے بھی مشہور ہوئے۔

مقدمہ نگار کے مطابق تراب کی پانچ تصانیف ہیں جن کے نام اس طرح ہیں۔''گیان سروپ'' من سمجھاون،ظہور کلی،گلزار وحدت،اور گنج الاسرار۔لیکن وہ اس سلسلے میں آگے لکھتے ہیں:

> ''ان کے علاوہ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے اپنے مضمون ''شاہ تراب چشتی'' مطبوعہ آج کل ستمبر 1963ء میں تراب کی غزلوں کے علاوہ رسالہ تصوف' مثنوی مہ جبین و ملا اور آئینہ کثرت کا حوالہ بھی دیا ہے۔جو میرے علم میں نہیں تھیں۔''

(''من سمجھاون'' مرتبہ:عبدالستار دلوی،ص:9)

شاہ تراب خلافت ملنے کے بعد رشد وہدایت کی غرض سے تنجور گئے وہاں انہوں نے رام داس کی فاضل پوتھی کا ذکر سنا تو انہیں اس کا جواب لکھنے کا شوق ہوا:

تجاور میں جس دن ہوا آ کے داخل
سنیا رام داس کی تو پوتھی ہے فاضل

گیا سن خوشی سیئں دل کا کنول کھل
جواب اوس کا کہنے ہوا شوق کامل

عبدالستار دلوی نے آگے چل کر مقدمے میں مناچے شلوک کی اہمیت بتاتے ہوئے اس کے کچھ شلوک اور ان کا مطلب آسانی سے سمجھایا ہے۔جس کے بعد وہ من سمجھاون کی طرف آتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس نظم کا موضوع تصوف واخلاق ہے اور انداز بیانیہ ہے۔یہ نظم گیارہ حصوں میں منقسم ہے اور ترجیح بند کی ہیئت میں ہے۔

علاوہ بریں شاعر نے نظم کے ابتدائی حصے میں واحدۃ الوجود کو پیش کرنے کے بعد دوسرے حصے میں انسانی کمزوریوں، دنیاداری مثلاً مالی و دولت سے محبت، بیوی بچوں سے پیار، قومی و مذہبی اختلافات، حرص وہوس، دنیا کی بے ثباتی، ظاہرداری اور خود پرستی سے دور رہنے کی تلقین کی ہے۔ اور اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ خدا کی ذات تک پہنچنے کے لیے سچے رہبر اور رہنما کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور بغیر رہنما کے اپنی منزل مقصود تک پہنچنا محال ہے۔ جس کے بعد انہوں نے نظم کے کچھ بندوں کو مطلب بتاتے ہوئے سمجھایا ہے۔ اس کے بعد کی منزل میں انہوں نے مناچے شلوک اور من سمجھاون کے کچھ اشعار کی تقطیع کر کے دکھائی ہے۔ جس کا مقصد مراٹھی اور دکنی دونوں نظموں کی بحر کی یکسانیت کو دکھانا ہے۔

عبدالستار دلوی مقدمے کے اگلے مرحلے میں من سمجھاون کی لسانی خصوصیات کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔ ان کے خیال میں من سمجھاون کی زبان قریب دوسوسال پرانی ہے۔ نیز اس پر ہریانی اور پنجابی زبانوں کا اثر موجود ہے۔ اس میں بھی دیگر دکنی تصانیف کی طرح اکثر و بیشتر ایسے الفاظ مستعمل ہوتے ہیں جو اب متروک ہیں۔ تذکیروتانیث، جمع بنانے کے قاعدے، ضمائر، حروف ربط اور افعال وغیرہ تقریباً ویسے ہی ہیں جیسے قطب مشتری، سب رس، گلشن عشق من لگن اور طوطی نامہ وغیرہ دیگر تصانیف میں پائے جاتے ہیں۔

عبدالستار دلوی نے آگے مقدمے میں مخطوطے کی املائی خصوصیات بتائیں ہیں۔ یہ مخطوطہ جس اسے انہوں نے استفادہ کیا ہے وہ کتب خانہ مدرسہ جامع مسجد، بمبئی میں محفوظ ہے۔ اور دیوانِ علیم اللہ رموز الکابین اور پنچھی باجا کے ساتھ مجلد ہے۔ جس کے کاتب عظیم الدین ہیں۔ اس مخطوطے کی املائی خصوصیات کچھ اس طرح ہیں:

1۔ کاف اور گاف دونوں پر ایک ہی مرکز ہے۔ کوئی امتیاز نہیں ہے۔

2۔ جب بھی کاف اور گاف کسی لفظ کے آخر میں 'چ' کے ساتھ آئے ہیں تو اس کے ساتھ 'ہ' بڑھادی گئی ہے۔

3۔ یائے معروف اور یائے مجہول میں کوئی فرق نہیں ہے۔

4۔ یائے ہوز کی مختلف شکلوں کو بغیر کسی فرق کے تحریر کیا گیا ہے۔

5۔ حرف نفی ''نہ'' کو اکثر بعد کے لفظ سے جوڑ کر لکھا ہے۔

6۔ ''ڑ'' کے لیے کوئی امتیازی علامت نہیں ہے اور وہ ''ر'' کی طرح لکھی گئی ہے جیسے گھوڑا کو گھورا۔

7۔ ''ٹ'' پر ''ط'' کے بجائے چار نقطے ہیں۔

عبدالستار دلوی مقدمے میں من سمجھاون پر بہ حیثیت مجموعی اس طرح اپنی رائے دیتے ہیں:

> ''شاہ تراب نے مراٹھی تصنیف اور اس کی تمام جذبات کو اسلام تصوف کے سہارے پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے ہندو دیومالا کے ناگزیر حوالہ جات کو اپنی اس نظم میں جگہ دے کر اسلامی تصوف کی ہمہ گیری اور اپنی وسیع المشربی کے نمونے پیش کیے ہیں۔ شاہ تراب کی یہ ادبی کوشش اردو زبان وادب کی ابتدائی دور میں موجود قومی یکجہتی کا عملی ثبوت پیش کرتی ہے۔''

(''من سمجھاون'' مرتبہ: عبدالستار دلوی، ص:50)

عبدالستار دلوی کے طویل و پرمغز مقدمے کے بغور مطالعہ کے بعد شاہ تراب کی من سمجھاون کو پڑھنے اور سمجھنے میں مدد ملتی ہے کیوں کہ فاضل مقدمہ نگار نے اپنے سیر حاصل مقدمے میں اس قدیم دکنی نظم سے متعلقہ تمام پہلوؤں جیسے نظم کے شاعر کے حالاتِ زندگی، تصانیف، نظم کی اہمیت، اس کے موضوع اور بحر لسانی خصوصیات اور املائی خصوصیات کے ساتھ ساتھ مراٹھی میں اس نظم کے شاعر رام داس اور ان کی تعلیمات و نظم مناچے شلوک تک سب کا احاطہ بڑی خوبی کے ساتھ کیا ہے۔

4.1.4۔ اردو میں لسانیاتی تحقیق:

عبدالستار دلوی نے انتخاب کلام مصحفی، انتخاب کلام چکبست اور من سمجھاون کے بعد ''اردو میں لسانیاتی

تحقیق'' کوانگریزی کے جدید اصولوں کے ذریعہ 1971ء میں مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب کوکل اینڈ کمپنی اورینٹل بک سیلرس لینڈ پبلیشرز بمبئی سے شائع ہوئی ہے۔اس کی ضخامت 436 صفحات ہیں۔ اور انتساب کتاب مشہور لکھنوی شاعر انشاءاللہ خان انشاؔء کے نام کیا ہے۔ کیوں کہ ان کی ''دریائے لطافت'' اردو میں جدید لسانیاتی شعور کا نقطہ آغاز ہے اور اب تقریباً چوالیس سال بعد اس کتاب کی طلب کے زیر اثر اس کا دوسرا ایڈیشن سال 2015ء میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی سے شائع ہوا ہے۔جس کی قیمت -/193 روپے ہے۔

''اردو میں لسانیاتی تحقیق'' کا پیش لفظ پروفیسر مسعود حسین خان (مشہور ماہر لسانیات) کا لکھا ہوا ہے۔ اس پیش لفظ میں وہ زبان، پانینی کی قواعد، یونانیوں کی قواعد اور یورپی عالموں کی سنسکرت کی بازیافت کے توسط سے اپنے موجودہ ہندوستان میں لسانیات کی صورت حال بتاتے ہیں۔ وہ آگے کہتے ہیں کہ علم لسانیات پر انگریزی، فرانسیسی اور یورپی زبانوں میں جو مواد ملتا ہے اس کے مقابلے میں اردو میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بہت کم ہے۔جس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اردو علماء کی ہند آریائی زبانوں اور بالخصوص سنسکرت کی معلومات بالکل واجبی رہی ہے۔جس کی بنا پر وہ لسانیات یا ہند آریائی زبانوں پر کوئی تاریخی کام نہیں کر سکے۔ وہ پیش لفظ میں آگے چل کر یہ بھی بتاتے ہیں کہ خان آرزؔو پہلے عالم زبان ہیں جنھوں نے فارسی اور سنسکرت کے قریبی تعلق پر ولیم جونز سے پہلے اشارہ کیا تھا۔اور انشاؔء پہلے شاعر عالم ہیں جنھوں نے ''دریائے لطافت'' میں قواعد کے اہم مسائل کے ساتھ ساتھ شہر دہلی کی بولیوں کے اختلافات کو بھی بیان کیا ہے لیکن یہ دونوں ہی کام فارسی میں ہیں۔ اسی لیے اردو کی پہلی قواعد، اردو میں لکھنے کا سہرا سرسید کے سر جاتا ہے۔ جنھوں نے 1840ء میں ''قواعد صرف نحو زبان اردو'' تصنیف کی ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خان نے اس مختصر سے پیش لفظ میں زبان سے ابتدا کی اور ہندوستان میں اب تک کی لسانی تاریخ کو بڑے جامع انداز میں اور سہل زبان میں بیان کیا ہے۔

اردو میں لسانیاتی تحقیق میں پیش لفظ کے بعد عبدالستار دلوی کا پر مغز مقدمہ ہے جس میں انہوں نے ابتدائی سطور میں ہی زبان کی ترقی اور ادب کی ترقی میں فرق کو واضح کرتے ہوئے یوں لکھا ہے:

''کسی بھی ادب کی ترقی سے پہلے زبان کی بنیادی اہمیت کونظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ جب تک زبان ترقی نہ کرے تب تک ہم ادب کی ترقی سے مطمئن نہیں ہوسکتے۔ یہاں تک کہ زبان کے حال و ماضی سے متعلق گونا گوں قسم کے شکوک وشبہات میں گرفتار ہوجاتے ہیں۔ ہمارے یہاں ایک بڑا طبقہ ادب کی ترقی کو زبان کی ترقی سے تعبیر کرتا ہے۔مگر حقیقتاً ادب کی ترقی سے زبان کی ترقی کا جو بھی تعلق ہے وہ اتنا معمولی ہے کہ اسے تعلق کے نہ ہونے سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔''   (''اردو میں لسانیاتی تحقیق''ص:xx)

عبدالستار دلوی کے مطابق اردو ادب اب تک ترقی وارتقا کی کئی منزلیں طے کر چکا ہے مگر اردو زبان کی ترقی میں ہمارے ماہرین لسانیات کو ابھی اہم کردار ادا کرنا باقی ہے۔ اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جس طرح شاعر، ادیب، نقاد اور افسانہ نگار کا کام ادب کو ترقی دینا ہے وہیں پر ماہر لسانیات Linguist کا کام زبان کو فروغ دینا ہے۔

عبدالستار دلوی مقدمے میں اردو میں لسانی مطالعات کا ذکر کرتے ہوئے انشآء کی ''دریائے لطافت'' کو جدید لسانی اصولوں کے پیش نظر اردو کی بولیوں کا جائزہ قرار دیتے ہیں۔ اور تھوڑا آگے بڑھ کر محمد حسین آزؔاد کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اردو کی ابتداء اور ترقی سے متعلق اپنی استعداد بھر سائنسی لحاظ سے قلم اٹھایا ہے جس کی وجہ سے مقدمہ آب حیات نہ صرف آب حیات کا مقدمہ ہے بلکہ وہ تو اردو زبان کے پورے لسانی سرمایے کے لیے مقدمہ کا کام کرتا ہے۔ یہاں رک کر یہ جان لینا ضروری ہے کہ سائنسی مطالعہ سے ان کی کیا مراد ہے؟ دراصل لسانیات کو انگریزی میں ''Linguistis'' کہتے ہیں اور انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں لسانیات کا مطلب ''زبان کی سائنس'' دیا گیا ہے۔جس کے مطابق انگریزی میں Linguistics کی تعریف یوں کی جاتی ہے:

''Linguistics is a Scienticic study of human Language''

لسانیات زبان کا سائنسی مطالعہ ہے۔اب اس موقع پر ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ سائنسی مطالعہ کس طرح کیا جاتا ہے؟ تو یہاں بس اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ سائنسی مطالعہ میں مشاہدہ تجربہ،مفروضہ اور دلائل، یہ چار عناصر کارفرما ہوتے ہیں۔

عبدالستار دلوی مقدمے میں آگے افسوس ظاہر کرتے ہیں کہ انشآء اور آرزؔو کے بعد زبان سے متعلق سائنسی تحقیق اردو میں معدوم ہوگئی،لیکن بعد کے زمانے میں پنڈت برج موہن دتریا کیفی،مولانا وحیدالدین سلیم، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، ڈاکٹر غلام محی الدین قادری زوؔر، پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر مسعود حسین خان، پروفیسر گیان چند جین اور پروفیسر گوپی چند نارنگ کی خدمات کا اعتراف کرنا بھی ضروری ہے۔مگر ان متذکر بالا حضرات کی خدمات کے باوجود ابھی اس میدان میں بہت کچھ کرنا باقی ہے۔اور اس سلسلے میں ماہر لسانیات Linguist کے سمت و رفتار کا بھی تعین کر دیتے ہیں جو اس طرح ہیں:

1۔ اردو کا صوتی تجزیہ

2۔ اردو کا صرفی ونحوی مطالعہ

3۔ اردو کی مختلف بولیوں کے جائزے

4۔ اردو زبان کی تدریس کا مسئلہ

5۔ اردو کے سماجی وثقافتی پہلو

6۔ ذولسانیات اور اردو

7۔ اردو لغت کی تدوین

اس کے بعد وہ اس سمتوں میں ماہر لسانیات کے کام کرنے کی اہمیت‘ غرض وغایت اور اس سے زبان کو ہونے والے فروغ وترقی سے متعلق تفصیل اظہار رائے کرتے ہیں۔

عبدالستار دلوی مقدمے کے اگلے مراحل میں لسانی تحقیق کے دو پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہیں۔جس کا

ایک پہلوتو لسانیات کا سرعت سے ترقی کرنے والے جدید علم کی حیثیت سے مطالعہ ہے۔تا کہ اس کے ذریعے اردو میں علم زبان کے طالب علم کے لیے زیادہ سے زیادہ مواد حاصل ہو۔دوسرا پہلو ہند آریائی گروہ کی تاریخی اہمیت کے ساتھ ساتھ اردو کا دیگر جدید ہند آریائی زبانوں کے تفصیلی مطالعے تا کہ اردو کے جدید ہند آریائی زبانوں سے لسانیاتی رشتے کو معلوم کیا جا سکے۔

عبدالستار دلوی نے اس کے بعد کے مرحلے میں انیسویں صدی کے ربع اول میں علم زبان کی سائنسی حیثیت تسلیم کر لینے کے بعد اس علم نے جو ترقی کی اس کی تفصیل بیان کی ہے۔

عبدالستار دلوی مقدمے میں آگے یونی ورسٹیوں میں لکھے جا رہے تحقیقی مقالوں پر یوں اظہار رائے کرتے ہیں:

> ''اردو میں اچھے تحقیقی مقالے لکھے جا رہے ہیں یہ تحقیقی مقالات کچھ اس نوعیت کے ہوتے ہیں جیسے اردو غزل کا ارتقاء، اردو تنقید کا ارتقاء، اردو افسانے یا ناول کا ارتقاء جن میں ادب کی مختلف اصناف کی تاریخ اور ترقی کا جائزہ لیا جاتا ہے۔کچھ مقالے ادبی شخصیتوں پر مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتے ہیں۔میں موضوع کے اعتبار سے بھی مذکورہ بالا موضوعات پر کام کرنے کا مخالف نہیں ہوں۔ادب میں ان کی بڑی اہمیت ہے۔لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے تحقیقی اداروں اور یونی ورسٹیوں سے زبان کے سلسلے میں بھی تحقیقات کروائیں۔تحقیقی کام کرنے والوں میں کم از کم پچاس فیصد اساتذہ اور طلبہ کو لسانیاتی تحقیق کا کام اپنے ذمے لینا ہوگا۔'' (''اردو میں لسانیاتی تحقیق''، ص:xxiii تا xxiv)

عبدالستار دلوی کے متذکرہ بالا خیال سے ظاہر ہو رہا ہے کہ یونی ورسٹیوں میں اگر اساتذہ اور ریسرچ اسکالرس کی نصف تعداد بھی لسانی تحقیق کو موضوعِ تحقیق بنائے تو لسانیاتی تحقیق کے مواد میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا۔ اسی سلسلے میں آگے وہ یہ تجویز بھی پیش کرتے ہیں:

''اگر ہم اپنی یونی ورسٹیوں کے ایم اے (اردو) کے نصاب میں جدید لسانیات کی تعلیم لازمی کر دیں اور اس کے کم از کم دو پرچے ضرور ہوں۔ نصاب کی اس ترتیب میں زبان کی تاریخ، مختلف نظریے، زبان کا ارتقاء (Philogy) اور قواعد سے متعلق جو پرچہ عام طور سے ہماری یونی ورسٹیوں میں رائج ہے اسے ختم کیا جا سکتا ہے۔ وہی سارے موضوعات لازمی لسانیات کے اور تاریخ ادب اردو کے پرچے میں بہت خوب صورتی کے ساتھ شامل کیے جا سکتے ہیں۔ اس سے ہمارے طلبہ میں لسانیاتی تحقیق کی اہمیت کا احساس پیدا ہوگا اور اردو زبان کے فروغ میں عملی طور پر وہ حصہ بھی لے سکیں گے۔''

(''اردو میں لسانیاتی تحقیق''، ص:xxiv)

ظاہر ہے کہ اگر یونی ورسٹیوں میں اس تجویز پر عمل کیا جائے تو اس سے طلبہ میں جہاں لسانیاتی تحقیق سے آگہی کے ساتھ ساتھ لسانی مطالعات کا ذوق وشوق بڑھے گا وہیں دوسری طرف لسانیاتی تحقیق کے مواد میں بھی اضافہ ہوگا۔

عبدالستار دلوی اس کتاب کو ترتیب دینے سے متعلق بتاتے ہیں کہ انھوں نے مختلف مسائل اور کتابوں میں موجود لسانی مضامین کو یکجا کر کے شائع کیا ہے۔ غالباً یہ اس طرح کی پہلی لسانی کاوش ہے۔ اور وہ پر امید ہیں کہ اردو لسانیات سے متعلق بکھرے ہوئے مضامین کا یہ مجموعہ اردو زبان کے اساتذہ وطلبہ میں لسانی موضوعات پر کام کرنے کا شوق دے گا۔ اور اس مجموعے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ایک عام قاری اردو زبان کے طلبہ کے لیے اردو لسانیات سے متعلق بیش تر بنیادی معلومات اس میں شامل ہیں۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں پروفیسر مسعود حسین خان اس کی اہمیت کے متعلق لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر دلوی نے لسانیات سے متعلق منتشر مضامین کا یہ انتخاب کر کے وقت کے ایک اہم تقاضے کو پورا کیا ہے۔ حرف وصوت، رسم خطِ زبان اور بولی، لفظ ومعنی

اور صوت وشعر کے ابواب کے تحت انہوں نے اردو لسانیات سے متعلق وہ سب کچھ یکجا کر دیا ہے جو علمی لحاظ سے لائق اعتنا ہے اور لسانیات کا یہ سرمایہ تحقیقی اعتبار سے ایسا نہیں کہ ہم اس پر فخر کر سکیں۔ تاہم اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ لسانیات کے بارے میں یہ پہلی کاوش ہیں۔''

(''اردو میں لسانیاتی تحقیق''، ص:xxii)

عبدالستار دلوی اور پروفیسر مسعود حسین خان کے خیالات سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اس کتاب سے اردو میں لسانیاتی تحقیق میں کوئی نیا اضافہ تو نہیں ہوتا لیکن اس منتشر مضامین کے یکجا ہونے سے اساتذہ اور طلبہ کے لیے مفید مطلب ہوگا۔ جس کی وجہ سے اساتذہ اور طلبہ دونوں ہی علم لسانیات اور لسانی تحقیق سے ذوق وشوق حاصل کریں گے۔

''اردو میں لسانیاتی تحقیق'' میں کل 29 مضامین شامل ہیں۔ جن کو چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اور یہاں پہلا باب ''حرف وصوت'' کے عنوان سے ہے۔ جس میں سب سے پہلے عبدالستار دلوی کے ابتدائیہ کے بعد چھ مضامین اس طرح ہیں:

1۔ اردو صوتیات کا خاکہ : ڈاکٹر مسعود حسین خان

2۔ ہمزہ کیوں؟ : ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

3۔ اردو میں دخیل آوازیں : ڈاکٹر عبدالستار دلوی

4۔ اردو حرف تہجی کی صوتیاتی ترتیب : ڈاکٹر مسعود حسین خان

5۔ صوتی تغیر وتبدل : ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ

6۔ اردو املا : ڈاکٹر عبدالستار صدیقی

اس کے برخلاف دوسرا باب ''زبان اور بولی'' کی سرخی کے تحت ہے جس میں سب سے پہلے مرتب کا

لکھا ہوا ابتدائیہ ہے اور اس کے بعد چھ مختلف مضامین اس طرح ہیں:

1۔ زبان ماہیت آغاز اور تشکیل	:	ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ
2۔ دکنی اردو	:	پروفیسر عبدالقادر سروری
3۔ آغاز نطق سے اردو تک	:	ڈاکٹر گیان چند جین
4۔ عورتوں کی زبان	:	ڈاکٹر مولوی عبدالحق
5۔ میسور کی دکنی اردو	:	ڈاکٹر عبدالغفار شکیل
6۔ زبان اور بولی	:	ڈاکٹر گیان چند جین

اسی طرح تیسرے باب کا عنوان ''لفظ و معنی'' ہے جس میں سب سے پہلے ان کا لکھا ہوا ابتدائیہ ہے اور اس کے بعد ''لفظ و معنی'' سے متعلق پانچ مضامین شامل ہیں جو یہ ہیں:

1۔ اردو صرف و نحو کا خاکہ	:	خواجہ عبدالرؤف عشرت
2۔ لفظ اور معنی	:	پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی
3۔ اردو کے مرکب الفاظ	:	ڈاکٹر شوکت سبزواری
4۔ بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق	:	علامہ سید سلیمان ندوی
5۔ ''نے'' کی سرگزشت	:	ڈاکٹر شوکت سبزواری

مجموعے کا چوتھا باب ''اردو زبان۔ افکار و مسائل'' کے تحت ہے جس میں انہوں نے ابتدائیہ کے بعد پانچ مضامین شامل کیے ہیں۔

1۔ اردو زبان کے مطالعات میں لسانیات کی اہمیت	:	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
2۔ زبان اور تہذیب	:	پروفیسر احتشام حسین

3۔ اردو کے لیے علمی اصطلاحات کا مسئلہ : مولانا وحید الدین سلیم

4۔ اردو میں تلفظ کا مسئلہ : ڈاکٹر عبدالستار دلوی

5۔ صحت زبان کے لسانیاتی پہلو : پروفیسر احتشام حسین

اور پانچواں باب ''صوت وشعر'' کے نام سے درج ہے جس میں مرتب کے ابتدائیے کے بعد تین مضامین یوں ہیں:

1۔ مطالعہ شاعر: صوتیاتی نقطہ نظر سے : ڈاکٹر مسعود حسین خان

2۔ اصوات اور شاعری : ڈاکٹر مغنی تبسم

3۔ کلام غالبؔ کے قوافی وردیف کا صوتی آہنگ : ڈاکٹر مسعود حسین خان

اور جہاں تک آخری باب کا تعلق ہے وہ رسم خط کے عنوان سے ہے جس کے ذیل میں ابتدائیہ کے بعد چار مضامین ہیں:

1۔ اردو رسم خط، تاریخ اور فن کے آئینے میں : محمد اسحاق صدیقی

2۔ اردو رسم خط کی علمی حیثیت : پرفیسر مسعود حسین ادیب

3۔ اصلاح اردو، اور رسم الخط : سر رضا علی

4۔ اردو رسم الخط: علمی تہذیبی نقطہ نظر سے : پروفیسر آل احمد سرور

عبدالستار دلوی کا مبسوط مقدمہ مع تجاویز اور اس کے بعد جملہ مضامین کے ساتھ ساتھ ان کی درجہ بندی سے ظاہر ہوتا ہے کہ آج سے تقریباً چالیس پینتالیس سال پہلے آپ کو نہ صرف لسانیات سے گہری واقفیت تھی بلکہ اس بات کا افسوس بھی تھا کہ ہماری اردو زبان میں لسانیاتی تحقیق کی رفتار کس قدر سست اور ماند ہے جس کو تیز کرنے کے لیے آپ نے تجاویز بھی پیش کیں ہیں۔ اور جہاں تک انتخاب مضامین اور ان کی درجہ بندی کا تعلق ہے وہ بناتا

ہے کہ آپ نے ان ہی مضامین کا انتخاب کیا ہے جو حوالہ جاتی ہے۔اوران کی درجہ بندی بھی لسانی اعتبار سے کی ہے علاوہ ازیں انہوں نے ہر درجے کی ابتدأ میں ابتدائیہ کے عنوان سے جو مضامین لکھے ہیں وہ نہایت ہی معلوماتی ہیں اوران کوان مضامین کا پس منظر کہا جا سکتا ہے۔

مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ آپ کے مرتب کردہ اس مجموعے سے لسانیاتی تحقیق میں تو کوئی اضافہ نہیں ہوا لیکن علم لسانیات یا لسانی تحقیق کرنے والے اساتذہ اور طلبہ کے لیے یہ مجموعہ کسی نعمت سے کم نہیں۔

4.1.5۔رانی کیتکی کی کہانی:

عبدالستار دلوی نے انشاءاللہ خان انشآء کی رانی کیتکی کی کہانی کو ہندی (دیوناگری اوراردو رسم الخط میں مرتب کر کے اگست 1974ء میں مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر سے شائع کیا ہے۔ جس کی ضخامت 218 صفحات اور قیمت 15 روپے ہیں۔

رانی کیتکی کی کہانی کی ابتدأ عبدالستار دلوی کے مقدمے سے ہوتی ہے اور مقدمے کی ابتدأ میں ہندوستانی زبان وادب کے تاریخی پس منظر سے ہوتی ہے۔جس میں انہوں نے مسلمانوں کے ہندوستان آنے دیسی بدیسی زبانوں کے ملاپ اور اس ملاپ کے مختلف ادوار میں مختلف ناموں کو بیان کرتے ہوئے ایک مخصوص نام ''ہندوستان'' پرلا کرختم کر دیا ہے۔

عبدالستار دلوی مقدمے میں آگے فورٹ ولیم کالج کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے نثری تحریک کے تحت تصنیف، تالیف اور ترجمہ ہونے والی نثری داستانیں، میرامن کی باغ و بہار، حیدر بخش حیدری کی آرائش محفل اور طوطا کہانی، خلیل علی خان کی داستان امیر حمزہ، مظہر علی خان ولا اور للولال جی کی بیتال پچیس، کاظم علی جوان اور للولال جی کی سنگھاسن بتیسی اور بہادر علی حسینی کی نثر بے نظیر کا ذکر کرتے ہوئے ان کو 1801ء سے 1804ء کے درمیان تصنیف ہونے والی داستانیں بتاتے ہیں۔اور آگے چل کر یہ بھی کہتے ہیں کہ فورٹ ولیم کالج کے باہر جو دو داستانیں لکھی گئیں ان میں پہلی تحسین کی نوطرز مرصع اور دوسری انشآء کی رانی کیتکی کی کہانی ہے اور ان کا زمانہ تصنیف

1808ء ہے۔

عبدالستار دلوی مقدمے میں فورٹ ولیم کالج کی خدمات کا جائزہ لینے کے لیےفورٹ ولیم کالج کے باہر اس دور میں ہونے والی ہندوستانی ادب کی ترقی پر تفصیلی گفتگو کرتے ہیں جس میں انہوں نے بتایا کہ فورٹ ولیم کالج کی یہ نثری تحریک کم ازکم بیس سال چلی اوراس دوران تقریباً پچاس کتابیں ''ہندوستانی'' زبان میں لکھی یا ترجمہ کی گئیں اور دوسری طرف یعنی فورٹ ولیم کالج کے باہر بھی کچھ ادیبوں ''ہندوستانی'' زبان میں داستانیں لکھیں جن میں محمد بخش مہجور کی نورتن، رجب علی بیگ کی فسانہ عجائب، نیم چند کھتری کی گل صنوبر اور انشاء کی رانی کیتکی کی کہانی بہت مشہور ہوئیں اوراس سلسلے میں غالبؔ کے خطوط کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔

عبدالستار دلوی کے خیال میں اس دور میں جتنی کتابیں لکھی گئیں ان میں سے صرف باغ و بہار اور گنج خوبی میں ادبیت ملتی ہے اور کسی میں نہیں اور دوسری خاص بات یہ ہے کہ نہال چند لاہوری کی مذہب عشق کے علاوہ باقی سب داستانیں زبان ''ہندوستانی''، میں لکھی گئیں ہیں۔

عبدالستار دلوی اپنے مقدمے میں زبان ہندوستان فورٹ ولیم کالج کی خدمات فورٹ ولیم کالج کے باہر ہندوستانی ادب کی ترقی کو پس منظر کے طور پر بیان کرنے کے بعد انشاء تک پہنچتے ہیں۔اور کہتے ہیں کہ انشآء کا پورا نام انشاءاللہ خان اور انشآء تخلص۔ان کے والد کا نام میر ماشاءاللہ اور تخلص مصدؔر۔آپ کا شمار دلی کے نامور حکیموں میں ہوتا تھا۔دراصل آپ نے دوشادیاں کیں۔جہاں آپ کی پہلی بیوی عجیب النساءبیگم نواب بنگال کی بیٹی تھیں جن سے مسیح اللہ خان بہادر پیدا ہوئے جو اطہرؔ تخلص کرتے تھے۔وہیں انشآء آپ کی دوسری بیگم سے مرشدآباد میں نواب سراج الدولہ کے زمانے میں پید ہوئے۔انہوں نے پروفیسر اسلم مرزا کی کتاب ''انشاءاللہ خان انشآء: عہد اور فن'' کے حوالے سے انشاء کی تاریخ پیدائش 1756ء بتائی ہے۔مرشدآباد کے سیاسی حالات کو دیکھتے ہوئے میر ماشاءاللہ نو سال کے انشآء کو ساتھ لے کر فیض آباد آ گئے اوراس دور میں فیض آباد اودھ کے نواب شجاع الدولہ کا پایہ تخت تھا۔یہاں میر ماشاءاللہ کا تعلق دربار سے رہا۔اسی وجہ سے انشآء کی تربیت بھی دربار کے سائے میں ہوئی۔

یہاں انشاء نے منطق، شاعری اور سپہ گری کی تعلیم پائی اردو کے علاوہ ہندی، عربی، فارسی اور مراٹھی زبانوں پر عبور حاصل کیا۔ اور جلد ہی اپنی تیز ذہانت کی وجہ سے نواب کے ساتھیوں میں شامل ہو گئے۔ لیکن نواب شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد انشاؔء مرزا نجف کے لشکر میں شامل ہوئے اور نواب کے ساتھ ہی دہلی منتقل ہو گئے۔ لیکن اس وقت دلی کی محفلیں ویران ہو چکی تھیں۔ یہاں کے ادیب و شاعر ہجرت کر کے دوسرے خوش حال درباروں سے وابستہ ہو رہے تھے۔ ایسے میں میر ماشاءاللہ نے فرض آباد کی راہ لی مگر انشاؔء 1797ء میں لکھنو آئے اور یکے بعد دیگر نواب الماس علی خان، نواب مرزا شکوہ اور نواب سعادت علی خان کے ساتھیوں میں رہے۔ چوں کہ دلی کی محفلیں ویران ہو چکی تھیں اسی لیے وہاں کے شعرا لکھنو کی محفلوں کی زینت بڑھا رہے تھے ان شعرا میں رنگیںؔ، راغبؔ اور جرأتؔ کے نام دیے جا سکتے ہیں۔ اس دربار میں انشاؔء اور رنگیںؔ کا بڑا یارانہ رہا۔ اور ان دونوں کی نواب مرزا شکوہ سے خوب صحبتیں رہیں۔ آصف الدولہ کے انتقال کے بعد ان کے بھائی نواب سعادت علی خان تخت نشین ہوئے تو انشاؔء کی زندگی کا سب سے خوش حال دور تھا۔ انشاء نے اپنی دو بڑے نثری شہکار تصانیف ''رانی کیتکی کی کہانی'' اور ''دریائے لطافت'' اسی دور میں لکھیں۔ انشاؔء اپنی عمر کے آخر دنوں میں نواب سعادت علی خان کے دربار سے الگ ہو گئے۔ چنانچہ ان کی اولاد میں بھی کوئی زندہ نہ رہا۔ اور تو اور دوستوں نے بھی منہ پھیر لیا تھا جس کی وجہ سے انشاؔء غمگین رہنے لگے تھے۔ مقدمہ نگار عبدالستار دلوی نے مقدمے میں اسی موقع پر آبِ حیات سے انشاء کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ لیکن بعد میں اس بات کی وضاحت بھی کر دی ہے کہ تاریخی اعتبار سے یہ واقعہ صحیح نہیں ہے۔ انشاؔء نے پینسٹھ (65) سال کی عمر میں 1818 میں انتقال کیا۔ اور آپ کی معتبر تاریخ وفات آپ کے شاگرد بسنت سنگھ نشاطؔ کی 1633ھ/1818ء ہے۔

انشاؔء کی شخصیت میں کئی کمالاتِ علم و فن تھے جس کا احساس خود انشاؔء کو بھی تھا۔ اور اسی احساس نے انشاؔء کو دلی اور لکھنو دونوں جگہ ادبی لڑائیوں یا ادبی معرکوں کے لیے آمادہ کیا۔ دلی کے ادبی معرکوں میں انشاء و مرزا عظیم بیگ، انشاء و فائق، انشاء و مرزا جان طپشؔ اور لکھنو کے ادبی معرکوں میں انشاء و مصحفیؔ اور انشاؔء و مرزا قتیلؔ مشہور ہیں۔

عبدالستار دلوی مقدمے میں انشاء کے سوانحی کوائف پر تفصیلی گفتگو کرنے کے بعد اب انشآء کی نثری تصانیف کی خوبیوں پر نگاہیں مرکوز کرتے یں۔اوراس سلسلے کی ابتداء میں کہتے ہیں کہ انشآء کا شمار اردو کے اساتذہ سخن میں ہوتا ہے کیوں کہ ان کی شاعری کا درجہ اردو زبان وادب میں کافی بلند تھا۔واقعہ یہ ہے کہ انشآء لکھنو اسکول کے مثلث یعنی انشآء ناسخ اور مصحفی کے مثلث میں واحد شاعر ہیں جن کی نثر بہ حیثیت گرامر نویس اور کہانی کار دونوں ہی بلند درجے کی ہے اس پس منظر میں وہ انشاء کی تصانیف پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے ان کی خوبیوں اور خامیوں کو بیان کرتے ہیں۔

دریائے لطافت:

فاضل مقدمہ نگار دریائے لطافت کے ذیل میں کہتے ہیں کہ تقریباً ہر زبان کی خاص بات یہی ہوتی ہے کہ اس مخصوص زبان کی گرامر غیر اہل زبان ہی لکھتے ہیں اور اہل زبان کی توجہ اس طرف ذرا دیر سے ہی مرکوز ہوتی ہے۔لہٰذا اردو کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔اردو کے یورپی گرامر نویسیوں میں شیکسپیر، فاربس اور پلیٹس کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔دراصل اردو کی قواعد، معانی و بیان اور عروض پر کسی ہندوستانی کے قلم سے لکھی جانے والی پہلی کتاب انشآء اور قتیؔل کی ''دریائے لطافت'' ہے۔آپ دریائے لطافت کی خوبیاں بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اردو سے متعلق اس انداز اور اس پائے کی کتاب کسی ہندوستانی کے قلم سے آج تک نہ لکھی جاسکی۔واضح رہے کہ دریائے لطافت میں زبان اس کے مختلف لہجے، اس کی صرف ونحو سے متعلق ابتدائی حصہ انشاء کے قلم کا نتیجہ ہے وہیں دوسرا حصہ جو معانی، عروض اور قوافی سے متعلق ہے وہ مرزا محمد حسن قتیؔل کا لکھا ہوا ہے اور چوں کہ یہ کتاب انہوں نے نواب سعادت علی خان کے دربار سے وابستہ ہوکر لکھی تھی تو انہوں نے اس کتاب کے پہلے حصے کے لیے دو نام ارشاد ناظمی، اور بحر سعادت تجویز کیے تھے اور ان کے علاوہ مرزا قتیل نے دوسرے حصے کے لیے ''دریائے لطافت'' اور ''حقیقت اردو'' کے نام تجویز کیے تھے۔لیکن اس کتاب کے دونوں ہی حصے ''دریائے لطافت'' کے نام سے مقبول ہوئے۔ دریائے لطافت فارسی میں 1808ء میں مکمل ہوچکی تھی اور یہ پہلی بار 1850ء میں مرشدآباد سے شائع ہوئی۔اس

کا دوسرا ایڈیشن مولوی عبدالحق نے 1916ء میں انجمن ترقی اردو سے شائع کیا۔ اور اس کا اردو ترجمہ جو پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی نے کیا تھا وہ پہلی مرتبہ 1935ء میں دوسری مرتبہ 1939ء میں اور تیسری مرتبہ 1988ء میں انجمن ہی سے شائع ہوا ہے۔ عبدالستار دلوی دریائے لطافت کی اہمیت ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''اس کتاب میں انشآ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ''اردو'' کی آزادانہ حیثیت کو تسلیم کرنے پر زور دیا اور اس کی صوتی، صرفی و نحوی تراکیب کو ہندوستانیت سے قریب لانے کی پہلی شعوری اور سائنسی کوششیں کی اور اس کی فطری ساخت کے پیش نظر اصول مرتب کیے اور بول چال کی زبان کی اہمیت پر زور دیا۔ یہ کتاب جدید لسانیات کی رو سے اردو کا '' کلاسک'' ہے۔''

(''رانی کیتکی کی کہانی''، مرتبہ: عبدالستار دلوی، ص:28)

انشآء نے مغربی علم و ادب سے ناواقف ہوتے ہوئے بھی دریائے لطافت تصنیف کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انشاء اپنے دور میں کتنے دقت پسند اور سائنٹفک خیالات کے مالک تھے۔

لطائف السعادت:

عبدالستار دلوی لطائف السعادت کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ انشآء نے دریائے لطافت کے زمانہ تصنیف ہی میں نواب سعادت علی خان اور ان کے ساتھیوں کے لطائف جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کتاب میں جملہ پچپن لطیفے ہیں۔ بقول پروفیسر مختارالدین احمد اس کتاب کا صرف ایک ہی قلمی نسخہ معلوم ہوسکا ہے۔ جو برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ہے۔ اور 1950ء میں جب وہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری میں ناظم شعبہ مخطوطات تھے تب اسی نسخے کا عکس لندن سے منگوایا تھا اور اس عکس کی نقل ڈاکٹر قاضی عبدالودود کی فرمائش پر انہیں بھیجی تھی تو انہوں نے اس نقل کی بنیاد پر سب سے پہلے ایک تعارفی مضمون ''رسالہ معاصر'' پٹنہ میں شائع کیا۔ اور 1955ء میں ایک اچھا ترجمہ، حواشی اور مبسوط مقدمے کے ساتھ ڈاکٹر آمنہ خاتون نے بنگلور سے شائع کیا ہے۔ جس میں

انہوں نے دائیں صفحے پر فارسی کا اصل متن اور بائیں صفحے پر اردو ترجمہ دیا ہے جس کی وجہ سے کتاب کی ضخامت 180 صفحات ہیں ورنہ صرف پچپن 55 لطائف کی ضخامت تو بہت کم ہوتی۔

سلکِ گوہر:

عبدالستار دلوی کی نظر میں ''سلکِ گوہر'' انشآء کی جودت طبع اور زبان پر قدرت کا نمونہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انشآء نے سلکِ گوہر میں بے نقطہ نثری داستان لکھی ہے۔ چنانچہ انشاء اس سے پہلے ہی فارسی میں بے نقطہ دیوان اور چند قرآنی آیات لکھ چکے تھے تو انہوں نے اب اس تجربے کو اردو نثر میں آزمایا۔ مولانا امتیاز علی عرشی کو اس کتاب کا مخطوطہ رضا لائبریری رام پور میں دستیاب ہوا تو انہوں نے اسے مرتب کر کے 1945ء میں اسسٹینٹ پریس رام پور سے شائع کیا ہے۔ جس کو بعد میں انتظار حسین نے ''انشآء کی دو کہانیوں'' کے عنوان سے 1971ء میں مرتب کر کے مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع کیا ہے۔

عبدالستار دلوی مقدمے میں آگے لکھتے ہیں کہ انشآء بے نقطہ نثری داستان لکھنے میں کامیاب تو ہو گئے مگر اس بے نقطہ کی قید سے ان کی عبارت بے کیف، بے جان اور ابلاغ کی کیفیت بھی مجروح ہوگئی ہے۔ انشآء کی اس آزمائش سے متعلق ایم۔ حبیب خان یوں اپنی رائے دیتے ہیں:

> ''اس کہانی میں انشاء کا قلم رک رک کر چلتا ہے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے لکھتے لکھتے سوچ رہے ہوں۔ کہانی میں جگہ جگہ تکرار ہونے سے پڑھتے وقت دماغ پر بار گزرتا ہے۔ باوجود اس بے ربطی کے جو خوبی ہمیں نظر آتی ہے وہ آوازوں کی ہم آہنگی ہے۔ اسی طرح بے نقطہ نثر کا یہ نظام آوازوں کے ساتھ عجیب کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔'' (انشاءاللہ خان انشآء، ص:79)

سلکِ گوہر میں جہاں بے نقطہ کی قید نے چند خامیوں کو جنم دیا ہے، وہیں پر چند خوبیوں کو بھی اس میں شامل کر دیا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی انشآء اپنے اس تجربہ کی وجہ سے لائق صد آفرین ہیں۔

ترکی روزنامچہ:

انشاؔ کے ترکی روزنامچے کا ایک قلمی نسخہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے، جو نامکمل ہے۔ اور اس میں 18 جمادی الاول 1223ھ سے لے کر 24 جمادی الثانی تک کے حالات درج ہیں۔ یہ روزنامچہ 36 دن کے حالات پر مشتمل ہے۔ واضح رہے کہ اس نسخے میں کل 24 اوراق ہیں جن کا سائز 21x15 سینٹی میٹر ہے۔ کاغذ کشمیری ہے، جلد نیلے رنگ کی ہے، اور عنوانات سرخ روشنائی سے لکھے ہوئے ہیں اور اگر املائی خصوصیات دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ انشاء نے 'کاف' اور 'گاف' میں کوئی امتیاز نہیں رکھا ہے اس نسخے پر سب سے پہلے امتیاز علی عرشی نے ایک تعارفی مضمون لکھ کر رسالہ ''نیا دور'' لکھنو میں اپریل 1967ء میں شائع کیا اس کے بعد 1980ء میں ڈاکٹر سید نعیم الدین نے اسے مرتب کر کے ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی سے شائع کر دیا ہے۔

رانی کیتکی کی کہانی:

عبدالستار دلوی نے اپنے مقدمے میں انشاؔ کی رانی کیتکی کی کہانی کو ان کی جودت طبع اور زبان میں تجربہ کاری کا بڑی حد تک کامیاب نمونہ بتاتے ہیں۔ انہوں نے اس داستان کا زمانہ تصنیف مولانا امتیاز علی عرشی کے حوالے سے 1808ء لکھا ہے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر سید سلیمان حسین نے اپنی مرتبہ رانی کیتکی میں اور جمیل جالبی نے تاریخ ادب اردو میں یہی زمانہ تصنیف بتایا ہے۔ مگر عابد پیشاوری نے اپنی کتاب ''انشاءاللہ خان انشاؔ'' میں اس سلسلے میں کافی طویل بحث کی ہے۔ جس میں وہ ہندی ادیبوں کے قیاس سے کہتے ہیں:

1۔ ڈاکٹر چھوی ناتھ ترپاٹھی	زمانہ تصنیف	1803ء
2۔ ڈاکٹر پرمانند شری واستوا	زمانہ تصنیف	1800-1810
3۔ برج رتن داس	زمانہ تصنیف	1803
4۔ پنڈت شیام سندر	زمانہ تصنیف	1799-1808

5۔ ڈاکٹر کوتھ میرے	زمانہ تصنیف	1802-1810
6۔ ڈاکٹر کانتا اوجھا	زمانہ تصنیف	1813

عابد پیشاوری کے مطابق اردو ادیبوں کا قیاس یوں ہے:

1۔ رام بابو سکسینہ اور احسن مارہروی	زمانہ تصنیف	1803
2۔ مولانا امتیاز علی عرشی	زمانہ تصنیف	1808
3۔ سیدہ جعفر	زمانہ تصنیف	1780

عابد پیشاوری اپنی بحث کے نتیجے میں رانی کیتکی کا زمانہ تصنیف 1788ء کے آس پاس کا بتاتے ہیں اور یہاں پر یہ بھی واضح رہے کہ ''کہانی رانی کیتکی اور کنوار اودے بھان کی'' جس کو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے 1933ء میں مرتب کیا ہے۔ اس میں زمانہ تصنیف دیا ہی نہیں گیا ہے۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ عبدالستار دلوی نے رانی کیتکی کی کہانی کا جو زمانہ تصنیف بتایا ہے وہ مولانا عرشی کے حوالے سے قیاس پر مبنی ہے۔ جب کہ عابد پیشاوری کی بحث سے جو نتیجہ نکلا ہے وہ مدلل ہے اسی لیے اس کو مان لینا صحیح معلوم ہوتا ہے۔

عبدالستار دلوی مقدمے میں آگے کہتے ہیں کہ فورٹ ولیم کالج شعوری طور پر اس زبان کو جو نام دینا چاہتا تھا وہ ''ہندوستانی'' تھا۔ لیکن بعد کے زمانے میں اردو ہندی کے جھگڑے نے ملک کی لسانی وحدت کو نقصان پہنچایا ہے۔ لیکن ''رانی کیتکی کی کہانی'' وہ خوش قسمت ادب پارہ ہے جس پر اردو اور ہندی دونوں ادب کا مشترکہ قدیم و انمول سرمایہ ہے۔

عبدالستار دلوی اپنے مقدمے میں رانی کیتکی کے ''دیباچے'' میں انشآء کے کیے ہوئے دعوے سے متعلق عرض کرتے ہیں کہ انشآء ایک ایسی کہانی لکھیں گے جس میں کسی غیر ہندی زبان کا کوئی لفظ استعمال نہ ہوگا۔ اور اس بات کی صراحت انہوں نے کہانی کے ابتدائی شعر میں یوں کی ہے:

یہ وہ کہانی ہے جس میں ہندی چھٹ

کسی اور بولی کا میل ہے نہ پٹ

دراصل انشاء نے صرف اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ آگے یہ بھی وضاحت کر دی کہ کوئی بزرگ انشآء کے اس خیال سے متفق نہ ہوئے اور اس کام کو نہ ممکن بتایا۔ مگر انشآء نے اس تجربے میں شعوری کوشش کی ہے کہ اس میں کوئی بدیسی زبان کا لفظ شامل نہ ہونے پائے۔ عبدالستار دلوی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ''رانی کیتکی کی کہانی کے غائر مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انشآء اپنے اس مقصد میں خاطر خواہ کامیاب نہ ہو سکے اور اس بڑھے گھاگ حضرت کا نام بھوں چڑھا کر اور آنکھیں پھیرا کر کہنا کہ یہ بات ہوتی دکھائی نہیں دیتی، صحیح ثابت ہوا۔ کہانی میں کم ازکم پانچ مرتبہ انشاء نے غیر شعوری طور پر بدیسی الفاظ استعمال کیے ہیں۔''

(''رانی کیتکی کی کہانی'' مرتبہ: عبدالستار دلوی، ص:42)

عبدالستار دلوی مقدمے میں آگے اپنی اس رائے کی وضاحت کرتے ہوئے ان پانچ چھ مقامات کی نشاندہی اس طرح کرتے ہیں:

1۔ یائے نسبتی:

انشآء نے کہانی کے شروع ہی میں اس بھاکھا کو ہندی کہا ہے جس میں وہ کہانی لکھنے والے تھے اور یہ لفظ ہندی اسی سیاق میں آگے بھی استعمال ہوا ہے۔ دراصل لفظ ''ہندی'' اس زبان کا وہ نام ہے جس کو اولاً مسلمانوں نے دیا تھا۔ اس کی اصل بھی عربی ہے۔ یہی نہیں بلکہ لفظیہ (Morpheme) 'ی' یا 'یائے نسبتی' ہندوستانی زبانوں کو عربی ہی کی دین ہے۔ لہٰذا اس کے استعمال سے انشآء کا مقصد ابتداً ہی میں مجروح ہو جاتا ہے۔ بقول عبدالستار دلوی انشآء اس زبان کے لیے ''بھاکھا'' یا کھڑی بولی کا لفظ آسانی سے استعمال کر سکتے تھے۔

2۔ بے:

’’بے‘‘ کا سابقہ اصل میں اردو اور ہندی کو فارسی کی دین ہے۔ جو نفی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے بے کار اور بے حال وغیرہ۔ عبدالستار دلوی کے مطابق انشآء نے رانی کیتکی کے ابتدائی صفحات ہی میں سابقہ ’’بے‘‘ کا استعمال کیا ہے۔ انشاء نے ایک ہی جملے میں ’’بے سری‘‘ اور ’’بے ٹھکانہ‘‘ کے الفاظ کہے ہیں جن کی اصل فارسی ہے۔

3۔ تبلہ:

عبدالستار دلوی کا ماننا ہے کہ انشآء کا مستعملہ ’’تبلہ‘‘ دراصل عربی ’’طبلہ‘‘ ہے اور انشاء نے عربی لفظ طبلہ کو تبلہ لکھ کر اس کو صوتی اعتبار سے اردووانے کی کوشش کی ہے لیکن یہ عربی لفظ ہے۔

4۔ لال ٹین:

بقول عبدالستار دلوی اردو اور ہندی نے جہاں عربی، فارسی، ترکی زبانوں کے الفاظ اپنا لیے ہیں اسی طرح یورپی زبانوں میں پرتگیزی فرانسیسی اور انگریزی الفاظ کو بھی اپنالیا ہے۔ البتہ بدیسی زبانوں کے الفاظ قبول کرتے وقت اردو کا یہ رجحان رہا ہے کہ وہ ان دخیل آوازوں کو اردو کے صوتی مزاج میں ڈھالیتی ہے۔ اور لال ٹین ایک ایسا ہی لفظ ہے۔ اس موقع پر انشآء نے سہواً انگریزی زبان کا لفظ استعمال کرلیا ہے اور انہیں اندازہ تک نہیں ہوا۔

5۔ گل:

عبدالستار دلوی لفظ ’’گل‘‘ کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ’گل‘ لفظ اردو میں پھول کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور انشآء نے کہانی کی آخری سطروں میں اس لفظ کو مرکب یعنی گل چھڑی استعمال کیا ہے۔ شاید

یہاں انشاؔء کولفظ کے مرکب ہونے سے سہو ہوا ہے۔ وہ گل چھڑی کے بجائے پھل چھڑی بھی استعمال کر سکتے تھے۔

6۔ملولا:

اسم مذکر''ملولا'' اردو میں دکھ، رنج کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔لیکن اس کی اصل کا تعلق عربی سے ہے۔ یہ عربی لفظ ملول سے بنا ہوا ہے اور انشاؔء نے اسے استعمال بھی کیا ہے۔

ان الفاظ کے علاوہ انشاؔء نے فارسی ضرب الامثال کو''ہندوستانی'' میں ترجمہ کر کے استعمال کیا ہے جیسے ''دل کو دل سے راہ ہوتی ہے'' کو جی کو جی سے ملاپ ہے بنا دیا ہے۔انشاؔء کے بدیسی زبانوں کے الفاظ سہواً استعمال کر جانے کے تعلق سے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ''جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ باہر کی بولی کا کوئی لفظ عبارت میں نہ آئے انشاؔء کم وبیش کامیاب ہیں لیکن اس کوشش کے باوجود دو چار فارسی وعربی الفاظ ان جانے طور پر دبے پاؤں پھر بھی عبارت میں شامل ہو گئے ہیں۔ مثلاً ''نہ''(حرف نفی)،لتہ(کپڑے کا ٹکڑا)، فارسی سے اردو میں آئے ہیں۔اسی طرح تبلہ(طبلہ) اور ملولا (ملال سے یعنی رنجیدہ)۔اداس عربی الاصل ہیں۔ ایک جگہ انگریزی لفظ لال ٹین بھی استعمال ہوا ہے۔''

(تاریخِ ادب اردو، جلد سوم، ص:159)

عبدالستار دلوی اور ڈاکٹر جمیل جالبؔی نے تقریباً بدیسی زبانوں کے وہی الفاظ کی نشاندہی کی ہے۔مگر ان چند الفاظ کو چھوڑ کر انشاؔء اپنے تجربے میں کافی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔

عبدالستار دلوی مقدمے میں اس موقع پر رانی کیتکی کی کہانی اور بیتال پچیسی کا مقابلہ کر کے بتاتے ہیں کہ ان دونوں میں قدرے مشابہت ہے۔''بیتال پچیسی'' کا موضوع ہندو دیو مالا ہے جس کی مناسبت سے لالا جی نے زبان ہندوستانی، سنسکرت، فارسی، عربی، برج اور اودھی کے ملاپ سے ایک نئی زبان تشکیل دی ہے۔ یہ کہانی پہلے

سنسکرت میں تھی بعد میں برج اور ہندوستانی میں ترجمہ ہوئی۔ اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے بیتال پچیسی کی لسانی خصوصیات بھی بتائیں ہیں۔ اس کے برخلاف رانی کیتکی میں شعوری کوشش کی گئی ہے کہ بدیسی زبانوں کا کوئی لفظ داخل نہ ہونے پائے۔ اس کے علاوہ رانی کیتکی کی کہانی کی بھی خصوصیات وہی ہیں جو بیتال پچیسی کی ہیں۔ دونوں کی اصطلاحیں ہندو دیومالا سے لی گئی ہیں۔ بیتال پچیسی کے مقابلے میں انشآء کے یہاں تدبھو کی بہ نسبت تت سم الفاظ زیادہ استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً 'سمکھ' سامنے کے معنوں میں 'شبھ' مبارک کے معنوں میں وغیرہ۔ اور Vowels ہمیشہ لمبے ہوگئے ہیں۔ جن میں انفیائے واول(Nasalised Vowels) اور بغیر انفیائے واول(Non Nasalised Vowels) بھی استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً 'ماں' 'کو'ما'۔ اس کے علاوہ حرف صحیح (Consonants) میں بہت سی سادہ آوازیں ہکاریت(aspiration) کے ساتھ استعمال ہوئی ہیں۔ مثلاً سامنے کے بجا سامھنے، پودے کے بجائے پودھے وغیرہ۔

عبدالستار دلوی مقدمے کے اگلی منزل میں انشآء کے اسلوب اور طرز ادا پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انشآء نے عربی اور فارسی الفاظ استعمال کیے بغیر جگہ جگہ اپنے انداز بیان سے وہی اثر پیدا کیا ہے جو اردو سے مخصوص ہے۔ انشاء نے عربی و فارسی الفاظ کے استعمال سے پرہیز کیا ہے لیکن کہانی کی اتھان اور طرز ادا پر اردو اسلوب کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ دراصل یہ سب کچھ فارسی کے زیر اثر ہے۔ مثلاً کہانی حمد سے شروع ہوتی ہے جو فارسی کہانی کاروں کا طریقہ ہے۔ اسی طرح کہانی کی دوسری منزل نعت رسول پاک ہے۔ یہ بھی فارسی کی خصوصیت ہے اوراس کے بعد حضرت علی کی تعریف میں منقبت ملتی ہے۔ انشآء نے رباعی کو کہانی میں ''چوتکہ'' کے نام سے یاد کیا ہے۔ اور درمیان میں موقع کی مناسبت سے اشعار بھی رکھے ہیں جو پڑھنے والوں کی دلچسپی کو کہانی میں برقرار رکھتے ہیں۔ انشآء فارسی وعربی الفاظ سے بچنے کی بڑی کامیاب کوشش کرتے رہے مگر وہ کہانی کی فارسی طرز ادا سے نہ بچ سکے۔

عبدالستار دلوی مقدمے کے آخری حصے میں اس کہانی کے ہندی میں شائع ہونے کی ایک طویل فہرست

بتاتے ہیں۔اوراس کے بعدار دوزبان کا رخ کر کے کہتے ہیں کہ اس کہانی کواردو میں پہلی بار 1926ء میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے مرتب کر کے ''رسالہ اردو'' (اورنگ آباد) سے شائع کیا ہے۔اس سلسلے میں آگے وضاحت کرتے ہیں کہ انہوں نے ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور شام سندرداس کے اردواور دیوناگری نسخوں کا مقابلہ کر کے یہ کہانی مرتب کی ہے لیکن اس میں بنیادی اہمیت ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے نسخے کو دی گئی ہے کیوں کہ انہوں نے اس کو چار نسخوں کی مدد سے مرتب کیا تھا اور شام سندرداس کے نسخے میں جو اضافے تھے انہیں شامل کر کے یہ نیا نسخہ انہوں نے تیار کیا ہے۔

''رانی کیتکی کی کہانی'' پر لکھے گئے عبدالستار دلوی کے طویل و مبسوط مقدمے اور متنِ داستان کے مطالعے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ عبدالستار دلوی مقدمے کی ابتدا ہی سے نثری تحریک، نثری تصانیف و تراجم کا احاطہ کرتے کرتے انشاء کی بھی صرف نثری تصانیف پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ جب کہ انشاء بنیادی طور پر شاعر ہیں، تو ان کے تعارف میں ان کی شاعری یا شعری تصانیف کا ذکر کیے بنا آگے بڑھ جانا درست معلوم نہیں ہوتا۔لیکن یہاں پر اس بات کی بھی وضاحت ضروری ہے کہ جہاں راجی کیتکی کی کہانی کے تقریباً تمام مرتبین اور مضمون نگاروں نے انشاء کو اپنے بدیسی زبان استعمال نہ کرنے کے مقصد میں کامیاب بتایا ہے وہیں عبدالستار دلوی نے ایسے چھ مقامات کی نشاندہی کی ہے جہاں انشآء کا مقصد مجروح ہوا ہے۔ یہاں یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ عبدالستار دلوی نے اس کو اردو اور ہندی رسم الخط میں ایک ساتھ شائع کیا ہے تو انہوں نے اپنے مقدمے میں ابات کا خاص خیال رکھا ہے کہ ان کی لفظیات اردو کے ساتھ ساتھ ہندی بھی رہے جیسے ''ادب اور ساہتیہ'' اور ''ادیب اور لیکھک'' وغیرہ۔ چونکہ عبدالستار دلوی ایک ماہر لسانیات ہیں تو انہوں نے اپنی اس حیثیت کے پیشِ نظر ''رانی کیتکی کی کہانی'' کی جس گہرائی سے لسانی خصوصیات بتائی ہیں وہ آپ ہی کا خاصہ ہے۔

4.1.6۔ امرت بانی:

امرت بانی (ہندوستانی رنگ کی شاعری کا انتخاب) عبدالستار دلوی کی مرتبہ تصنیف ہے۔جس کو انہوں

نے 1975ء میں مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر سے شائع کیا ہے۔جس کی ضخامت 331 صفحات اور قیمت بیس روپے ہے۔انہوں نے اس کتاب کا انتساب سورگیہ شریمتی بہن کیپٹن کے نام کیا ہے۔جنھوں نے راشٹریا بھاشا کی حیثیت سے ہندوستانی کی گاندھی جی کی کلپنا کو ہندوستانی پرچارسبھا کے روپ میں زندہ رکھا ہے۔

عبدالستار دلوی اپنے مقدمے کی ابتدا اس جملے سے کرتے ہیں ''ہندوستان زبانوں کا عجائب گھر ہے۔'' کیوں کہ ہندوستان مین 880 زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن ان میں سے صرف بائیس زبانوں کو دستور ہند میں جگہ ملی ہے۔دراصل زبانیں مختلف خاندان السنہ Language Families سے تعلق رکھتی ہیں،جن میں سے چار بڑے لسانی خاندان اس طرح ہیں:

1۔ ہندآریائی Indo Aryan

2۔ دراوڑی Dravaidian

3۔ Austro - Asiatic

4۔ Tibeto - Berman

ہندوستان میں بولی جانے والی زبانیں ان چار خاندان السنہ میں سے دوخاندان ہندآریائی اور دراوڑی ہی سے متعلق ہیں۔ان میں سے دراوڑی خاندان السنہ میں تقریباً 73 زبانیں بشمول تامل،تلگو،کنڑ،ملیالم اور گونڈی وغیرہ وغیرہ ہیں اور جہاں تک ہندآریائی خاندان السنہ ہے اس میں ہندوستانی (ہندی+اردو)، پنجابی،کشمیری، بنگالی، آسامی،اریا،گجراتی،مراٹھی،کوکنی اورسندھی وغیرہ زبانیں شامل ہیں۔ چنانچہ یہ زبانیں تاریخی اورادبی روایتوں کے پیش نظر دنیا کی بڑی زبانوں میں شمار کی جاتی ہیں کیوں کہ ان کی ادبی روایات پانچ سوتا ہزار سال پرانی ہیں۔

عبدالستار دلوی گاندھی جی کے راشٹر بھاشا کے نظریے ''ہندوستانی'' کو واضح کرنے کے لیے مقدمے میں اس زبان ''ہندوستانی'' ملی جلی زبان کے بننے،سنوارنے اور ارتقاء پانے کی داستان تفصیلی انداز میں بیان کرتے ہیں جس کا خلاصہ یوں ہے۔ ہندآریائی زبانوں کی ادبی تاریخ بہت قدیم ہے۔اس کا ایک بہت بڑا حصہ

سنسکرت ادب پر مشتمل ہے۔اور جس کا مقام ہندوستان کی ادبی و مذہبی زبانوں سے بہت بلند ہے۔سنسکرت کی ادبی روایات 3000ق۔م سے شروع ہوکر دو منزلوں میں بٹ جاتی ہے۔جس میں پہلی منزل ویدی سنسکرت اور دوسری منزل کلاسیکی سنسکرت کی ہے جو بعد میں پراکرتوں سے ہوتے ہوئے اب بھرنشوں میں بدل جاتی ہے۔ان میں سنسکرت جو مذہبی وادبی زبان کی حیثیت سے صرف پڑھے لکھے افراد تک محدود ہوجاتی ہے۔اس کے برخلاف آریائی زبان پراکرتوں کی شکل میں عوامی زبان بن جاتی ہے۔ جہاں سنسکرت پاننی کے اصول وقواعد میں قید ہوکر رہ جاتی ہے وہیں پراکرتیں ملک کے طول وعرض میں عوامی بول چال کی طرح پھیل کراپ بھرنشوں میں تبدیل ہوجاتی ہیں۔لہٰذا جدید ہند آریائی زبانیں انہی پراکرتوں سے تعلق رکھتی ہیں جن کی آخری کڑی اب بھرنش ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خان بھی کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''لسانیات کا یہ ایک اٹل اصول ہے کہ بول چال کی زبان جتنی تیزی سے بدلتی ہے ادب کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ چنانچہ جب پراکرتوں نے ادبی شکل اختیار کرنا شروع کیا تو وہ عوام کی ڈگر سے پرے جا پڑی اور عوام کی زبان کا دھارا آگے بڑھتا رہا۔اس بول چال کی زبانوں کو اس عہد کے قواعد نویسوں نے ''اپ بھرنشوں''(بگڑی زبان) کہا ہے۔''

(مقدمہ تاریخ زبان اردو،ص:25)

عبدالستار دلوی مقدمے میں آگے بتاتے ہیں کہ جدید ہند آریائی زبانوں کی شروعات 1000ء کے بعد ہوئی۔ان زبانوں کی ادبی اٹھان یا ادبی ترقی مختلف وقتوں میں ہوئی۔ان میں سب سے قدیم مراٹھی اور گجراتی زبانیں ہیں۔اڑیا، بنگالی، پنجابی اور گجراتی زبانوں کو لسانی اعتبار سے الگ رکھا جاتا تھا۔جس کی بنیادی وجہ ان زبانوں میں سنسکرت، مراٹھی اور ہندی کے مقابلے میں رسم الخط کا فرق ہے اور جدید ہند آریائی زبانیں عربی وفارسی کے اثر کے علاوہ مجموعی حیثیت سے ایک ہی سمت میں ترقی کررہی ہیں۔

عبدالستاردلوی کے مطابق جدید آریائی زبانوں میں ''ہندوستانی'' کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ کیوں کہ اس کا علاقہ دوسری ہند آریائی زبانوں کے مقابلے میں زیادہ وسیع ہے۔اسی کو گریرسن پچھمی اور پوربی ہندی کہتا ہے۔ ہاں تو یہاں گریرسن کی یہ تقسیم (پچھمی اور پوربی) اس علاقے میں بولی جانے والی دوسری بولیوں مثلا برج ،اودھی اور میتھلی وغیرہ پر مشتمل ہے۔جو درحقیقت پنجابی، نیپالی، کشمیری، گجراتی اور مراٹھی کی طرح آزاد زبانیں ہیں۔ دراصل ''ہندوستانی'' زبان وادب کی ابتدأاور ترقی کھڑی بولی کی ترقی ہے۔جس کی شروعات مسلمانوں کی آمد کے اثرات سے ہوئی۔ ''ہندوستانی'' کی ابتدأ گیارہویں صدی عیسوی میں اس وقت ہوئی جب صوفیوں اور سنتوں نے اس ملی جلی زبان کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ واضح رہے کہ کا، میں، پر،اس،جس،کس، نا،تا اور گا لسانی اعتبار سے زبان ''ہندوستان'' کی بنیادی علامتیں ہیں۔ بارہویں سدی عیسویں میں خسرواوران کے ہم عصروں نے اسی زبان کو اپنے ادبی وسیلے کے طور پر اپنایا۔جس کے بعد ''ہندوستانی'' زبان نے اپنے محدود علاقے سے باہر نکل کر گجرات، مہاراشٹر اور دکن کی سلطنتوں میں پھیلتی گئی۔اور علاقائی زبانوں کے ساتھ مل کر رابطہ عامہ کی زبان بن گئی ۔امیر خسرو کے ساتھ ساتھ مہاراشٹر میں گیانیشور، مکتابائی اور نام دیو، پنجاب میں گرونانک، اتر پردیش میں کبیر اور راجستھان میں میرابائی اس ''ہندوستانی'' کے ذریعہ ملک کو لسانی اعتبار سے متحد کر رتھے۔جس کے بعد یہ زبان مہاراشٹر اور گجرات کے سنت کویوں اور دکن کے مسلمان صوفیوں نے اسے ترقی دی۔ جہاں کے سلاطین نے اس زبان میں نہ صرف خود شاعری کی بلکہ اپنے درباروں میں شعرأ کی سرپرستی بھی کی۔ جب دکن میں سلاطین وشعرأ دکنی میں شاعری کر رہے تھے تب شمال میں فارسی میں شعر و ادب تخلیق ہو رہا تھا۔ اگر ہم اس دور کے شمالی ہند کے شعروادب کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ دورِخسرو اور دکنی کے درمیان میں شمالی ہند میں ایک خلا نظر آتا ہے۔لیکن رابط عامہ کے لیے اسی زبان کا استعمال ہوتا تھا۔ بعد کے دور میں یعنی سترھویں صدی میں ولؔی اورنگ آبادی اوران کے ہم عصروں میں سراؔج، داؔود، قاسم، عاجز اور امرت رائے نے اس عوامی زبان ''ہندوستانی''میں شاعری کی۔اور جب اٹھارھویں صدی میں ولؔی اپنے دیوان کے ساتھ دلی پہنچے تو شمالی ہند کے شعرأوادبا کو احساس ہوا کہ اس عوامی

زبان میں بھی اچھی شاعری ہوسکتی ہے۔جس کے بعد ''ہندوستانی'' ریختہ یا ہندی، اردوشاعری کوصرف اورصرف بلندی اورترقی حاصل ہوئی۔آگے یہی زبان آرزؔو اورآبرؔو سے ہوتے ہوئے غالبؔ اوران کے ہم عصروں تک پہنچی۔ہاں تو یہاں 1800ء میں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا تو اس کی نثری تحریک سے ''ہندوستانی'' زبان و ادب کو بلندی اورتقویت ملی۔مگر یہیں سے ہندوستانی کواردواور ہندی کر کے الگ الگ سمتوں میں آگے بڑھانے کی کوششیں شروع ہوئیں جو بھارتندو ہرش چندرتک آتے آتے یہ کوشش کامیاب ہوتی گئی۔اب ہندی کو ہندوؤں اور اردوکومسلمانوں سے منسوب کیا گیااوریہی وہ دورتھا جب جنگ آزادی کی تحریک نے زور پکڑا تو گاندھی جی اس کے سب سے بڑے رہنما تھے۔جنہوں نے ہندی اوراردو کے بجائے''ہندوستانی'' کےنظریے پرزوردیا۔جس میں ہندی اور اردو برابر کی شریک ہوں۔عبدالستاردلوی گاندھی جی کے قومی زبان کے نظریے (راشٹر بھاشا) کی وضاحت اپنے ایک مضمون میں اس طرح کرتے ہیں:

> ''ہندوستانی جوقومی زبان کی حیثیت سے گاندھی جی کو بہت عزیز تھی، کوئی نئی زبان یا زبان کا کوئی نیا اسلوب نہیں تھا۔بلکہ یہ کھڑی بولی کا وہی روپ تھا جو اس زبان کی تشکیل کے ابتدائی دور میں کبھی ریختہ، کبھی ہندوی، کبھی زبان دہلوی، کبھی زبان ہندوستان، کبھی زبان اردوئے معلیٰ، اردو یا ہندوستانی کے مختلف ناموں سے تاریخ کے مختلف ادوار میں یاد کی جاتی تھی۔''

(ماہنامہ''شاعر''ممبئی، گاندھی نمبر،مضمون: ہندوستان کا لسانی مسئلہ اورگاندھی جی، 1969ء، ص: 61)

عبدالستاردلوی کہتے ہیں کہ گاندھی جی نے اپنے راشٹر بھاشا کے نظریے سے متعلق سب سے پہلے 1909ء کے ہندسوراج میں لکھا اوراس کے بعد لکھتے اور بولتے ہی رہے۔پھر چاہے وہ ساہتیہ سمیلن ہو یا ہریجن سیوک یا پھر کوئی تقریر وخطاب۔عبدالستار دلوی اپنے مقدمے میں 3 جولائی 1937ء کو لکھے گئے گاندھی جی کے الفاظ کا حوالہ اس طرح دیتے ہیں:

''ہندی، ہندوستانی اوراردوشبدایک ہی زبان کوظاہر کرتے یں۔ جسے اتر بھارت
میں ہندومسلمان دونوں بولتے ہیں اور جو دیونا گری یا فارسی لکھاوٹ میں لکھی
جاتی ہے۔''   (امرت بانی،ص:وَ(واو))

گاندھی جی کے تصور مترادفات (ہندی، ہندوستانی اور اردو) سے متعلق عبدالستار دلوی اپنے مذکورہ مضمون میں یوں لکھتے ہیں:

''گاندھی جی نے ایک سے زائد مرتبہ ''ہندی ہندوستانی'' اور ہندی کے لفظ بھی استعمال کیے ہیں اوراس سے اردووالوں کے دل میں اکثر شکوک بھی ابھرے کہ گاندھی جی ہندوستانی کی آڑ میں ہندی کی حمایت کرکے اسے سارے ہندوستانیوں پر مسلط کرنا چاہتے یں۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ گاندھی جی نے ہندی، اردو اور ہندوستانی ان تینوں الفاظ کومترادفات کے طور پر استعمال کیا ہے۔''

(ماہنامہ ''شاعر''،ممبئی،گاندھی نمبر،مضمون:ہندوستان کا لسانی مسئلہ اورگاندھی جی،1969ء،ص:62)

ایک طرف جہاں گاندھی جی ''ہندوستانی'' پرزوردے رہے تھے وہیں دوسری طرف ''نئی (جدید) ہندی تحریک'' جڑ پکڑنے لگی۔جس کے تحت سنسکرت کے تت سم الفاظ کواس میں شامل کرکے اسے اردو سے مختلف کرنے کی کوشش کی گئی تو وہیں اردو نے فارسی کا سہارا لیا۔اس طرح اردو ہندی ایک دوسرے کی طاقت بننے کے بجائے ایک دوسرے کے مدمقابل کھڑی ہوگئیں۔ یہ جنگ آزادی کے عروج کا زمانہ تھا۔جب گاندھی جی مشترکہ کلچر اور ''ہندوستانی'' زبان پر زوردے رہے تھے۔مگر سیاست فرقہ وارانہ طاقتوں کے ہاتھوں میں چلی گئی تو قومی زبان راشٹر بھاشا ''ہندی'' قراردی گئی۔

عبدالستار دلوی مقدمے میں آگے چل کراس طرح کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں کہ ''ہندوستانی''

''عام ہندی'' اور ''بول چال کی کی اردو'' میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دراصل موجودہ ہندی ادب اور اردو ادب ہی اردو اور ہندی کے خانوں میں بٹ گئے ہیں۔لنگویسٹکس کے اعتبار سے ہندی، ہندوستانی سے تت سم الفاظ کی وجہ سے مختلف ہے۔تو اردو فارسی کے اثر کی وجہ سے مختلف ہے۔ایسے میں ہندی کی طرح خالص اردو کے شیدائی بھی پیدا ہوئے جنہوں نے بدیسی الفاظ سے بچنے کی کوشش کی۔ یہ تحریک زیادہ اثر نہ دکھاسکی۔خالص اردو کے شیدائیوں میں ایک نمایاں نام داغ دہلوی کا بھی ہے جنہوں نے کہا تھا:

کہتے ہیں اسے زبانِ اردو

جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا

خالص اردو تحریک کی طرح ٹھیٹھ ہندی تحریک بھی اس دور میں کافی زوروں پر تھی۔

عبدالستار دلوی کے مطابق اردو اور ہندی دونوں کا ابتدائی ادب ایک ہی ہے کیوں کہ فورٹ ولیم کالج، کاظم علی جوان اور للولال جی کی سنگھاسن بتیسی اور بیتال پچیسی، انشاء کی رانی کیتکی کی کہانی، پریم چند اور سدرشن کا فکشن ہندی اور اردو دونوں کا ورثہ ہے۔ان کے بعد کے دور میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس ،اُپندر ناتھ اشک اور عصمت چغتائی وغیرہ دونوں ادب میں یکساں مقبولیت رکھتے ہیں۔اور یہی حال ہندی ادیبوں کا بھی ہے جو اردو حلقوں میں بھی اتنے ہی پسند کیے جاتے ہیں جتنے ہندی میں۔اردو اور دکنی اردو کی شعری ونثری تصانیف کا ہندی میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے ان سب کے علاوہ نظیر اکبرآبادی بھی دونوں کی میراث ہیں۔ یہاں اس موقع پر وہ اس بات کی طرف توجہ مرکوز کراتے ہیں کہ ''ہندوستانی'' ادب جس کی بنیاد صدیوں پہلے پڑھ چکی تھی۔اب ہم اس کی بلند عمارت کو خلوص اور محبت کے سہارے گرنے سے بچاسکتے ہیں اور ''ہندوستانی'' زبان کو اردو کے حسن اور ہندی کے رس سے سنوارنا ہی ہم سب کا بنیادی مقصد ہونا چاہیے۔

عبدالستار دلوی مقدمے میں اس کے بعد کی منزل میں زبان ''ہندوستانی'' کے مختلف ادوار میں اردو شعراً اور ہندی کو یوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کے کلام میں گنگا جمنی عناصر کو دکھاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ زبان

''ہندوستانی'' کے کچھ لسانی پہلوؤں کو بھی بیان کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

عبدالستار دلوی مقدمے میں اس انتخاب کی ترتیب کے دوران ان کے پیشِ نظر نکات کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''ہندوستانی شاعری کا یہ انتخاب ادبی لحاظ سے زیادہ بھاشکی درشٹی سے کیا گیا ہے۔ ہندوستانی شاعری کی یہ پھول مالا تیار کرتے وقت میری حالت باغ کے اس صنوبر کی سی تھی جو آسمان میں بڑھنے کے لیے آزاد بھی ہوتا ہے اور جس کے پاؤں مٹی میں بندھے بھی ہوتے ہیں۔ یہ مجموعہ انھیں پابندیوں سے آزادی حاصل کرنے کا امتحان ہے۔'' (امرت بانی، ص:س)

''امرت بانی'' ہندوستانی'' شاعری کا انتخاب ہے جو کہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ جس کے پہلے حصے میں غزلوں کا انتخاب ہے جس میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ ہر دور کے شاعروں اور کویوں کو اس میں شامل کیا جائے۔ جس میں پہلی غزل امیر خسرو کی ہے تو آخری غزل دشنت کمار کی ہے۔ جب کہ دوسرا حصہ گیت، نظمیں اور بھجن پر مشتمل ہے۔ جن کا سلسلہ بھی امیر خسرو اور ان کے ہم عصروں ایکناتھ، کبیر، میرابائی سے ہوتا ہوا نظیر اکبرآبادی، محمد قلی قطب شاہ تک پہنچتا ہے۔ اور وہاں سے آگے بڑھ کر دور حاضر کے شعرأ (امرت بانی کی ترتیب کے وقت تک) شامل ہیں۔ اس کے مقابلے میں تیسرا حصہ دوہے، رباعیات اور چوپدے پر مشتمل ہے۔ جو ''ہندوستانی'' کے نمونے قرار دیے جاسکتے ہیں۔ ان کے بعد ٹپنیاں (تاریخی اشارے)، شبداولی (فرہنگ) اور تمام شعرأ کا مختصر تعارف بھی شامل کتاب ہے۔

''امرت بانی'' چونکہ گاندھی جی کے قومی زبان کے نظریے ''ہندوستانی'' کو مدنظر رکھ کر ترتیب دی گئی ہے تو اس کتاب کو دیکھنے کے بعد عالمی شہرت یافتہ پروفیسر و ماہر لسانیات پروفیسر سینتی کمار چٹرجی نے کہا ہے:

> ''قومی زبان کے گاندھی جی والے نظریے کے تحت میں اس طرح کی کتاب

دیکھنے کا گزشتہ چالیس سال سے خواہش مند تھا۔''امرت بانی'' دیکھنے سے آج
میری آرزو پوری ہوگئی۔''

(ماہنامہ''کتاب نما''دہلی، پروفیسر عبدالستار دلوی نمبر،مضمون نگار: محافظ حیدر،مضمون: 'اردو کا خاموش خادم'فروری 2006،ص:41)

مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ عبدالستار دلوی نے'امرت بانی'' کے مقدمے میں اس ملی جلی زبان''ہندوستانی'' کے بننے،سنوارنے اور ارتقاء پانے کی تمام منزلوں کی مدلل وضاحت پیش کی ہے اور اس کے بعد زبان''ہندوستانی'' کو گاندھی جی کی طرف سے''قومی زبان'' بنانے کی پیش کش اور مختلف اوقات میں''ہندوستانی'' سے متعلق ان کے خیالات کو تفصیل سے پیش کیا ہے۔اس طرح کے پرمغز مقدمے کے بعد جو تین حصوں میں انتخاب دیا گیا ہے وہ مقدمے سے مکمل مناسبت رکھتا ہے۔اس سمت میں یہ پہلی کوشش ہے جو ہر لحاظ سے کامیاب ہے اور اس کامیاب کوشش کے لیے مرتب عبدالستار دلوی لائق داد وتحسین ہیں۔

4.1.7۔گھر آنگن:

گھر آنگن کو عبدالستار دلوی نے اپنے سیر حاصل مقدمے کے ساتھ دیوناگری اور اردو رسم الخط میں ترتیب دیا ہے جو جولائی/1976ء میں مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر سے شائع ہو کر مقبول ہوئی۔جس کی ضخامت 121 صفحات اور قیمت سولہ (16) روپے ہے۔یہاں یہ واضح کر دوں کے''گھر آنگن'' جانثار اختر کی رباعیوں کا مجموعہ ہے۔جس کا پیش لفظ کرشن چندر نے لکھا ہے اور وہ مجموعے کے اس دوسرے ایڈیشن یعنی مرتبہ عبدالستار دلوی کی گھر آنگن میں بھی جوں کا توں رکھا گیا ہے۔یہ مجموعہ پہلی بار 1971ء میں مکتبہ شاہراہ دہلی سے شائع ہوا تو اس کی ضخامت 90 نوے صفحات اور قیمت تین 3 روپے ہے اور جانثار اختر نے انتساب کتاب خدیجہ اختر کے نام کیا ہے جو ان کے لیے صفیہ کا دوسرا روپ ہے۔

گھر آنگن چونکہ جانثار اختر کی رباعیوں کا مجموعہ ہے اس میں انتساب کے بعد رباعیوں کا سلسلہ شروع

ہو جاتا ہے اور کسی صفحے پر ایک اور کسی صفحے پر دو رباعیاں درج ہیں۔ اسی طرح جملہ 179 رباعیاں شامل کتاب ہیں، کیوں کہ یہ مجموعہ دیوناگری اور اردو دونوں رسم الخط میں ہے تو دائیں جانب اردو رسم الخط میں رباعیاں ہیں تو بائیں جانب دیوناگری رسم الخط میں۔ جس کے بعد مرتبِ کتاب عبدالستار دلوی کا مقدمہ بعنوان ''گھر آنگن کی رباعیاں'' اور پہلے ایڈیشن میں مشمولہ کرشن چندر کا تاثراتی پیش لفظ بعنوان ''گھر آنگن کی شاعری'' شامل ہے۔

عبدالستار دلوی اپنے مقدمے کا آغاز اردو شاعری کے ہندوستانی موضوعات، ہندوستانی لہجے اور ہندوستانی زبان شاعری سے متعلق کرتے ہیں اور اس سلسلے میں وہ پہلا تذکرہ میر تقی میر کا کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرؔ نے اپنی شاعری کے پرستاروں سے کہا تھا کہ انھیں سمجھنے کے لیے جامع مسجد کی سیڑھیوں کی زبان سے واقفیت ضروری ہے۔ یہ بات اردو کے تعلق سے ان لوگوں کے پروپگنڈے کا بہت واضح جواب ہے جو اردو کو قلعہ معلیٰ اور امیر و رئیسوں کی زبان بتانے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرؔ نے اردو کے لیے جو معیار مقرر کیا تھا وہ عوامی زبان کا تھا۔'' اور میر ہمیشہ عوام ہی سے مخاطب رہے۔

شعر میرے گو ہیں خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

عبدالستار دلوی کے مطابق میرؔ کے بعد اس روایت کو آگے بڑھانے والے شاعر نظیرؔ اکبرآبادی ہیں۔ جنھوں نے اردو شاعری کو پھر سے زبان، موضوع اور طرز ادا کے لحاظ سے جغرافیہ، تہذیب اور لسانی روایتوں سے ملا دیا۔ اور نظیرؔ کے بعد ملکی عناصر کی چاہے، ادبی، تہذیبی اور لسانی ہر لحاظ سے فراقؔ کی شاعری میں خاص کر ان کی ''روپ'' کی رباعیوں میں دکھائی دیتی ہے اور فراقؔ کے بعد اس روایتی تسلسل کو آگے بڑھوا دینے والے شاعر جاں نثار اخترؔ ہیں۔

فاضل مقدمہ نگار جاں نثار اخترؔ کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جاں نثار اخترؔ اردو کے رومانی شاعر ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی آپ کا تعلق ترقی پسندی سے ہے لیکن یہ تعلق کئی لحاظ سے مختلف بھی ہے۔ انہوں نے جہاں ترقی پسندی کے سہارے ابھرنے کی کوشش کی وہیں انہوں نے خود ترقی پسندی کو سہارا بھی دیا۔ واقعہ یہ

ہے کہ اختر ایک آدھ نظم کے علاوہ نام نہاد نعرے بازی سے دور رہے۔ وہیں شعریت، نئے انداز بیان اور نئے لہجے کو اپنی شاعری میں خوب پروان چڑھایا۔ کیوں کہ وہ نئے اور پرانے کے خوب صورت ملاپ کے پجاری ہیں۔ ''کون سا گیت سنوگی انجم''، جیسی ہلکی پھلکی رومانی نظم سے لے کر مخصوص عمر اور مخصوص ماحول کی یادگار نظمیں مثلاً اسٹالین، امن نامہ، خاموش آواز، ایک زخم، تمنا اور سہی اور آخری ملاقات اور آخری لمحے تک شعری اور فکری اسالیب کے تجربے کرتے رہے۔ ان تجربوں میں دلکشی کو ہندستان کی تہذیبی تاریخ کے موضوع نے جلا دی ہے۔ ہندوستان کی تہذیبی تاریخ کے پس منظر میں اور اس پس منظر کو پیش منظر سے ملانے کی کوشش میں جو نظمیں کہی گئیں ہیں ان میں نیا رگ وید، اپنیشد، اور ہندوستانی عورت کی خصوصیات سے سجی سجائی غیر مطبوعہ نظمیں ہیں۔ دراصل جانثار اختر کی شاعری تینوں اعتبار سے (موضوع، فکر اور زبان) ہندوستانیت کا بہترین نمونہ ہے۔ بقول عبدالستار دلوی جانثار اختر کی شاعری کی یہ سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ انہوں نے نئی شاعری کی منجمد اصطلاحوں اور علامتوں سے ہٹ کر چلتی پھرتی، شوخ اور نٹ کھٹ اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ جن کا تعلق ہماری تہذیبی تاریخ یا سنسکرت اتہاس سے ہے۔ اور یہی شاعرانہ خصوصیات ''گھر آنگن'' کی زینت اور آرائش کا بھی کام کرتی ہیں۔

''گھر آنگن'' کے دونوں ایڈیشن کا تعارف عبدالستار دلوی کی تمہید مقدمہ اور جانثار اختر کی شاعری پر تفصیلی اظہار خیال کے بعد آیئے اب عبدالستار دلوی کے مقدمے کے حوالے سے گھر آنگن کا مطالعہ کریں۔ ''گھر آنگن'' جانثار اختر کی رباعیوں کا مجموعہ ہے اس میں کل (164) رباعیاں ہیں۔ اس سے پہلے جب ان کا مجموعہ ''جاوداں'' شائع ہوا تھا تو اس میں بھی کچھ رباعیاں تھیں مگر وہ تعداد میں اتنی کم تھیں کہ قارئین کو تشنگی محسوس ہوتی رہتی لیکن جب ''گھر آنگن''، منظر عام پر آیا تو قارئین کی تشنگی دور ہوگئی۔ یہاں یہ وضاحت کر دوں کہ ''جاوداں'' کی پندرہ رباعیاں اور ''گھر آنگن''، کی 164 رباعیوں کو یکجا کر کے عبدالستار دلوی نے ''گھر آنگن'' کا یہ دوسرا ایڈیشن ترتیب دیا ہے۔

عبدالستار دلوی مقدمے میں اس مقام پر آ کر صنف رباعی اور اس صنف کا مختصر ارتقا بیان کرتے ہوئے فراق تک کے رباعی گو شعرا کا احاطہ کرتے ہیں۔ جس کے بعد فراق کی شاعری اور خاص کر ''روپ'' کی رباعیوں

کے تعلق سے بات کرتے ہوئے کہتے ہین کہ فراقؔ نے اردو شاعری کو ہندوستانی لہجہ اور موضوع عطا کیا۔ جو سنسکرت اور ہندی شاعری کی اصل تھا۔ فراقؔ نے ''روپ'' کی رباعیوں میں ہندوستانی عورت کی رنگین اور چلتی پھرتی تصویروں کے ساتھ ہندوستانی بزم خیال کی فکری پہلو پیش کیے ہیں۔ اردو شاعری کو ''روپ'' فراقؔ کی بہت بڑی دین ہے۔ فراقؔ کی یہ دین سنسکرت اور کلاسیکی ہندی کے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ اور مقدمہ میں آگے چل کر فراق کے الفاظ کو دہراتے ہوئے کہتے ہیں کہ اردو کو ہندی اور سنسکرت شاعری سے استفادہ کرنا ضروری ہے۔ اسی لیے انہوں نے ''روپ'' میں شعوری کوشش کی کہ ان رباعیوں میں مناسب موقعوں سے مگر نہایت احتیاط سے سنسکرت الفاظ لائے جائیں لیکن اس سے اردو کی فصاحت میں فرق نہ آئے۔

عبدالستار دلوی کے مطابق موضوع اور زبان کا فراقؔ کا نظریہ ارتقا کی صورت میں جاںنثار اخترؔ کی رباعیوں یعنی ''گھر آنگن'' تک آ پہنچا ہے۔ اور گھر آنگن کا موضوع ہماری روزمرہ کی زندگی پر مبنی ہے۔ دراصل ان رباعیوں میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ ہمارے بیشتر ہندوستانی گھروں کی زینت و زیبائش ہے۔ یہ خیالات ہماری لوک کہانیوں، لوک گیتوں اور پرانی ہندی شاعری کا حصہ ہیں۔ عبدالستار دلوی کی طرح ''گھر آنگن'' کی عورت کو لوگ گیتوں سے ماخوذ ہونے والی بات سے ڈاکٹر نریش بھی متفق نظر آتے ہیں:

> ''لوک گیتوں میں پیار کے قابل عورت دستیاب ہوتی ہے اور وہ بھی صدیوں پہلے سے۔ لیکن لوک گیتوں کی تخلیق نہ تو کسی شاعر کی شعوری کاوش کا نتیجہ ہے اور نہ انہیں اعلیٰ ادب میں کچھ مقام حاصل ہے۔ لوک گیتوں کی عورت اپنی تمام تر شوخیوں، اداؤں، کجکلاہوں، وضعداری، وفاشعاری اور شرم و حیا کے ساتھ اخترؔ کے یہاں یوں ظہور پذیر ہے:

آہٹ مرے قدموں کی جو سن پائی ہے
اک بجلی سی تن بدن میں لہرائی ہے

دوڑی ہے ہر اک بات کی سدھ بسرا کر

روٹی جلتی توے پر چھوڑ آئی ہے''

(ششماہی ''فن اور شخصیت''، بمبئی، جاں نثار اختر نمبر، مضمون: گھر آنگن کا شاعر''، مارچ/1976۔ص:307)

ڈاکٹر نریش اپنے مضمون میں آگے وضاحت کرتے ہیں کہ مذکورہ رباعی پنجابی لوک گیت ''جاندیاں دی پٹھ دیکھنی بھاویں سڑ جے توے دی روٹی'' (وہ جا رہے ہیں تو میری نگاہیں ان کا تعاقب ضرور کریں گی۔ بھلے ہی توے پر پڑی ہوئی روٹی جل جائے) اور یہاں یہ بتادوں کہ گھر آنگن میں یہ مذکورہ رباعی (15) نمبر پر ہے۔

عبدالستار دلوی مقدمے کی اگلی منزل میں اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ جمالیاتی شاعری میں اکثر عورت کی اس مخصوص دور زندگی کا بیان ہوتا ہے جب وہ محبوب ہوتی ہے۔ اصلاحاً یہ شادی سے پہلے کا دور ہوتا ہے۔ جب شاعر اس کے حسن سے اس کی ادا سے، اس کی چلت پھرت سے اور اس کے ناز و نخرے سے متاثر ہو کر اس کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ مگر ''گھر آنگن'' کی رباعیاں وہ جمالیاتی شاعری ہے جس میں ازدواجی زندگی میں محبوب کی محبوبیت قائم رکھنے کی وجہ سے محبت میں پائیداری نظر آتی ہے۔ آپ کی طرح کرشن چندر کا بھی ماننا ہے کہ گھر آنگن کی رباعیوں میں محبوب کی محبوبیت شادی کے بعد کی ازدواجی زندگی میں ہے:

> ''عام طور پر شاعر و ادیبوں نے بیوی اور محبوبہ کو الگ الگ انفرادی حیثیت دی ہے۔ شاعروں نے بیوی کو ایک سرے سے ہی نہیں گردانا، ناول نگار بھی اپنا ناول وہاں ختم کر دیتے ہیں۔ جہاں پر محبوبہ بیوی بن جاتی ہے۔ مطلب یہ کہ اب قصے میں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ ختم شدہ۔ اختر نے ''گھر آنگن'' میں اس بات کو وہاں سے شروع کیا ہے جہاں اکثر ناول نگار اور افسانہ نگار اسے ختم کر دیتے ہیں۔ وہی اختر کے لیے ابتدا ہے۔ ازدواجی زندگی کے سکھ دکھ، باہمی رفاقت، پیار اور محبت کا گہرا گداز جس سے اس دنیا کے کروڑوں گھر ایک خوب صورت زندگی

سے جگمگاتے ہیں۔ اور جنہیں اکثر و بیشتر شاعر اور ادیب خاطر میں نہیں لاتے،
نہ اپنی شاعری میں اسے کوئی جگہ دیتے ہیں۔ یہی اصل میں گھر آنگن کا موضوع
ہے۔''   (''گھر آنگن'' مرتبہ: عبدالستار لوی، ص:118-117)

عبدالستار دلوی مقدمے میں آگے کہتے ہیں کہ سماجی زندگی میں تبدیلیاں ہونا لازمی ہے۔ اسی کے ساتھ ہماری ہندوستانی تہذیب، رسم و رواج، سوچنے سمجھنے اور زندگی جینے کے طور طریقوں میں بھی تبدیلیاں آتیں ہیں۔ اور خاص کر تبدیلیاں متوسط خاندانوں میں رونما ہوتی ہیں۔ جہاں شوہر اور بیوی، زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے غم اور خوشی بانٹنے کے لیے اور پریشانیوں میں ایک دوسرے کی طاقت بننے کے لیے ہوتے ہیں۔ ایسی ہی متوسط طبقے کی زندگی کا عکس ''گھر آنگن'' کی رباعیوں میں پیش کیا گیا ہے:

کہتی ہے کہ سہہ لوں گی جو سہنے پڑے غم
کچھ دیر کے اور ہیں زمانے کے ستم
تم اپنے ارادوں کو نہ کرنا کمزور
پیچھے نہ ہٹانا کہیں گھبرا کے قدم

عبدالستار دلوی ''گھر آنگن'' کی ہندوستانی عورت سے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ پڑھی لکھی، شعر و ادب سے واقف ہے۔ زندگی میں قدم سے قدم ملا کر چلنا اور ملک و قوم کی روایتوں کو سمجھنا جانتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اسے اپنے گھر کا کام کاج کر کے روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے:

ہر رسم و رواج کو کچل سکتی ہوں
جس رنگ میں ڈھالیں مجھے ڈھل سکتی ہوں
اکتانے نہ دوں گی ان کو اپنے سے کبھی
ان کے لیے سو روپ بدل سکتی ہوں

عبدالستار دلوی کے خیال میں ''گھر آنگن'' کی رباعیوں میں صفیہ اختؔر اور خدیجہ اختؔر دونوں سانس لیتی نظر آتی ہیں کیوں کہ جب جاں نثار اختؔر فلمی دنیا میں قسمت آزمانے کے لیے پہلے پہل بمبئی آئے تھے تب صفیہ اختر بھوپال سے اپنے خطوط کے ذریعہ ان کی ہمت بڑھاتی تھیں۔ان خطوط میں صفیہ اختر اپنی بیماری، اختر سے اپنی اٹوٹ محبت اور ہجر و فراق کے تذکرہ وغیرہ کا ذکر کرتیں ہیں۔یہ خطوط ''زیرِ لب'' کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔ اس پس منظر میں اگر ''گھر آنگن'' کی رباعیوں کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اختؔر نے ان تمام باتوں کو بنیاد بنا کر کئی رباعیاں تخلیق کی ہیں۔اختؔر کے فلمی دنیا میں قدم جمانے میں دشوار کن حالات میں ہمت بڑھاتے ہوئے صفیہ اختؔر کے خط پر لکھی گئی رباعی یہ ہو سکتی ہے:

میں ہی نہ بٹاؤں گی اگر غم ان کا
غم ان کا بھلا کون بٹائے گا سکھی
میں ہی نہ اگر انھیں بڑھا وادوں گی
ہے کون جو ان کا دل بڑھائے گا سکھی

بیوی کی محبت میں کئی رنگ شامل ہوتے ہیں جیسے ماں، بہن اور دوست وغیرہ۔خاص طور پر ماں کا پیار جس کی دنیا میں کوئی مثال نہیں ملتی۔کیوں کہ ماں اپنے پیار کے بدلے کوئی صلہ نہیں چاہتی۔''زیرِ لب'' کے خطوط میں صفیہ اختر بار بار اپنے پریشان شوہر کو تسلی دیتیں ہے جس کو اختؔر نے رباعی میں یوں بیان کیا ہے:

ہر ایک مصیبت سے بچانے کو تمہیں
ہر طرح کی بات خود پہ لے سکتی ہوں
کہتی ہے کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے
میں ماں کا بھی پیار تم کو دے سکتی ہوں

صفیہ اختر نے اپنے خطوط میں جہاں اپنی ذاتی تکلیف و پریشانیوں کا ذکر کیا ہے وہیں نادار و مفلس عوام

کے لیے بھی ان کو فکر لاحق رہتی تھی۔ اس موضوع پر اختر نے یہ رباعی کہی ہے:

بس اپنے ہی گھر کا سکھ تو کچھ بھی نہ ہوا
ہر گھر کو ملے گی راحت کس دن
کسی روز ہر اک صحن میں مہکیں گے گلاب
آنگن آنگن بسے گی جنت کس دن

عبدالستار دلوی نے جاں نثار اختر کی شاعری، گھر آنگن کا موضوع اور اس کی خصوصیات سے متعلق تفصیلی بیان کے بعد اب مقدمے کے آخری حصے میں ''گھر آنگن'' کی لسانی اہمیت پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ چوں کہ ''گھر آنگن'' کا موضوع ہندوستانی عورت اور ہندوستانی تہذیب ہے تو اختر نے اسی مناسبت سے اردو ہندی کی گنگا جمنی ہندوستانی زبان استعمال کی ہے۔ انہوں نے دونوں کے حسن کو برقرار رکھتے ہوئے ان کے سادہ سلیس اور متاثر کن الفاظ ہی کا انتخاب کیا ہے انہوں نے سنسکرت کے تت سم الفاظ کو جس خوب صورتی سے اپنی زبان کا حصہ بنایا ہے اس سے یہ الفاظ اسی زبان کا حصہ معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں جب ضرورت سمجھتے یں انہیں تت سم الفاظ کو تت بھو الفاظ میں بدل دیتے ہیں۔ اور انگریزی الفاظ جیسے سگریٹ، بک شیلف، لمپ اور مشین وغیرہ بھی گنگا جمنی زبان کا حصہ بن گئے ہیں۔ اسی طرح بے شمار ہندی الفاظ جیسے نار، دیش، جگ جگ، سبھاؤ، سروپ، جیون، بالک، دیپک، تپسیا، پون، رانگ اور انوپ وغیرہ وغیرہ بھی ''گھر آنگن'' کی زبان میں داخل ہو گئے ہیں۔ اختر سے پہلے اسی طرح کی کوشش فراق ''روپ'' میں کر چکے ہیں لیکن انہوں نے سنسکرت اور ہندی کے مشکل الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ان کے برخلاف اختر نے سہل اور عام فہم الفاظ کا انتخاب کیا ہے۔ جس کی وجہ سے اختر لسانی اعتبار سے فراق سے بھی آگے نکل آئے ہیں۔ اختر نے عوامی بول چال کی زبان میں اپنے خیالات اور فن دونوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ اسی لیے ''گھر آنگن'' نہ صرف ہمارے گھروں میں پائے جانے ولاے احساسات و جذبات کا نمونہ ہے بلکہ ہمارے گھروں میں بولی جانے والی عام ہندوستانی زبان کا بھی نمونہ ہے۔

مختصراً کہا جائے تو عبدالستار دلوی اپنے مقدمے میں اردو شاعری میں عوامی یا ہندستانی زبان اور تہذیب سے ابتداً کر کے جاں نثار اختر کی مجموعی شاعری، گھر آنگن کا موضوع، گھر آنگن کی دوسری خصوصیات بیان کرتے کرتے صفیہ اختر کے خطوط کے حوالے سے بھی گھر آنگن کی رباعیوں کا احاطہ کرتے ہیں اور مقدمے کے آخر میں گھر آنگن کی لسانی اہمیت کا بھرپور جائزہ لیتے ہیں۔ آپ کے مدلل مقدمے کے مطالعے کے بعد ''گھر آنگن'' کی رباعیوں کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔

4.1.8۔ادبی اور لسانی تحقیق: اصول اور طریق کار:

عبدالستار دلوی نے ''ادبی اور لسانی تحقیق: اصول اور طریق کار'' کو ترتیب دے کر 1984ء میں شعبہ اردو، بمبئی یونی ورسٹی سے شائع کیا ہے۔ جس کی قیمت چالیس روپے اور ضخامت 256 صفحات ہے۔

''ادبی اور لسانی تحقیق: اصول اور طریق کار'' میں سب سے پہلے ان کا پیش لفظ ملتا ہے۔ جس کی ابتدائی سطور ہی میں انہوں نے ان کتاب کو ترتیب دینے کی وجہ کو یوں بیان کر دیا ہے:

> ''اس کتاب میں اردو کی ادبی اور لسانی تحقیق کے اصول اور طریق کار کے بارے میں اردو زبان و ادب کے مشہور و معروف علماء و محققین کی گراں قدر نگارشات پیش کی گئی ہیں۔ جو اردو کے طلبہ کے لیے مشعلِ راہ تو ثابت ہو گی ہی عام محبانِ اردو اور اہل نظر قارئین کے لیے بھی دلچسپی کا باعث ہو گی۔''

(''ادبی اور لسانی تحقیق: اصول اور طریق کار'' ص: 7)

عبدالستار دلوی کے متذکرہ بالا اقتباس سے جہاں ان کی کتاب ہذا کو ترتیب دینے کی وجہ معلوم ہو رہی ہے۔ وہیں پیش لفظ کے اگلے مراحل سے ترتیب کتابِ ہذا کے دوران ان کے پیش نظر نکات کا پتہ چلتا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

''میں نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ اس مجموعہ میں ایسے مقالات اور مضامین پیش کیے جائیں جو آج سے پہلے کے مجموعوں میں کسی ایک مقام پر یکجا نہ ہوئے ہوں نیز ان کی اہمیت کے اعتبار سے بھی ان کا انتخاب ایک خاصے کی چیز بن جائے۔'' (''ادبی اور لسانی تحقیق: اصول اور طریق کار'' ص:8-7)

عبدالستار دلوی اس پیش لفظ میں یہ بھی بتاتے ہیں کہ شعبۂ اُردو، بمبئی یونی ورسٹی نے ایم فل اردو کورس شروع کیا ہے جس کے پیش نظر بھی یہ مجموعہ ترتیب دیا گیا ہے کیوں کہ ایم اے اردو مکمل کر کے ایم فل کی سطح پر پہنچنے والے ریسرچ اسکالرس تحقیق کے میدان میں ناتجربے کار ہوتے ہیں تو یہ مجموعہ ان کے لیے بھی ایک رہنما یا مینارہ نور کا کام کرے گا۔انہوں نے پیش لفظ میں اس کے بعد شعبۂ اُردو، بمبئی یونی ورسٹی کی مختصر تاریخ بیان کی ہے جس میں شعبے میں منعقدہ لکچرز، سمینارس اور خطبات کا تاریخ وار جائزہ لیا ہے اور آخر میں تمام مقالہ نگاروں اور معاونین کا شکریہ ادا کیا ہے۔

کتاب ہذا کے مقدمے کا عنوان بھی وہی ہے جو کتاب ہذا کا عنوان ہے یعنی ادبی اور لسانی تحقیق: اصول اور طریق کار اس مقدمے میں وہ تحقیق کو زندگی کے مختلف پہلوؤں کا مدلل اور سائنسی انداز میں کیا ہوا مطالعہ قرار دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ تحقیق کی تعریف، غرض وغایت، اساسی مفروضات، تحقیق کے اقسام، تحقیق وتنقید ادبی تحقیق اور اس کی درجہ بندی، محقق اور رہنما، رہنما کے مراحل، محقق ایک مفکر، محقق ایک جاسوس، تحقیقی عمل کے مراحل، تحقیقی عمل کے طریق کار کا تعین، مواد کی فراہمی، حصول مواد کے وسائل، مواد کی درجہ بندی، طریقہ کار، لائبریری کا استعمال، ڈیوٹی، ڈیسمبل سسٹم، حلقہ جات کام، لسانیاتی تحقیق میں حلقہ جاتی کام کی اہمیت، عوامی ادب کے اطلاع کار، ادبی جائزہ، پیش کش تحریری کام کا آغاز، مقالے کے مختلف اجزا اور ان کی تشکیل، مقالے کا خصوصی، مسئلے کے حل کا بیان، شواہد، آخری حصہ تحریر کے اعتبار سے مقالے کی تشکیل اور اندازِ تحریر وغیرہ موضوعات پر مدلل او تفصیلی گفتگو کرتے ہیں جو تقریباً پینسٹھ صفحات پر محیط ہے۔ جس کی وجہ سے یہ ایک علاحدہ کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ کتاب اور خاص کر یہ مقدمہ اپنی اشاعت کے بعد نہ صرف ہندوستان بلکہ پاکستان میں بھی خاصہ مقبول ہوا۔ اس مقدمے کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ یہ سندھی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے جس کے مترجم Prof. Baldev

Matlaniصدر شعبہ سندھی، ممبئی یونی ورسٹی ہیں۔ یہ ترجمہ ''Funny Tahqiq ain Unja Usool''
کے عنوان سے 1995ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔ جس کو 1999ء میں ساہتیہ اکادمی نے ترجمہ ایوارڈ سے
بھی نوازا ہے۔ یہ بات آپ کے لیے قابل فخر ہے۔

اسی مجموعے میں شامل مضامین نامور محققین اور ماہرین کے قلم سے نکلے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کی اہمیت کل بھی مستند تھی اور آج بھی ہے۔ ان مضامین کی فہرست کچھ اس طرح ہے:

1۔ اصول تحقیق : قاضی عبدالودود

2۔ تحقیق اور اس کا طریقہ کار : ڈاکٹر عندلیب شادانی

3۔ فن تحقیق : ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان

4۔ تحقیق وتنقید : ڈاکٹر سید عبداللہ

5۔ حوالہ اور صحت متن : رشید حسن خان

6۔ تحقیق اور مواد کی فراہمی کا مسئلہ : پروفیسر سید محمد عقیل

7۔ تحقیق میں لائبریری کا استعمال : عبدالرزاق قریشی

8۔ ادبی تحقیق اور حقائق : ڈاکٹر خلیق انجم

9۔ اردو تحقیقات کی رفتار اور سمت : پروفیسر محمد حسنین

10۔ ببلوگرافی: تحقیق کا پہلا قدم : یونس اگاسکر

11۔ اردو میں تحقیق کے کچھ مسائل : نکہت فرید

12۔ اردو میں جدید تحقیق کا آغاز : ڈاکٹر محمود الہٰی

13۔ اردو کی ادبی تحقیق آزادی سے پہلے : پروفیسر گیان چند جین

14۔ اردو تحقیق آزادی کے بعد : پروفیسر گیان چند جین

15۔ قدیم دواوین کی ترتیب کے مسائل : تنویر احمد علوی

16۔ اردو میں لسانیاتی تحقیق کی اہمیت : عبدالستار دلوی

کتابِ ہذا کا پہلا مضمون (مقدمہ) اور آخری مضمون (اردو میں لسانیاتی تحقیق کی اہمیت) دونوں کچھ کچھ ترمیم و اضافے کے ساتھ آپ کی حالیہ تصنیف ''ادبی و لسانی تحقیق اور تقابلی ادب اصول و طریق کار'' میں بھی شامل کیے گئے ہیں۔ جس کی خاص وجہ طلبہ کے لیے فنِ تحقیق اور اصول تحقیق سے متعلق کتب کی کمی ہے۔ لیکن طلبہ اب بھی کتاب ہذا میں شامل دوسرے مضامین سے استفادہ کر سکتے ہیں جس کے پیش نظر اس کی اہمیت اب بھی اپنی جگہ مسلم ہے۔

4.1.9۔ دکنی اردو (دکنی اردو کا تہذیبی، ادبی اور لسانی مطالعہ):

عبدالستار دلوی نے اپنی تصنیف ''دکنی اردو'' کو 1987 میں بمبئی یونی ورسٹی، بمبئی سے شائع کیا ہے۔ دراصل یہ مرتبہ کتاب شعبہ اردو، بمبئی یونی ورسٹی کے کل ہند دکنی سمینار منعقدہ 22 تا 24 دسمبر 1985ء کے مقالات کا مجموعہ ہے لیکن اس میں کچھ اضافی مضامین بھی شامل ہیں جو دکنی محققین کے قلم سے نکلے ہیں اور اب دکنی اردو کے ایک عام طالب علم کی دسترس سے باہر ہیں۔ اس کتاب کی ضخامت 480 صفحات ہیں۔

عبدالستار دلوی اپنے مقدمے کی ابتدائی سطروں میں اردو زبان اور اس کی مختلف علاقائی بولیوں پر مجموعی حیثیت سے اظہار خیال کرتے ہوئے دکنی اردو سے متعلق لکھتے ہیں:

> ''تاریخی، لسانی اور ادبی لحاظ سے دکنی اردو کوئی اعتبار سے اردو کی دیگر بولیوں پر فوقیت حاصل ہے۔ چوں کہ اس عظیم الشان ملک کے مختلف علاقے، تہذیبی، ثقافتی، جغرافیائی تاریخی اور اقتصادی اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ لہٰذا ان علاقوں میں پروان چڑھنے والی اردو کی مختلف شکلیں بھی اپنی صوری و

> معنوی خوبیوں کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس لسانی تنوع کے باوجود ہر علاقے کی اردو اپنی اساس اور روح کے اعتبار سے بالکل یکساں اور ہم رنگ ہے۔ لہٰذا دکنی اردو بھی اپنی دامن میں ہمہ رنگی کے ساتھ ایک رنگی کی علامت بھی ہے۔ اس کے وجود میں رنگِ کثرت کے ساتھ جلوۂ وحدت بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔'' (''دکنی اردو''، ص:8-7)

عبدالستار دلوی نے ان سطور میں یہ بتایا ہے کہ جس طرح اردو زبان اپنی مختلف علاقائی بولیوں کے باوجود کثرت میں وحدت رکھتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح دکنی اردو بھی اپنی مختلف نوعیت کی ہمہ رنگ کے باوجود ایک رنگ یعنی کثرت میں وحدت رکھتی ہے۔

عبدالستار دلوی اپنے مقدمے میں آگے دکنی اردو کے وجود میں آنے کے اسباب یوں بیان کرتے ہین کہ ہندوستان خاص کر شمالی ہند میں مغلوں اور ترکوں کی آمد کے بعد نو وارد اور مقامی باشندوں کے درمیان اظہار خیال کے ایک ذریعہ کے طور پر اردو زبان وجود میں آئی۔ اس کا خمیر ہند آریائی زبانوں اور عربی و فارسی الفاظ کی آمیزش سے بنا تو اس زبان کے مختلف نام اردوئے معلیٰ، ریختہ ہندوتانی، زبان دہلوی، زبان ہندوستان، ہندی اور اردو وغیرہ دیے گئے۔ لیکن جب یہ زبان جنوبی ہند پہنچی تو اس پر جنوبی ہند کی زبانوں مثلاً مراٹھی، گجراتی، کنڑ اور تلگو وغیرہ کے اثرات سے ایک نیا اسلوب وجود میں آیا جو گجرات میں گجری اور دکن میں دکنی کہلایا۔

عبدالستار دلوی مقدمے میں آگے سنتوں، صوفیوں، قطب شاہی و عادل شاہی حکمرانوں اور ان کے درباروں سے وابستہ شعرائ کے ذریعہ دکنی اردو کے فروغ پانے کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ولؔی کے سفرِ دلی اور شمالی ہند پر اس کے اثرات سے بھی واقف کراتے ہیں۔

فاضل مقدمہ نگار لکھتے ہیں کہ ''دکنی اردو کی لسانی اور ادبی روایت دراصل گجری کی لسانی اور ادبی روایت کی توسیع ہے''۔ اور آگے چل کر وہ اس بات کی وضاحت اس طرح کرتے ہس کہ جب کھڑی بولی اردو یا اردوئے

معلیٰ کی شکل میں گجرات پہنچی تو اس پر گجراتی زبان کا اثر پڑنا لازمی تھا۔ گجراتی سے متاثرہ یہ زبان گجری کہلائی۔ لیکن حکمرانوں کے عروج و زوال کی وجہ سے یہ زبان اپنی شناخت باقی نہ رکھ سکی اور دکنی اردو میں ضم ہو کر رہ گئی۔ گجری ادب میں خوب محمد چشتی کی ''خوب ترنگ'' اور علی جیو گام دھنی کی ''جواہر اسرار اللہ'' کو ادبی و لسانی دونوں اعتبار سے اہمیت حاصل ہے۔ چوں کہ اب اس زبان کی ادبی حیثیت باقی نہیں ہے مگر یہ زبان عام بول چال میں اب بھی وسیلہ کا ذریعہ ہے۔

بقول عبدالستار دلوی ''دکنی اردو بشمول گجری اردو ایک وسیع موضوع ہے'' اور اس موضوع کی سماجی، لسانی و ادبی اہمیت بھی ہے۔ دکنی اردو جہاں ایرانی روایت کی پاسدار ہے وہیں مختلف ہندوستانی مذاہب اور اساطیر کی حفاظت بھی کرتی ہے۔ اس کے علاوہ اسلامی تصوف اور بھگتی مارگ دونوں اس میں ضم ہو جاتے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ دکنی اردو نے مغربی زبانوں میں سب سے زیادہ پرتگیزی زبان کے اثرات قبول کیے۔ اس سلسلے میں آگے وہ یہ حقیقت بیان کرتے ہیں کہ زبانیں اپنی ادبی اور معیار اسلوب کے لیے سیاسی مراکز کی پابند ہوتیں ہیں۔ اس حقیقت کے مطابق ان کا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ادبی دکنی کا مرکز شمالی ہند ہے لہٰذا اگر ادبی دکنی شمالی ہند اپنے مرکز کو منتقل نہ ہوتی تو آج کے ہندوستان کا لسانی نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔

عبدالستار دلوی مقدمے میں آگے اردو زبان کو ملی جلی زبان بتاتے ہیں اس سلسلے میں وہ کھڑی بولی کو ہند آریائی زبان کے ارتقاء کی اہم منزل مانتے ہیں۔ کیوں کہ اسی کھڑی بولی سے اردو اور ہندی دونوں کا گہرا رشتہ ہے۔ اردو جہاں لسانی سطح پر ہند ایرانی فضا میں سانس لے رہی تھی وہیں ادبی اعتبار سے ہندوستانی طرز فکر کے ساتھ ساتھ ایرانی ادبی روایات اور طرز اسلوب سے بھی استفادہ کر رہی تھی۔ جس کی بنا پر اردو کو ملی جلی زبان اور ملی جلی تہذیب کی آئینہ دار کہا جا سکتا ہے۔ اسی لیے اردو کی ارتقائی منزلوں میں اسے ہندوی، ہندوستانی، زبان ہندوستانی اور زبان دہلوی وغیرہ نام ملے۔ اور یہ زبان گجرات میں گجراتی کے زیر اثر گجری اور علاقائی مناسبت سے دکن میں دکنی کہلائی۔ مقدمہ نگار کے خیال میں شمالی ہند میں کھڑی بولی سے پہلے برج، اودھی اور میتھلی زبانیں ترقی یافتہ ادبی

زبانیں تھیں۔جن میں سورداس، تلسی داس، ملک محمد جائسی، مولانا داؤد اور قطبین وغیرہ نے اپنی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔اس پس منظر میں عبدالستار دلوی جدید ہندی کے حیرت انگیز ارتقا (تاریخی ولسانی تناظر میں) سے متعلق لکھتے ہیں:

''تاریخی اور لسانی تناظر میں جدید ہندی کا آغاز فورٹ ولیم کالج میں ہوتا ہے جسے بھارتیند و ہریش چندر کے زمانے میں ایک تحریک کی صورت میں سمت اور رفتار ملی اور ایک مختصر سے عرصے میں اس نے حیرت انگیز ترقی کرتے ہوئے ایک ادبی زبان کی حیثیت سے اپنی بنیادیں استوار کرتے ہوئے سیاسی اور ادبی اعتبار سے اپنے لیے راہیں ہموار کیں۔'' (''دکنی اردو''،ص:11-10)

عبدالستار دلوی کے اس اقتباس سے واضح ہوجاتا ہے کہ جدید ہندی کی فورٹ ولیم کالج میں ابتدأ ہوئی جسے بھارتیندو ہرش چندر نے تحریک دے کر سمت اور رفتار عطا کی تو اس زبان نے مختصر عرصے میں حیرت انگیز ترقی کرتے ہوئے ادبی زبان کی حیثیت حاصل کرلی۔

عبدالستار دلوی آگے اردو اور ہندی کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اردو کی طرح ہندی کا بھی اپنا طرزِفکر اور اسلوب ہے جو اس کو اردو سے الگ کرتا ہے۔وہیں دوسری طرف سنسکرت کا ذخیرہ الفاظ اور قواعدی ساخت ہندی اور اردو دونوں میں مشترک ہے۔لیکن ہند ایرانی لسانی عناصر اور صرفی خصوصیات اردو کو ہندی سے مختلف کرتیں ہیں۔

عبدالستار دلوی اردو اور ہندی کی لسانی مشترکات اور اختلافات کا بیان کرنے کے بعد دیوی سنگھ چوہان کی دیوناگری رسم الخط میں مرتب کردہ ''پھول بن'' کا ذکر کرتے ہیں جس کا پیش لفظ رام بابو سکسینہ نے قلم بند کیا ہے۔اس میں انہوں نے نصیرالدین ہاشمی اور ان کی اہم کتاب ''دکن میں اردو'' کے توسط سے دکنی اردو کی اہمیت بتاتے ہوئے اسے ہندوی یا ہندی کہا ہے جسے بعد میں دیوی سنگھ چوہان نے اپنے مقدمے میں بھی دہرایا ہے۔اور

ہندی ادیب اسے دہراتے ہی رہتے ہیں۔ دراصل ان خیالات پر چھاپ ''علم کی کم اور سیاست کی زیادہ ہے'' کیوں کہ وہ لوگ جو علم لسانیات سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ تو جانتے ہی ہوں گے کہ ہندوی، ہندوستانی اور ہندی وغیرہ موجود اردو ہی کے قدیم نام ہیں۔ انہوں نے اس بات کو ثابت کرنے کے لیے اردو کے مشہور شاعر مرزا غالب کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے جنہوں نے اپنی شاعری کو کہیں ہندی اور کہیں اردو دونوں ناموں سے یاد کیا ہے۔ اور تو اور اپنے خطوط کو عود ہندی اور اردوئے معلیٰ کے نام دیے ہیں۔ یہاں عبدالستار دلوی نے بڑی آسانی سے سمجھا دیا کہ ہندوی، ہندوستانی اور زبان ہندوستان دراصل زبان اردو ہی کے ابتداً اور ارتقا میں دیے گئے نام ہیں۔ آپ کے اس طرح سمجھا دینے سے متعلق پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ لکھتے ہیں:

''دلوی صاحب نے اپنے مقدمے میں بڑی خوبی کے ساتھ اس امر کی بھی صراحت کردی ہے کہ دکنی یا دکنی اردو دراصل قدیم ادو ہی ہے جسے اس دور میں کبھی ہندی اور کبھی ہندوی کے نام سے یاد کیا گیا۔''

(''آج کل''، نئی دہلی، مضمون ''دکنی اردو'' اگست 1988ء، ص:44)

عبدالستار دلوی کے مطابق اردو اور ہندی میں اختلاف کی اصل وجہ نئی ہندی ہے۔ اگر قدیم اردو کا مقابلہ موجودہ ہندی سے کریں تو جسم اور روح دونوں ہی اعتبار سے ان میں کوئی مشترک پہلو نہ ملے گا۔ لیکن اگر قدیم اردو کا مقابلہ موجودہ اردو سے کیا جائے تو تو ان میں جسم، روح اور مزاج میں کوئی فرق نہیں ملے گا۔ ''سوائے اس کے کہ وہ بچپن کے دن تھے اور یہ جوانی کا عالم ہے۔'' مقدمہ نگار اس سلسلے میں آگے لکھتے ہیں کہ قدیم اردو (دکنی اردو) اور اردو میں جس طرح جسم، روح اور مزاج کے ساتھ ساتھ موضوعات میں بھی مماثلت ملتی ہے۔ مثال کے طور پر غزل، مثنوی، رباعی، قطعہ اور قصیدہ وغیرہ اصناف دونوں میں مشترک ہیں۔ ان اصناف کے علاوہ علامتیں بھی مشترک ہیں جیسے ارجن اور بھیم کے ساتھ حیدر کرار، کعبہ کے ساتھ کاشی وہردوار، گنگا جمنا کے ساتھ دجلہ وفرات، گل وبلبل کے ساتھ چاند وچکور، بلبل کے نالوں کے ساتھ پپیہے کی ''پی'' دیوی دیوتاؤں سرسوتی اور کام دیو کے ساتھ آدم وابراہیم

عیسیٰ وموسیٰ وغیرہ تلمیحیں وعلامتیں دکنی اردو میں اور جدید اردو میں مکمل طور پر مشترک ہیں۔ جدید اردو کے بجائے اگر ان علامتوں کا تقابل ہندی سے کیا جائے تو ہندی میں رام اور ارجن ہیں۔عیسیٰ وموسیٰ نہیں، کرشن کی بانسری تو ہےلیکن بلال کی اذاں مفقود ہے۔سومنات اور کاشی ہے مگر کعبہ نہیں ملتا، گنگا اور جمنا تو ہےلیکن دجلہ اور فرات نہیں ملتے۔ بقول عبدالستار دلوی کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اردو زبان اپنے ناموں سے زیادہ اپنے جسم اور روح سے پہچانی جاتی ہے۔اردو ہندی کا فرق تہذیبی پس منظر میں ہوتا ہے ناموں سے نہیں اور قدیم اردو (ہندوی یا ہندی) اپنے لہجے، اپنی علامتوں، اپنے افکار اور اپنی اصناف وسکولر مزاجی کے لحاظ سے صرف اور صرف اردو ہے ہندی نہیں۔

عبدالستار دلوی مقدمے میں دکنی اور اردو میں جسم، روح مزاج اور موضوعات کے اعتبار سے مشترکات بیان کرنے کے بعد اس زبان کے اعتبار سے مماثلت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''جس قدر مماثلت دکنی اور اردو میں ہے اس کا عشر عشیر بھی ہندی میں نہیں۔'' سوائے چند فیصد مراٹھی سے متاثرہ الفاظ کے دکنی کا مجموعی ذخیرہ الفاظ، اردو کا بھی سرمایہ ہے۔اس موقع پر مقدمہ نگار نے ''پھول بن'' مرتبہ دیوی سنگھ چوہان کے اشعار نقل کیے ہیں:

ہنر کے گوہراں سے دل اہے پور
ہر اک فن کے اہے موتیاں سوں ہے معمور

زبان دن رات اس کی بات میں تھی
قلم کی ناو اس کے ہات میں تھی

عبدالستار دلوی آگے اس بات کا یقین بھی دلاتے ہیں کہ ہندی کا کوئی بھی طالب علم ان اشعار کو سمجھ نہیں سکتا جب تک وہ اردو کے کلچر سے واقف نہ ہو۔

فاضل مقدمہ نگار مقدمے میں آگے ہندی اور اردو کے ذخیرہ الفاظ سے متعلق کہتے ہیں کہ ہندی اور اردو

کی بڑی تعداد سنسکرت الاصل ہے۔ان میں جہاں سنسکرت کے تت سموں کو ہندی اپناتی ہے۔ وہیں تدبھوالفاظ کو اردو اپنے دامن میں جگہ دیتی ہے۔جس کی وجہ سے عوام کے لیے یہ الفاظ ادائے گی میں آسان ہوجاتے ہیں۔ یہاں پر وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ اردو کی لغت،محاورے،ضرب الامثال اور جمع بنانے کے قاعدے سب کچھ فارسی ہی کی دین ہیں۔

عبدالستار دلوی مقدمے کے آخری حصے میں دیوی سنگھ چوہان کے اردو شاعری پر کیے گئے اعتراض کا مدلل جواب دیتے ہیں۔واقعہ یہ ہے کہ دیوی سنگھ چوہان نے اپنی مرتبہ پھول بن میں اردو شاعری سے متعلق لکھا ہے کہ ''اس کی فضا ہندوستانی نہیں ہے،اس کی روح ہندوستانی نہیں ہے۔'' اسی کے ساتھ ساتھ اردو پر غیر ہندوستانی ہونے کا الزام لگانے والے معترفین کے ہم نوا نظر آتے ہیں۔عبدالستار دلوی نے دیوی سنگھ چوہان کے اس اعتراض کا جواب یوں دیا ہے:

> ''اولاً یہ کہ پھول بن کو صرف دکنی کے سیاق وسباق ہی میں رکھ کر اس میں ہندوستانی فضا ہے اس پر روشنی ڈالی جاتی۔اور جب جدید اردو شاعری کا ذکر چھیڑ دیا تھا تو معترفین کی موافقت یا مخالفت میں ضرور کچھ لکھتے۔ان کے خاموش رہنے سے عام قارئین میں یہ خیال ضرور پختہ ہوسکتا ہے کہ فی الحقیقت جدید شاعری کی فضا غیر ہندوستانی ہے...... لہٰذا جدید اردو شاعری کے غیر ہندوستانی کردار کے بارے میں چند باتیں ضروری ہیں تا کہ شکوک رفع ہوجائیں۔اردو میں جدید شاعری اصطلاحی معنوں میں نظیر اکبرآبادی اور ان کے بعد انجمن پنجاب کی تحریک سے شروع ہوتی ہے۔ وؔلی سے لے کر جدید دور کی غزل از سرتاپا اپنے معراج،طرز فکر علامات اور تشبیہات کے لحاظ سے غیر مذہبی اور خالص ہندوستانی ماحول کی پروردہ ہے۔'' (''دکنی اردو''ص:16)

عبدالستار دلوی نے دیوی سنگھ چوہان اور دیگر ہندی ادیبوں کے خیالات سے متعلق کہا ہے کہ ''ان

خیالات پر چھاپ علم کی کم اور سیاست کی زیادہ ہے۔"

عبدالستار دلوی آگے دیوی سنگھ چوہان سے کہتے ہیں کہ جدید اردو شاعری کے طرز فکر اور اسلوب میں، دکنی کے طرز فکر اور اسلوب میں ساڑھے چار سو سال کی تاریخ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آپ کی اس مدلل گفتگو پر مقدمہ اختتام پاتا ہے۔ اور آپ کے اس پر مغز مقدمے سے متعلق پروفیسر محمد انور الدین یوں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

"کتاب کے آغاز میں مرتب کے قلم سے ایک بسیط اور پر مغز مقدمہ ہے جس میں انہوں نے بعض اہل تحقیق کے اس دعوے کا نہایت متانت اور معروضیت کے ساتھ جائزہ لیا ہے کہ دکنی زبان ہندی کی ایک شاخ ہے۔ فاضل مرتب نے اہل ہندی کے اس ادعا کو جس پر مرتب نے اہل ہندی کے اس ادعا کے جس پر مرتب کے بقول علم کی کم اور سیاست کی چھاپ زیادہ ہے۔ دلائل و براہین کے ساتھ رد کیا ہے۔ اس مسئلے کی تنقیح و تجزیے کے سلسلے میں فاضل مرتب نے اردو اور ہندی کے مخصوص تاریخی ولسانی واسلوبیاتی اور تہذیبی تناظر کو نہایت ذہانت اور برجستگی کے ساتھ زیر بحث لایا ہے جس کی روشنی میں ہندی والوں کے تمام خیالات پادر ہوا ہو جاتے ہیں۔"

("کتاب نما"، دہلی، مضمون: "دکنی اردو۔ دکنی زبان وادب میں وقیع اضافہ"، فروری 2006، ص:106)

عبدالستار دلوی نے مقدمے کے بعد چوبیس مقالات کو تین حصوں میں تقسیم کر کے ان کو کتاب ہذا کا جز بنایا ہے۔ جو اس طرح ہیں۔ پہلا حصہ: "تاریخی وتہذیبی مطالعہ" ہے جس کے تحت مندرجہ ذیل آٹھ مضامین شامل ہیں:

1۔ گجری اردو دکنی اردو : ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی

2۔ دکنی اردو کا ایک عظیم مرکز : ڈاکٹر مبارز الدین رفعت

3۔ دکنی ادب کا تہذیبی پس منظر : ڈاکٹر نصیر الدین ہاشمی

4۔ دکنی ادب اور ایرانی روایات : ڈاکٹر سید نعیم الدین

5۔ محمد قلی قطب شاہ کی شاعری کا تہذیبی مطالعہ : پر فیسر سیدہ جعفر

6۔ قدیم دکنی شاعری مین ہندو اساطیر و مذہب : ڈاکٹر محمد اقبال احمد خان

7۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ میں دکنی کہاوتیں : ڈاکٹر یونس اگاسکر

8۔ دکنی کی موجودہ بول چال اور ادب : اودھیش رانی گوڑ

اسی طرح دوسرا حصہ ''ادبی مطالعے'' کے عنوان سے ہے جس میں کل سات مضامین یوں ہیں:

1۔ حضرت شاہ بہادر الدین باجن حالات اور ہندوی کلام : ڈاکٹر شیخ فرید

2۔ سب رس: ایک مطالعہ : پروفیسر محمود شیرانی

3۔ قطب مشتری ایک مطالعہ : پروفیسر خان رشید

4۔ دکنی مثنویاں : ڈاکٹر اکبر الدین صدیقی

5۔ دکنی غزل : پروفیسر سید جعفر

6۔ دکنی مرثیہ اور اعزاداری : ڈاکٹر رشید موسوی

7۔ گجری اور دکنی میں ترجمہ کی اولین روایت : جناب معین جینا پڑے

تیسرا اور آخری حصہ ''لسانی مطالعے اور مسائل'' کے تحت ہے اور اس حصے میں جملہ نو (۹) مضامین درج

ہیں جو یہ ہیں:

1۔ دکنی زبان : پروفیسر عبدالقادر سروری

2۔ دکنی اردو: سماجی لسانیات کی روشنی میں : پروفیسر عبدالستار دلوی

3۔ دکنی کے لسانی رشتے : پروفیسر گیان چند جین

4۔ خوب ترنگ کی لسانی خصوصیات : ڈاکٹر عالی جعفری

5۔ دکنی ادب کی تدوین کے مسائل : پروفیسر رشید حسن خان

6۔ دکنی اردو پر مراٹھی کا اثر : پروفیسر عبدالستار دلوی

7۔ دکنی اردو کا اسلوبیاتی مطالعہ : ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ

8۔ میراں جی کی شاعری میں چھندوں کا نظام : ڈاکٹر سید یحیٰ نشیط

9۔ قدیم و جدید اردو کی کشمکش : پروفیسر مسعود حسین خان

کتاب میں مرتب کے مقدمے کے بعد دکنی اردو کے مختلف پہلوؤں پر چوبیس (24) مقالات کا ایک حسین انتخاب شامل ہے جس کے اختتام پر ان مقالہ نگاروں کا مختصر تعارف بھی درج ہے۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل کراچی پاکستان سے اپنے ایک خط مورخہ 15 فروری 1989ء میں آپ کو لکھتے ہیں:

> ''دکنی اردو'' پر گو کتابوں کی کمی نہیں، لیکن اسے آپ نے محض ایک جلد میں، اس کے تمام تر پہلوؤں کے ساتھ، جس طرح سمیٹ لیا ہے۔ شاید ایسی ہی کاوش کو دریا کو کوزے میں بند کر دینے سے تعبیر کرتے ہیں۔ فی الحقیقت یہ اپنے موضوع پر ہمیشہ ایک ناگزیر تصنیف سمجھی جائے گی۔''

دراصل وہ سب لوگ ڈاکٹر معین الدین عقیل کے ہم کیال ہوں گے جنہوں نے ''دکنی اردو'' کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ کیوں کہ مرتب کا پر مغز و مدلل مقدمہ اس کتاب کا اہم حصہ ہے۔ اس کے علاوہ زبانوں دکنی اردو اور دکنی کے

مخصوص فن پاروں پر دکنی محققین کے سپرد قلم مقالے اس کتاب کی زینت ہیں۔آپ کی طرف سے اس کتاب کو مرتب کرنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ یہ منتشر اور کم یاب مضامین کتابی صورت میں یکجا ہو گئے ہیں۔ جو دکنی کے ایک عام طالب علم، محققین اور اساتذہ کے لیے کسی تحفے سے کم نہیں اور تو اور یہ کتاب ان لوگوں کے لیے بھی فائدہ مند ہے جو دکنی محققین یا پھر اردو کے قدیم محققین کو موضوع تحقیق بنائے ہوئے ہیں۔مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ''دکنی اردو'' کو مرتب کر کے اردو ادب خاص کر دکنی ادب میں قابل لحاظ اضافہ کیا ہے۔

4.1.10۔کرشن چندر شخص اور ادیب:

پیش نظر کتاب ''کرشن چندر شخص اور ادیب'' کو عبدالستار دلوی نے پہلی بار دسمبر 1993ء میں شعبہ اردو، بمبئی یونی ورسٹی سے شائع کیا ہے۔جس کی ضخامت 324 صفحات اور قیمت سو روپے متعین کی گئی ہے۔

عبدالستار دلوی نے کرشن چندر سے متعلق تئیس (23) مقالوں کو اپنے مختصر مگر جامع مقدمے کے ذریعے مرتب کیا ہے۔ وہ اپنے مقدمے کا آغاز اس جملے سے کرتے ہیں۔''اردو میں افسانہ نگاری کا باقاعدہ آغاز پریم چند سے ہوتا ہے۔'' اور وہ مقدمے کی تمہیدی سطور میں پریم چند کی حقیقت نگاری سے متعلق یوں تفصیلی رائے دیتے ہیں:

> ''پریم چند کی حقیقت نگاری عام طور پر دیہی زندگی میں پیدا ہونے والے معاشرتی اور سماجی موضوعات پر محیط ہے۔...... پریم چند نے اردو (افسانے) اضافے کو ایک نئی فکر اور زندگی کے تعلق سے نئے رویے اور نظریے سے متعارف کیا اور ان کا اثر اردو افسانے اور ناول پر تا دیر قائم رہا۔''
>
> (''کرشن چندر شخص اور ادیب''، ص:7)

دراصل وہ پریم چند ہی ہیں۔جنہوں نے اردو ادب میں حقیقت پسندی یا حقیقتِ نگاری کو رواج دیا۔جس کے چلتے انہوں نے دیہی زندگی، سرمایہ دارانہ نظام اور اس نظام کے دیہی زندگی پر اثرات وغیرہ موضوعات کو اپنے

افسانوں اور ناولوں میں پیش کیا ہے۔ ورنہ ان سے قبل تو اردو ادب میں صرف تخیل کی پرواز غالب نظر آتی ہے۔

عبدالستار دلوی مقدمے میں آگے بتاتے ہیں کہ پریم چند کے یہاں حقیقت نگاری اور سرمایہ داری کے خلاف جو احتجاجی رویہ کارفرما ہے وہ ان کے معاصرین میں علی عباس حسینی اور اعظم کریوی کے یہاں بھی دیکھنے کو ملتا ہے اور پریم چند نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں اس رویے کو آخری عمر تک جاری رکھا اور اپنے انتقال سے چند ماہ پہلے ترقی پسند تحریک کی پہلی کانفرنس کا صدارتی خطبہ پڑھا۔ جس میں انہوں نے کہا کہ ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا۔

ترقی پسند تحریک اردو ادب کی تحریکوں میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ جس نے اردو ادب اور ادیبوں میں تبدیلیاں پیدا کیں۔ عبدالستار دلوی مقدمے میں ترقی پسند تحریک پر اپنے تاثرات کا اظہار اسی طرح کرتے ہیں:

''نثر اور نظم دونوں میں ترقی پسند تحریک نے انتہائی اہم رول ادا کیا ہے۔ تمام تر اختلافات اور نقطہ نظر میں فرق کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فی زمانہ اردو کی ادبی رفتار کو اس تحریک سے توانائی اور سمت حاصل ہوئی...... تاہم مابعد ترقی پسند تحریک کے نقطہ نظر سے نئے تجربات اور نئے حالات کے پیش نظر فرق ضرور آیا۔ جو فطری تھا تاہم ترقی پسند تحریک کی افادیت بہر طور اپنی جگہ قائم ہے۔'' (''کرشن چندر شخص اور ادیب''، ص: 8)

عبدالستار دلوی کا یہ خیال کہ تمام اختلافات اور نقطہ نظر میں فرق کے باوجود ماننا پڑتا ہے کہ ترقی پسند تحریک نے اردو ادب کو ایک توانا سمت اور رفتار دی ہے۔

عبدالستار دلوی آگے اردو افسانے کے پانچ ستون، پریم چند، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی کو بتاتے ہیں اور یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان پانچوں میں پریم چند کے علاوہ باقی چار افسانہ نگاروں کا تعلق ترقی پسندی سے ہے۔ وہ مقدمے کے اس حصے میں یہ رائے بھی دیتے ہیں کہ اردو افسانے میں پریم چند کے بعد کرشن چندر کا نام لیا جا سکتا ہے کیوں کہ کرشن چندر نے پریم چند کی روایت کو آگے بڑھایا مگر انہوں نے جلد ہی اپنا

طرز بھی پیدا کر لیا۔

کرشن چندر کی ادبی شخصیت ہمہ پہلو ہے۔ جیسے افسانہ نگار، ناول نگار، ڈرامہ نگار، مزاج نگار، انشائیہ نگار اور اپنی رپورتاژ نگاری کی وجہ سے ادب میں نمایاں مقام و مرتبے کے حامل ہیں۔ بقول عبدالستار دلوی ''کرشن چندر کی شہرت اور مقبولیت کی وجہ سے وہ اردو کے زود نویس ادیب ہیں اور اس زود نویس کی وجہ سے ان کے فن کو بہت نقصان پہنچا ہے۔

عبدالستار دلوی کے مطابق کرشن چندر کے پہلے مجموعے ''طلسم خیال'' کے تمام افسانے رومانی طرز کے ہیں۔ ان میں کشمیر کے مرغزار، صبح و شام کی منظر کشی، آبشاروں کا ترنم ملتا ہے اور یہ سب کسی خواب کی کیفیت نہیں بلکہ زندگی میں آگے بڑھنے کا حوصلہ قاری میں پیدا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ٹوٹے ہوئے تارے، کالو بھنگی، بالکونی، زندگی کے موڑ پر، گرجن کی ایک شام، ان داتا، دو فرلانگ لمبی سڑک، تائی ایسری، شہزادہ، تین غنڈے، مہالکشمی کا پل وغیرہ افسانوں سے ان کے عہد بہ عہد فکری اور فنی ارتقاء کا اندازہ ہوتا ہے۔ کرشن چندر کے یہاں عصری سماجی و معاشی موضوعات کبھی کہانی کی شکل لے لیتے ہیں۔ یا طنز و مزاح کا اسلوب اختیار کر لیتے ہیں۔ اور وٹامن، جامن کا پیڑ وغیرہ مضامین ان کو سماجی نقاد کا درجہ دلاتے ہیں۔ دراصل کرشن چندر کے ناولوں میں شکست اور جب کھیت جاگے شہرت رکھتے ہیں۔ مگر بہ حیثیت ناول نگار کرشن ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیوں کہ ان کی شناخت بہ حیثیت افسانہ نگار کے مسلم ہے۔ اس کے علاوہ کرشن چندر کی تمثیلی کہانیاں عصری سیاست اور پستی اقدار کا المیہ پیش کرتیں ہیں۔ اور ان کا رپورتاژ ''پودے'' صنف رپورتاژ نگاری میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔

عبدالستار دلوی کے خیال میں کرشن چندر ایک عہد ساز افسانہ نگار اور تخلیقی فن کار ہیں۔ انہوں نے نئی نسل کو متاثر بھی کیا ہے۔ یہاں یہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ کرشن چندر نے جہاں ادبی کاوشوں سے اردو ادب کے سرمایے میں قابل لحاظ اضافہ کیا ہے۔ وہیں آزادی کے بعد اردو کے جانباز سپاہی کی طرح اردو دشمنوں کے مدمقابل بھی کھڑے ہوتے رہے ہیں۔ اپنی اردو نوازی یا اردو دوستی سے متعلق کرشن چندر نے خود کہا کہ اگر میری ماں غریب

ہو جائے تب بھی وہ میری ماں ہے۔عبدالستار دلوی کرشن چندر کی اردو دوستی یا اردو نوزی سے متعلق لکھتے ہیں:

''وہ ہر منزل پر ناز یبا اور معاندانہ حملوں کو روکتے اور اس زبان کے سیکولر کردار، تہذیبی عظمت ادبی حسن کی حفاظت کرنے میں مشغول رہے۔''

(''کرشن چندر شخص اور ادیب''، ص:10)

کرشن چندر کا اردو اور اردو ادب سے متعلق سرمایہ ہمارا قابل قدر ورثہ ہے۔اس ورثے کے پیش نظر بمبئی یونی ورسٹی میں جب شعبہ اردو قائم کیا گیا تو اس میں ''کرشن چندر چیئر'' مختص کر کے کرشن کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔اور جب عبدالستار دلوی صدر شعبہ اردو و کرشن چندر پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے تو انہوں نے پہلے ہی سال میں یعنی اگست 1983ء میں ''کرشن چندر: معاصر اردو افسانہ'' کے زیر عنوان ایک قومی سمینار کا اہتمام کیا ہے۔ جس میں پڑھے گئے جملہ بیس مقالات اور کرشن چندر کے دو یادگار مضامین اس کتاب کا حصہ ہیں:

1۔ ترقی پسند افسانے کے پچاس سال : ڈاکٹر صادق

2۔ اردو افسانہ نگاری کے رجحانات : پروفیسر مجتبیٰ حسین

3۔ جدید اردو ناول : پروفیسر قمر رئیس

4۔ اردو افسانے میں پریم چند کی روایت : ڈاکٹر صادق

5۔ کالو بھنگی: ایک کردار، ایک علامت : ڈاکٹر علی سردار جعفری

6۔ کرشن چندر کی افسانہ نگاری : پروفیسر احتشام حسین

7۔ کرشن چندر کا کردار تائی ایسری : پروفیسر ابوالکلام قاسمی

8۔ شہزادہ۔ایک اداس روح کا نغمہ : انور خان

9۔۔ کرشن چندر اردو افسانے کا ایک اہم باب : محمد علی صدیقی

10۔ کرشن چندر بہ حیثیت افسانہ نگار : عزیز قیسی

11۔ کرشن چندر کا فنی شعور : پروفیسر حامدی کشمیری

12۔ کرشن چندر : پروفیسر خلیل الرحمٰن اعظمی

13۔ کرشن چندر کی انشائیہ نگاری : پروفیسر سیدہ جعفر

14۔ کرشن چندر کا ذہنی اور فنی سفر : ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی

15۔ کرشن چندر کا ناولٹ دادر پل کے بچے : ڈاکٹر یونس اگاسکر

16۔ کرشن چندر: ایک تاثر : پروفیسر گیان چند جین

17۔ کرشن چندر ایک عہد کا نام : شہزاد منظر

18۔ کرشن چندر کے افسانوں میں سماجی طنز : ڈاکٹر غلام احمد ڈار

19۔ مزاح نگار کرشن چندر : یوسف ناظم

20۔ کرشن چندر اور یشپال : ڈاکٹر رشید آثار

21۔ ن۔م۔ راشد کی شاعری : کرشن چندر

22۔ گھر آنگن کی شاعر : کرشن چندر

بہ حیثیت مجموعی کہا جا سکتا ہے کہ عبدالستار دلوی نے اپنے مختصر مگر جامع مقدمے میں کرشن چندر کو مختلف حیثیتوں سے پیش کیا ہے۔ اتنا ہی نہیں انہوں نے یہ بھی واضح کر دیا کہ کرشن چندر نے کس کا اثر قبول کیا اور کون ان سے متاثر ہے واقعہ یہ ہے کہ یونی ورسٹیوں اور مختلف اداروں میں سمینارس ہوتے رہتے ہیں۔ اور ان سمیناروں کے مقالات، مقالہ نگاروں اور چند قارئین ہی تک محدود ہو کر وقت کے ساتھ بے اثر ہو جاتے ہیں۔ مگر عبدالستار دلوی نے ان مقالات کو اپنے مقدمے کے ساتھ مرتب کر کے ان کو ادب میں محفوظ کر دیا ہے۔ جس کی بدولت یہ کتاب

کرشن چندر پر ایک دستاویز بن گئی ہے۔

4.1.11۔نوائے سروش (محمود سروش: شخصیت، شاعری اور خدمات:

عبدالستار دلوی نے ''نوائے سروش'' کو ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی کی مدد سے ترتیب دے کر 1998ء میں فاران پبلشرز، ممبئی سے شائع کیا ہے۔ جس کی قیمت 75 روپے اور ضخامت 96 صفحات ہیں اور کتاب ہذا کے سرورق اور پشت ورق پر محمود سروش کی خوب صورت تصاویر درج ہیں۔ درحقیقت یہ کتاب محمود سروش کے انتقال کے بعد ان کے فن اور شخصیت پر لکھے گئے مقالات کا مجموعہ ہے۔

عبدالستار دلوی نے اس کتاب پر مختصر سا ابتدائیہ لکھا ہے جس میں انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ وہ اور ان کی شریک حیات محترمہ میمونہ دلوی دونوں دوراںؔ ڈاکٹریٹ محمود سروش کے وسیع کتب خانے سے استفادہ کرتے تھے۔ دراصل محمود سروش آپ کے استاد محترم ڈاکٹر عالی جعفری کے دوستوں میں سے تھے۔ اور آگے انہوں نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ محمود سروش بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ ''متاعِ ہنر'' کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اس کے علاوہ وہ اردو، انگریزی، فرانسیسی، سنسکرت، مراٹھی اور گجراتی زبانوں پر عبور رکھتے تھے اور اسلامیات پر ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ مگر انہوں نے ''متاعِ ہنر'' کے علاوہ اپنی کوئی دوسری یادگار نہیں چھوڑی ہے۔ لیکن وہ ہمیشہ لکھنے والوں کا حوصلہ بڑھاتے تھے۔ اپنے کتب خانے سے انہیں استفادے کا موقع دیتے تھے۔ اور اپنے وسیع مطالعہ سے انہیں (لکھنے والوں) فیضیاب کرتے تھے۔ جس بنا پر ان کی شخصیت ممبئی کی علمی و ادبی دنیا میں ایک مقام رکھتی ہے۔ اسی لیے جب ان کا انتقال ہوا تو ان پر ایک باقاعدہ سمینار کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں پڑھے گئے مقالات یوں ہیں:

1۔	''متاعِ ہنر'' کے تناظر میں	: ڈاکٹر آدم شیخ
2۔	محمود سروش: شخص اور شاعر	: ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی

3۔	ہر کیفیت کا ذکر مری شاعری میں تھا	:	ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی
4۔	حق مغفرت کرے......	:	سید بشارت شکوہ
5۔	سروش انگاہ اور آئینے کے درمیان	:	عارف احمد جی
6۔	اک والہانہ پن مری فرزانگی میں تھا	:	انور خان
7۔	محمود سروش کی شاعری	:	عبدالاحد ساز
8۔	محمود سروش میری نظر میں	:	نیاز بنارسی
9۔	لالہ صحرا	:	پروفیسر یعقوب عمر
10۔	سفر کی مدت گزر دی جس نے	:	عثمان غنی عادل
11۔	''متاعِ ہنر'' کی شاعری	:	تاثرات
12۔	تاریخ وفات حضرت محمود سروش (مرحوم)	:	مولانا حسن عباس فطرت

عبدالستار دلوی نے محمود سروش: شخصیت اور شاعری اور خدمات سمینار میں پڑھے گئے مقالات کو اپنے مختصر مگر جامع ابتدائیہ کے ساتھ ترتیب دے کر نہ صرف ادب میں اضافہ کیا ہے بلکہ محمود سروش کو بھی ادب میں زندہ رہنے کا جواز دے دیا ہے۔

4.1.12۔علی سردار جعفری: شخص، شاعر اور ادیب:

عبدالستار دلوی کی مرتبہ تصانیف میں ایک اور وقیع کتاب ''علی سردار جعفری ''شخص، شاعر اور ادیب'' ہے۔ جس کو انہوں نے 2002ء میں حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ، پونے سے شائع کیا ہے۔ جس کی ضخامت 518 صفحات اور قیمت 400 روپے ہے اور انہوں نے انتساب کتاب ان عروس البلاد بمبئی کے نام کیا ہے جس میں ترقی پسند تحریک اور علی سردار جعفری کی شخصیت اور شاعری پروان چڑھی ہے۔ اس کے بعد کتاب میں

اندر کمار گجرال (سابق وزیر اعظم ہند) کی علی سردار جعفری سے متعلق ایک تاثراتی تحریر ہے، جس میں انہوں نے علی سردار جعفری کے انتقال کو ادبی دنیا کے لیے دردناک سانحہ قرار دیتے ہوئے کہا ہے:

''آزادی کے بعد کچھ کم نظروں نے ہندی ادو کے درمیان ایک خلیج پیدا کردی۔ سردار جعفری ان چند لوگوں میں سے تھے جنہوں نے اس خلیج کو پاٹ کر دائمی رشتوں کو مضبوط کیا۔ آج اردو کے لیے ماحول میں جو خوشگوار تبدیلی آئی ہے اس میں سردار جعفری کا خاصا دخل ہے۔''

علی سردار جعفری سے متعلق اندر کمار گجرال کے تاثرات پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ علی سردار جعفری کی شخصیت ترقی پسند تحریک کے علاوہ آزادی کے بعد اردو ہندی تناظر میں بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

کتاب ہذا میں اس کے بعد منور پیر بھائی (چیرمین حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ، پونے) کا سپرد قلم کیا گیا ''اپنی بات'' ہے۔ جس میں انہوں نے علی سردار جعفری کو ادیب و شاعر سے بڑھ کر ایک دانشور، مفکر اور مدبر بتایا ہے۔

عبدالستار دلوی نے اپنے حرف اول کی تمہید میں ترقی پسند تحریک کو اردو شاعری کا نشاۃ ثانیہ لکھا ہے۔ اور آگے لکھتے ہیں کہ ہماری اردو شاعری عہد قدیم سے ہیئت کے اعتبار سے ردیف وقوافی، موضوع ومواد کے اعتبار سے عشق ومحبت کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ ہمیں قدیم اردو شاعری میں مکمل زندگی کا عکس نہیں ملتا کیوں کہ قدیم اردو شاعری کا یہ دور ہماری مٹتی ہوئی تہذیب کا آخری دور ہے۔ جس میں شاعری صرف اور صرف عیاشی اور وقت گزاری کا ذریعہ بن کر رہ گئی تھی جب کہ ہماری روایتی شاعری کی ایک دین ''غزل'' ایسی صنف سخن تھی جو اپنے اندر دنیا کی وسعتوں کو سمولینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ لیکن ہمارے قدیم دور کے شعرأ صنف غزل کی بے پناہ وسعتوں سے بے خبر رہے۔

عبدالستار دلوی کے خیال میں نظیر اکبر آبادی وہ واحد شاعر ہیں جنہوں نے اس روایت سے ہٹ کر

شاعری کی۔ نظیر کی اس نئی روایت کو بعد میں حاؔلی، شبؔلی، محمد حسین آزاد اوران کے کچھ بعد کے زمانے میں اقبال نے آگے بڑھایا۔ ان متزکرہ بالا شعرا کی شعوری کوششیں اردو شاعری کو تاریکی سے باہر نکال لانے میں تو کامیاب ہوئیں لیکن وہ اس روایت کو باقاعدہ تحریک کی شکل نہ دے سکے۔ لیکن 1936ء میں بنّے بھائی سجاد ظہیر کی رہنمائی میں ترقی پسند تحریک کی بنیاد ڈالی گئی تو وہ ادیب وشعرا جو وقت کی ضرورت کو سمجھ پا رہے تھے، اس تحریک سے وابستہ ہوگئے۔ اس تحریک کا ایک منشور بنا کر پہلی ترقی پسند کانفرنس لکھنو میں منعقد ہوئی تو پریم چند نے اس سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا۔'' اس تحریک کے سب سے سرگرم رکن علی سردار جعفری تھے۔ دراصل اشتراکیت ترقی پسند تحریک کا جز بن کر ابھری تو علی سردار جعفری بھی اس کے اثر سے نہ بچ سکے۔ لہٰذا وہ بھی اپنی نظم ونثر دونوں میں اشتراکیت کی روشنی میں زندگی کے مسائل کا حل تلاش کرتے رہے۔ اور عبدالستار دلوی اسی اشتراکیت سے متعلق یوں اپنی رائے دیتے ہیں:

> ''ایک جاندار انداز فکر اور زندگی کے ایک منضبط لائحہ عمل کی حیثیت سے اشتراکیت قابل احترام ہے۔ لیکن اس کو انسانیت کے سارے مسائل کا حل اور تمام دکھوں کا علاج سمجھ لینا ایک قسم کی انتہا پسندی ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو اشتراکیت کے منفی پہلو کی شکل میں اکثر سامنے آتی رہی۔''

(''علی سردار جعفری شخص، شاعر اور ادیب'' ص:16)

علی سردار جعفری نے اپنی شعری ونثری تحریروں میں اپنے اشتراکی نظریات کی ترجمانی کی ہے۔ اشتراکیت سے اردو زبان وادب دونوں کو فائدہ پہنچا ہے مگر اشتراکیت سے متعلق ان کی رائے سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اشتراکیت کو ہی دنیا کے سارے مسائل کا حل سمجھ لینا بھی انتہا پسندی ہے جو کہ ایک منفی طرز فکر کی علامت ہے۔

عبدالستار دلوی کے مطابق ترقی پسند تحریک کے ابتدائی ادوار میں جوؔش اور بعد میں اقباؔل اپنی شاعری

سے نوجوان ادیب وشعرأ میں ہی ایک انقلابی شاعر علی سردار جعفری ہیں۔ جن کی ابتدائی دور کی شاعری پر جوشؔ اور اقبالؔ دونوں کا اثر با آسانی دیکھا جاسکتا ہے۔ لیکن جلد ہی انہوں نے اپنا خود کا لہجہ اور رنگ ایجاد کرلیا۔ انہوں نے دنیا کے ہر لمحہ بدلتے حالات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے کیوں کہ وہ انسانیت کے دردوغم اور مصائب وآلام کو دیکھ کر تڑپ اٹھتے ہیں اور اس کے حل کے طور پر اشتراکیت کو پیش کرتے ہیں۔ تو ان کے قارئین بھی بڑی حد تک اس حل سے مطمئن نظر آتے ہیں۔ کیوں اشتراکیت کم ازکم نظریاتی طور پر تو ناانصافیوں اور ظلم وستم کا مداوا کرتی ہے مگر عملی طور پر اشتراکیت کتنی کامیاب ہوگی یہ ابھی دیکھنا باقی ہے۔ بہر طور علی سردار جعفری کی شاعری میں اشتراکیت نظریاتی سطح پر ہی سہی لیکن پورے خلوص کے ساتھ ملتی ہے جوان کو نئی قدروں کے نمائندہ شاعر کی حیثیت سے تسلیم کرنے کے لیے کافی ہے۔ عبدالستار دلوی نے علی سردار جعفری کی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے ان کے شعری موضوعات سے متعلق لکھا ہے:

> ’’سردار جعفری نے زیادہ تر حالاتِ حاضرہ اور زندگی میں روز بہ روز ابھرنے والے نت نئے مسائل کو ہی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ اسی لیے فنی اعتبار سے ادب کے بعض ائمہ کی جانب سے ان پر یہ اعتراض کیا جاتا رہا ہے کہ ان کی شاعری صرف ایک وقتی نوعیت کی ہنگامی شاعری ہے۔ لیکن اس اعتراض کو اعتراض برائے اعتراض ہی کہا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ حقیقت میں ہر شاعر کی شاعری وقت اور ہنگامی نوعیت کی ہوتی ہے۔ ایک کامیاب شاعر اپنے دور کا نباض ہوتا ہے وہ اپنے ماحول میں جو کچھ دیکھتا ہے اسی کو اپنی شاعری میں پیش کر دیتا ہے۔‘‘ (’’علی سردار جعفری شخص، شاعر اور ادیب‘‘ ص:17)

عبدالستار دلوی کے اس خیال سے اتفاق کیا جاسکتا ہے کہ ہر کامیاب شاعر اپنے دور کا نباض ہوتا ہے۔ اور وہ جو کچھ اپنے ماحول میں دیکھتا ہے۔ اسی کو اپنی شاعری میں پیش کر دیتا ہے۔ لیکن سردار جعفری کی شاعری صرف اپنے دور کی وقتی، ہنگامی اور نباض شاعری نہیں ہے بلکہ ان کی شاعری پوری انسانیت کے دردوغم اور مصائب وآلام کی

شاعری ہے جن سے وہ خود بھی متاثر ہیں۔اسی لیےان کا لہجہ ہمدردانہ ہوتا ہے جو قارئین کوان تمام مشکلوں سے لڑنے کی طاقت دیتا ہے۔

عبدالستار دلوی حرف اول میں آگے سردار جعفری کی حالاتِ حاضرہ پر کہی ہوئی نظموں پر گفتگو کرتے ہوئے ان کی نظم ''کون دشمن ہے'' کوایک معرکتہ الآرا نظم قرار دیتے ہیں۔ جو 1965ء کی ہندو پاک جنگ کے دوران کہی گئی ہے۔اس نظم میں شاعر پاکستانی افواج سے مخاطب ہوکر کہتا ہے ۔

وہ سب جو غیر نظر آرہے ہیں اپنے ہیں
سمجھ لیا ہے جسے تم نے ملک کی سرحد
وہ سرحد دل و جان ہے ہمارا جسم ہے وہ
ادب سے آؤ غالب کی سرزمین ہے یہ
ادب سے آؤ کہ ہے میر کا مزار یہاں
نظام وکاکی و چشتی کے آستانے ہیں

شاعراسی نظم میں آگےانہیں احساس دلاتا ہے کہ ۔

ہمارے پاس ہے کیا درد مشترک کے سوا
مزا تو جب تھا کہ مل کر علاجِ جان کرتے
خود اپنے ہاتھ سے تعمیر گلستاں کرتے
ہمارے درد میں تم اور تمہارے درد میں ہم
شریک ہوتے پھر جشن آشیاں کرتے

ان اشعار میں شاعر نے کہا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کے پاس مشترکہ درد وغم کےعلاوہ اور

بھی ہے کیا؟ نظم کے باقی حصے بھی ہندو پاک جنگ کے پس منظر ہی میں ہیں۔ عبدالستار دلوی اپنے مضمون ''ہندوستانی ادب میں تخلیقی لین دین اور سردار جعفری کی شاعری'' مشمولہ کتاب ہذا میں سردار جعفری کے شعری موضوعات اور خاص کر ہندو پاک جنگ سے متعلق موضوع پر یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

''جعفری صاحب کے موضوعات میں تنوع ہے۔ مغرب سے مشرق تک، ویتنام، کوریا، کشمیر بلکہ ساری دنیا ان کی رومان انگیز انقلابی فکر کے زیر اثر ان کی شاعری کا موضوع رہی۔ لیکن انہوں نے ساری دنیا کے غم کو اپنے سینے میں جگہ دی، وہیں پر وہ ملکی مسائل، ہندوستان کی تہذیبی روایات اور مشترکہ تہذیب اور مذہبی رواداری اور بھائی چارہ اور صلح و آشتی کو اپنی شاعری میں ایک بنیادی قدر کے طور پر پیش کرتے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ہندو پاک جنگ کے پس منظر میں ہی کہی گئی ان کی نظمیں ''کون دشمن ہے؟'' اور ''صبح فردا''...... جو ان کی حب الوطنی، وسیع المذہبی اور برصغیر کے دو مختلف سیاسی اکائیوں کے باوجود مشترکہ دردوغم اور مشترکہ تہذیبی ورثے اور ان کے لیے عزت و احترام کی علامتیں ہیں۔'' (''علی سردار جعفری شخص، شاعر اور ادیب'' ص:273)

علی سردار جعفری کو ہندو پاک جنگ ہی نہیں دنیا میں کہیں بھی کسی بھی شکل میں جنگ سے نفرت ہے۔ جس کا اظہار انہوں نے اپنی متذکرہ بالا نظم ''کون دشمن ہے؟'' میں بھی کیا ہے اور مندرجہ ذیل نظم ''دعا'' میں بھی کیا ہے ملاحظہ کیجیے:

پھر چلا موت کا دیوتا............
خون کے چھینٹے ہیں شبنم کے پیراہنوں پر
مندروں مسجدوں اور کلیساؤں کے دامنوں پر
اس کا آغاز سب کچھ ہے

انجام کچھ بھی نہیں ہے

حاصل قتل وغارت ہے کیا؟

چنداجڑے ہوئے شہر، جھلسے ہوئے راستے

سرنگوں بیوگی

اشک آلودہ زخم خوردہ یتیمی

عبدالستاردلوی کے مطابق علی سردار جعفری کو جنگ سے نفرت ہے۔ دوران جنگ ہونے والے قتل و غارت گری سے نفرت ہے۔اس بات کا اظہار سردار جعفری نے متعدد بار اپنی شاعری میں کیا ہے۔ان کی نظم ''لہو'' بھی اس سیاق وسباق میں عمدہ مثال ہے۔

یہ لہو کافر نہیں، مرتد نہیں، مسلم نہیں

وید وگیتا کا ترنم، مصحف یزداں کا لحن

یہ لہو میرا، میرا لہو، تیرا لہو سب کا لہو

شاعر نے یہ پوری نظم ''لہو'' تقسیم ہند و پاک کے بعد ہونے والے قتل و غارت گری وخون ریزی سے متعلق کہی ہے۔شاعرکواس طرح کی چیزوں سے نفرت ہے۔جس کا اظہار انہوں نے بارہا اپنے کلام میں کیا ہے۔

عبدالستاردلوی علی سردار جعفر کے شعری موضوعات پر گفتگو کرتے کرتے جنگ اور ہند و پاک جنگ سے متعلق ان کے خیالات اور اس موضوع پر کہی گئی ان کی نظموں کا مکمل احاطہ کرنے کے بعد اب سردار جعفری کی نظموں میں سچائی، صداقت اور اس قسم کے دوسرے لوازمات کا ذکر کرتے ہیں۔اس ذیل میں ان کی پہلی نظم پیراہن شرر ہے۔

کوئی دیوانہ ہے لیتا ہے سچ کا نام اب تک

فریب و مکر کو کرتا نہیں سلام اب تک

اس پوری نظم میں شاعر نے یہی خیال پیش کیا ہے کہ موجودہ زمانے میں جو صداقت، سچائی کا پاس ولحاظ رکھتا ہے وہ دنیا میں ہمیشہ سنگسار اور سزا اوار ہوتا ہے۔ اس سلسلے کی ایک اور طویل تمثیلی نظم ''نئی دنیا کو سلام'' ہے جو بقول عبدالستار دلوی ''یہ ایک تمثیلی نظم ہے جو ایک بالکل نئے انداز میں رزمیہ شاعری کی ایک نمائندہ شکل ہے۔'' یہ پوری نظم دو طبقوں حاکم اور محکوم یا ظالم ومظلوم کے درمیان کی کشمکش پر مبنی ہے۔ اس نظم میں چند کردار ہیں جیسے جاوید اور مریم جو کہ ایک نیا شادی شدہ جوڑا ہے۔ جو دراصل جدو جہد آزادی کی علامت ہے۔ ایک کردار ''نامہ بر'' ہے جو اس تمثیلی نظم کے لیے ضروری تھا۔ اس نظم کا سب سے اہم کردار جاوید و مریم کا ہونے والا بچہ ہے جو نئی نسل کی علامت ہے۔ یہاں یہ تمام کردار محکوم اور فرنگی حکومت حاکم کے طبقوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ عبدالستار دلوی نے آگے نظم کے کئی حصوں جیسے ''صبح کی آمد کی پیشن گوئی''، ''جاوید کی موت پر مریم کی گریہ وزاری'' نامہ بر کے تسلی بخش کلمات، اور ''اپنے بچے یعنی نئی نسل کے لیے جاوید کا پیغام وغیرہ حصوں پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ عبدالستادلوی اس نظم پر اپنا مجموعی تاثر اس طرح دیتے ہیں:

> ''''نئی دنیا کو سلام'' سردار جعفری کی ایک شاہکار نظم ہے۔ جس میں ان کی فنکارانہ صلاحیتیں پوری طرح اجاگر ہوتی ہیں۔ اور وہ ایک تمثیل کی شکل میں دنیا کو جہد مسلسل اور ظلم و جبر کے خلاف لڑنے کی تلقین کرتے ہیں۔''

(''علی سردار جعفری شخص، شاعر اور ادیب'' ص:25)

عبدالستار دلوی کا خیال ہے کہ ''نئی دنیا کو سلام'' علی سردار جعفری کا شاہکار ہے۔ اس سے پروفیسر شکیل الرحمٰن بھی متفق ہیں وہ اپنے مضمون ''نئی دنیا کو سلام۔ جمالیاتی جہتیں'' مشمولہ کتاب ہذا میں لکھتے ہیں:

> ''نئی دنیا کو سلام'' جدید اردو شاعری کی تاریخ کا ایک خوب صورت صفحہ ہے۔
> سبلائم اور بیوٹی فل (Sublime and Beautiful) کا دلکش نمونہ۔
> سردار جعفری کے تخلیقی تخیل یا تخلیقی وژن کا ایک شاہکار، اس کی جمالیاتی جہتیں

> مختلف رسوں کی لذتیں لیے ہوئے ہیں۔ اس کے نغماتی فارم (Melodic Form) اس کے آہنگ اور اسلوب اور ڈکشن نے شاعر کے ہم عصروں کو بھی متاثر کیا ہے۔ اور نئی نسل کے فنکاروں کو بھی طویل ڈرامائی یا تمثیلی نظموں کی جانب جو شعرأ بڑھے ہیں ان پر بلاشبہ ''نئی دنیا کو سلام'' کا اثر رہا ہے۔''

(''علی سردار جعفری شخص، شاعر اور ادیب'' ص:249)

مختصر کہا جاسکتا ہے کہ ''نئی دنیا کو سلام'' سردار جعفری کی ایک نہایت ہی اہم اور یادگار نظم ہے۔ جس نے نہ صرف شاعر کے ہم عصروں بلکہ آنے والی نسل کے شعرأ کو بھی متاثر کیا ہے۔

عبدالستار دلوی اپنے حرف اول میں آگے سردار جعفری کے سیاسی نظریات اور خاص کر اشتراکیت کو موضوعِ بحث بناتے ہیں۔ بقول عبدالستار دلوی سردار جعفری نے اپنی نظم ''میرے عزیزو۔ میرے رفیقو'' میں اپنی اشتراکیت کی تفسیر پیش کی ہے۔

میرے عزیزو۔ میرے رفیقو
مری کمیونزم کچھ نہیں ہے
یہ عہد حاضر کی آبرو ہے
مری کمیونزم زندگی کو
حسین بنانے کی آرزو ہے
یہ ایک معصوم جستجو ہے

اس پوری نظم کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ سردار جعفری کو یقین ہے کہ اشتراکیت ہی انسانیت کے سارے مسائل راتوں رات حل کرسکتی ہے۔ اور یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ سردار جعفری سرمایہ دارانہ نظام اور اس کی تباہ کاریوں سے حد درجہ نفرت کرتے ہیں۔

عبدالستار دلوی کے مطابق یہ خیال سردار جعفری کے لیے اذیت ناک ہے کہ سرمایہ داریت انسانیت کے مستقبل میں اور کیا کیا تباہ کاریاں کرے گی۔ اور ان کا حل آج ہی ہونا چاہیے۔ سردار جعفری نے اپنے اسی خیال کو اپنی نظم ''نوالا'' میں یوں پیش کیا ہے۔

ماں ہے ریشم کے کارخانے میں

باپ مصروف سوتی مل میں ہے

کوکھ سے ماں کی جب سے نکلا ہے

بچہ کھولی کے کالے دل میں ہے

جب یہاں سے نکل کے جائے گا

کارخانوں کے کام آئے گا

سردار جعفری نے اس نظم میں جس حقیقت کا انکشاف کیا ہے وہ دراصل سرمایہ داریت کا نتیجہ ہے اور اس سے ہم سب باخوبی واقف ہیں۔ پروفیسر وارث علوی اپنے مضمون ''علی سردار جعفری کی شاعری'' مشمولہ کتاب ہذا میں نظم ''نوالا'' پر یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

''اس نظم میں جس تلخ حقیقت کا بیان ہوا ہے۔ وہ ہر مزدور، گھر بار، ہر بچے کی حقیقت ہے۔ ایسا ہی ہوتا ہے لیکن اس حقیقت کو ہم نے کبھی اس طرح نہیں دیکھا تھا۔ ہم تو دیکھتے تھے کہ بچہ کھولی میں رہتا ہے اور جب بڑا ہوگا تو کام پر جائے گا۔ صرف ''کالے دل'' اور ''کام آئے گا'' کے لفظوں نے کیسی کڑوی سچائی کو بے نقاب کیا ہے جو حقیقت میں پنہاں تھی۔ کالا دل اور کام آئے گا، ان لفظوں کے انوکھے استعمال میں شاعری کی مسرت بھی پنہاں ہے اور بصیرت بھی۔''

(''علی سردار جعفری شخص، شاعر اور ادیب'' ص:155)

بقول عبدالستار دلوی سردار جعفری کی نظر میں صرف اشتراکیت ہی تمام مسائل سے نجات دلا سکتی ہے۔ جہاں سرمایہ اور محنت اشتراکیت کا بنیادی مسئلہ ہے۔ وہیں انسانی ہاتھ محنت اور جفاکشی کی علامت ہیں۔ اور ''ہاتھوں کا ترانہ'' سردار جعفری کی ایک بے مثال نظم ہے۔

ان ہاتھوں کی تعظیم کرو

ان ہاتھوں کی تکریم کرو

دنیا کو چلانے والے ہیں

ان ہاتھوں کو تسلیم کرو

سردار جعفری نے اس پوری نظم ''ہاتھوں کا ترانہ'' میں انسانی ہاتھوں کو اہم کردار بنا کر پیش کیا ہے۔ اتنا ہی نہیں شاعر کے خیال میں انسانی ہاتھ ہی سب کچھ ہے اور کوئی دوسری شئے اس سے افضل نہیں۔ پروفیسر وارث علوی اس نظم سے متعلق یوں اپنی رائے دیتے ہیں:

> ''خطابت اپنے زور پر جزوی صداقت کلی صداقت ثابت کرنا چاہتی ہے اور اس لیے تضادات اور تناقص کا شکار ہوتی ہے، جس کی مثال سردار کی نظم ''ہاتھوں کا ترانہ'' ہے یہ نظم سردار کو بہت پسند ہے اور اس میں شک نہیں کہ زور بیان اور قادر الکلامی کا اچھا نمونہ ہے۔ لیکن ہاتھ انسانی جسم کا ایک حصہ ہیں اور انسانی محنت جس کی علامت ہیں انسانی تمدن اور تہذیب کی تعمیر میں اہم بہت اہم لیکن جزوی رول ہی ادا کرتی ہے اور اسے کلی حقیقت سمجھنا انسان کی دوسری تخلیقی قوتوں کے انکار کے مترادف ہے۔'' (''علی سردار جعفری شخص، شاعر اور ادیب'' ص:60)

پروفیسر وارث علوی کی اس رائے سے اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ انسانی ہاتھ اور ان سے انجام پانے والی تمام سرگرمیاں جزوی حیثیت رکھتی ہیں نہ کہ کلی۔ کیوں کہ اگر شاعر کی طرح ان انسانی ہاتھوں کو ہی کلی حیثیت دی

جائے تو وہ انسان کی دوسری تخلیقی قوتوں وصلاحیتوں سے انکار کرنا ہوگا۔

عبدالستار دلوی نے حرف اول میں آگے علی سردار جعفری کی ایک یادگار نظم ''ایشیاء جاگ اٹھا'' کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ''ایشیاء جاگ اٹھا'' سردار جعفری کی نہ صرف طویل نظم ہے بلکہ ایک تاریخی دستاویز ہے جس میں سامراجی طاقتوں کے ظلم وستم اور ناانصافیوں کے ساتھ ساتھ اہل ایشیاء کے صبر ومحنت اور اپنی مٹی سے بے پناہ پیار وغربت کا بیان ہے۔ جہاں ظالموں کو اس بات کا غرور ہے کہ انہوں نے غربت وافلاس میں مبتلا عوام کو تہذیب کی دین دی ہے۔ تو وہیں پر مظلوموں کو ان سے شکایت ہے کہ انہوں نے صدیوں ان کا استحصال کیا ہے۔ عبدالستار دلوی اس نظم پر تفصیلی بحث کرنے کے بعد یہ مجموعی تاثر دیتے ہیں:

> ''اس نظم میں سردار جعفری کے سیاسی نظریات کا اظہار بھی بھرپور انداز میں ملتا ہے۔ جس میں انہوں نے ایشیاء کی چار ہزار سالہ تہذیب کا نقشہ پیش کرتے ہوئے یہاں کے کچلے ہوئے مظلوم عوام کے قومی جذبے کی بیداری کا ذکر کیا ہے۔'' (''علی سردار جعفری شخص، شاعر اور ادیب'' ص:30)

بہرحال ''کون دشمن ہے؟'' صبح فردا، نوالا، ایشیاء جاگ اٹھا، نئی دنیا کو سلام، ہاتھوں کا ترانہ اور لہو وغیرہ سردار جعفری کی سیاسی واشتراکی نظمیں ہیں اس کے برخلاف سردار جعفری کے کلام میں رومانی نظمیں بھی موجود ہیں۔ جن میں ''درد عشق'' ایک پھول، تیرے پیار کا نام، جب تیرا نام لیا، دور ایک چاند ہے''، چاند کو رخصت کردو، آرزو کے صنم خانے، تو مجھے اتنے پیار سے مت دیکھ، بہت قریب ہوکر، تمہارے ہاتھ اور نسیم تیری قبا وغیرہ وغیرہ نظمیں شامل ہیں۔

ادب کے تقریباً ہر شاعر کی طرح سردار جعفری نے نظموں کے ساتھ ساتھ غزلیں بھی کہی ہیں۔ ان کی غزلوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ روایتی انداز کی غزلیں نہیں ہیں ان میں ترقی پسندی کے زیر اثر زندگی کے تمام مسائل در آئے ہیں۔ جس کی وجہ سے غزل کا دامن وسیع ہوگیا ہے۔ ان کی غزلوں سے متعلق عبدالستار دلوی

کی رائے یوں ہے:

''ان کی غزل، جو ایک لطیف پیرایہ بیان، خوش آہنگ خوب صورت دلآویز اور پرکشش صنف ادب کے بجائے قدرے خشک الفاظ کا مجموعہ نظر آتی ہے۔''

(''علی سردار جعفری شخص، شاعر اور ادیب''ص:31)

سردار جعفری کی غزلوں پر اگر ''غزل کی سرخی نہ ہوتو ان کو عنوان دے کر نظم قرار دیا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ ان میں بھی وہی موضوعات ہیں جو نظم میں ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تسلسل بیان بھی ملتا ہے۔عبدالستار دلوی ان کی غزلوں سے متعلق آگے لکھتے ہیں:

''میرے خیال میں غزل کی شاعری دل کی شاعری ہوتی ہے۔لیکن سردار جعفری کی غزلیں ان کے ذہن کی پیداوار ہیں۔اسی لیے ان میں وہ رومانی سوز وگداز اور پیار ومحبت کے نازک اور لطیف تر جذبات کا رچاؤ نہیں ملتا۔ جو اردو غزل کی روح ہے۔'' (''علی سردار جعفری شخص، شاعر اور ادیب''ص:32)

عبدالستار دلوی کے اس خیال سے متفق ہونا پڑتا ہے کہ سردار جعفری کی غزلیں ان کے دماغ کی پیداوار ہیں دل کی نہیں جس کی سب سے بڑی وجہ ان کے سیاسی نظریات ہیں۔

عبدالستار دلوی حرف اول کی اگلی منزل میں سردار جعفری کی لفظیات پر جوشؔ اور اقبالؔ کا اثر بتاتے ہیں۔ جس میں جوشؔ کی طرح خوب صورت الفاظ کی مینا کاری، لہجے کا بانکپن اور صوتی گھن گرج سردار کے یہاں ملتی ہیں تو اقبالؔ کی ژرف نگاہی، فلسفے کا ترنم اور صوتی غنائیت سردار جعفری کے کلام میں شامل ہے۔

مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ اردو ادب میں سردار جعفری کا مقام بہ حیثیت نظم گو شاعر کے ہے۔ان کی متعدد نظمیں ایسی ہیں۔جن سے سردار جعفری کی ذہنی آفاقیت اور ہمہ گیری کا پتہ چلتا ہے اور ان کی نظمیں قاری کو غور وفکر کی دعوت دیتیں ہے۔

عبدالستار دلوی نے اپنے حرفِ اول میں علی سردار جعفری کے سیاسی نظریات، ان کے شعری موضوعات، ان کو بہ حیثیت نظم گو شاعر اور بہ حیثیت غزل گو شاعر کے طور پر تفصیلی گفتگو کرنے کے بعد اب علی سردار جعفری کو بہ حیثیت نثر نگار پیش کرر ہے ہیں۔ سردار جعفری جس طرح شاعری میں اپنا منفرد اسلوب اور ڈکشن رکھتے ہیں اسی طرح نثر نگاری میں بھی سحر نگار، سحر بیان اور شگفتہ اسلوب کے مالک ہیں۔ انہوں نے سردار جعفری کی نثر کو دو حصوں میں تقسیم کرلیا ہے پہلا حصہ تخلیقی نثر اور دوسرا حصہ علمی نثر کے عنوان سے رکھا ہے۔ اور انہوں نے تخلقی نثر والے حصے میں سردار جعفری کی مشہور کتاب ''لکھنؤ کی پانچ راتیں'' پر تنقیدی انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ جس میں سردار جعفری نے ''لکھنو کی پانچ راتیں'' میں اپنا ماحول، اپنا خاندانی پس منظر زندگی کا نظریہ حیات اور زندگی کے تجربات کو بڑے ہی جادو بیان اسلوب میں قلم بند کیا ہے۔ عبدالستار دلوی مذکورہ کتاب پر یوں اپنی تنقیدی رائے دیتے ہیں:

> ''لکھنؤ کی پانچ راتیں'' نہ سوانح ہیں نہ با قاعدہ یاداشتیں ہیں۔...... لکھنؤ کی پانچ راتیں اردو نثر نگاروں کا شاہکار ہے۔ جعفری صاحب کو نظم کے ساتھ نثر پر بھی بلا کا عبور حاصل تھا۔ جس کا مقابلہ نہ محمد حسین آزاد سے کیا جا سکتا ہے نہ ابولکلام کی نثر نگاری سے، بلکہ اس کا اسلوب نگارش سر سید یا شبلی کے دل خوش کن اور سحر انگیز نثری اسلوب کی یاد تازہ کرتا ہے۔ یہ لکھنؤ کی پانچ راتیں، پرنور اور عطر بیز راتیں ہیں جن میں اک طرف سردار جعفری کی زندگی کے سوانح کوائف ہیں تو دوسری طرف ادبی اعتبار سے گنگناتی ہوئی اور پر تاثیر ادبیت کا اعلیٰ نمونہ بھی ہے۔''

(''علی سردار جعفری شخص، شاعر اور ادیب'' ص:34-33)

اردو ادب میں ''لکھنؤ کی پانچ راتیں'' کی اہمیت بتاتے ہوئے پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اپنے مضمون ''عہد عزم و پیکار کی یادگار'' مشمولہ کتاب ہذا میں لکھتے ہیں:

''ترقی پسند تحریک کے تحت شائع ہونے والے پندرہ شعری و نثری کارناموں

کے علاوہ کم از کم دو کتابیں ایسی ضرور ہیں جو اپنے اسلوب کی دلکشی اور مشمولات
کی اہمیت کے بنا پر منفرد ہیں اور ہمیشہ یاد رہیں گی۔ایک سجاد ظہیر کی ''روشنائی''
اور دوسری سردار جعفری کی ''لکھنو کی پانچ راتیں''۔

(''علی سردار جعفری شخص،شاعراوراديب''ص:230)

عبدالستار دلوی اور پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی دونوں نے اس کتاب کی اہمیت وقدر و قیمت بتاتے ہوئے خاص کراس کے''دل خوش کن اور سحر انگیز'' اسلوب کا ذکر کیا ہے۔جس کی وجہ سے اس کتاب کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔بہر حال سردار جعفری کی لکھنو کی پانچ راتیں اردو کے سوانحی ادب میں گراں مایہ اضافہ ہے۔

عبدالستار دلوی نے سردار جعفری کی علمی نثر کے تحت ان کی ایک اور اہم کتاب ''ترقی پسند ادب'' کو رکھا ہے۔ یہ کتاب سردار جعفری کو نقاد اور خاص کر ترقی پسند نقاد ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔اور جہاں تک اس کتاب کے مشمولات کا تعلق ہے اس میں سردار جعفری کے ادبی تاثرات وبصیرت کے ساتھ ساتھ تعصّبات بھی شامل ہیں۔ جن سے اختلاف کے باوجود اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔اس کے علاوہ ''پیغمبرانِ سخن'' کے عالمانہ مضامین کا شمار بھی اسی ذیل میں کیا جاسکتا ہے۔

عبدالستار دلوی، سردار جعفری کو بہ حیثیت نظم گو، بہ حیثیت غزل گو اور بہ حیثیت علمی وتخلیقی نثر نگار کے پہلوؤں پر تفصیلی رائے اور وضاحت پیش کرنے کے بعد اب حرف اول میں اس مرحلے میں سردار جعفری کو بہ حیثیت مقرر پیش کررہے ہیں۔ عبدالستار دلوی بہ حیثیت ڈائرکٹر مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر اور لائبریری (1982-1967) اور بہ حیثیت صدر شعبہ اردو بمبئی یونی ورسٹی (1997-1982) پر فائز رہے ہیں۔ وہ ان دونوں اداروں سے تقریباً پندرہ پندرہ سال وابستہ رہے ہیں۔اس معیاد میں انہوں نے علی سردار جعفری کو متعدد بار بہ حیثیت مقرر مدعو کیا ہے۔اور سردار جعفری نے ان کی دعوت قبول کر کے اپنی تقاریر سے سامعین وقارئین کو حیرت زدہ کیا ہے۔اس سلسلے میں وہ شعبہ اردو بمبئی یونی ورسٹی کے افتتاحی جلسے اور شعبہ کے ایک Multi Lingual

Seminor کاخصوصی ذکر کرتے ہیں۔

عبدالستار دلوی نے حرف اول کے آخری حصے میں علی سردار جعفری کو نوازے جانے والے ایوارڈس کا ذکر کرتے ہوئے مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے سب سے بڑے ایوارڈ ''سنت گیانیشور ایوراڈ'' کے لیے سردار جعفری کے نام کے انتخاب کے بعد ہونے والی مخالفت کا تفصیلی بیان کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ کس طرح انہوں نے اردو اکادمی کی چیرمین شپ سے استعفیٰ دیا اور آخر کار سردار جعفری کو ''سنت گیانیشور ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔

عبدالستار دلوی نے جب علی سردار جعفری نے 1986ء میں اپنی عمر کے اسی سال (80 Year) مکمل کرلیں تو صدر شعبہ اردو بمبئ یونی ورسٹی کی حیثیت سے شعبے میں ایک تہنیتی جلسہ اور سمینار کا انعقاد کیا تھا۔ جس میں پڑھے گئے مقالات ان کے پاس محفوظ تھے اور سردار جعفری کے انتقال کے بعد ہونے والا پہلا تعزیتی جلسہ ''حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ'' پونے کا جلسہ اور سمینار رہے۔ جس کے کنوینز بھی عبدالستار دلوی تھے۔ آپ نے ان دونوں سمیناروں کے مقالات اور دوسرے چند اصحاب سے سردار جعفری کی شخصیت اور دیگر پہلوؤں پر مضامین لکھوا کر اس کتاب کی ترتیب وتدوین کی ہے۔ منور پیر بھائی ''اپنی بات'' مشمولہ کتاب ہذا میں اس کتاب کی ترتیب وتدوین سے متعلق لکھتے ہیں:

> ''پروفیسر عبدالستار دلوی نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ جعفری صاحب کی سرپرستی اور رہنمائی میں گزرا ہے۔ وہ جعفری صاحب کے مداح ہی نہیں حقیقی معنوں میں معتقد بھی ہیں۔ ہم انہیں ''سردار شناسی'' میں حرف آخر تسلیم کر سکتے ہیں۔ جعفری صاحب کے انتقال کے بعد جس عرق ریزی سے انہوں نے مقالات کو حاصل اور اکٹھا کیا اور ڈیڑھ دو برس جس اہتمام وریاضت سے اس کی ترتیب وتدوین میں صرف کیے وہ ایک سالک ہی کا کام ہوسکتا ہے۔ ایسا سالک جیسے بارگاہِ جعفری سے غیر معمولی اور والہانہ وابستگی اور عقیدت ہو۔''

(''علی سردار جعفری شخص، شاعر اور ادیب'' ص:14)

عبدالستار دلوی کی اس مرتبہ تصنیف میں جملہ 32 مضامین ہیں جن کو انہوں نے تین حصوں شخص، شاعر اور ادیب میں منقسم کیا ہے۔ کتاب کا پہلا حصہ علی سردار جعفری بہ حیثیت شخص ہے۔ جس میں سب سے پہلے مرتب کے قلم سے لکھا ہوا ابتدائیہ ہے۔ جس میں انہوں نے سردار جعفری کو بہ حیثیت مقرر پہلی بار مستان تالاب کے کمیونسٹ جلسے میں سنا تھا۔ یہ سلسلہ آگے بھی چلتا رہا۔ عبدالستادلوی اپنے ابتدائیہ میں گفتگو کرتے کرتے مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر اور لائبریری اور شعبہ اردو ممبئی یونی ورسٹی کی ان تمام تقاریر کا احاطہ کرتے ہیں، جس کے مقرر علی سردار جعفری تھے۔ اس حصے کے مضامین کی فہرست یوں ہے:

1۔ ابتدائیہ	:	پروفیسر عبدالستار دلوی
2۔ سوانحی خاکہ	:	پروفیسر عبدالستار دلوی
3۔ میرا سردار	:	سلطانہ جعفری
4۔ سردار جعفری کی شخصیت کے چند پہلو	:	یوسف ناظم
5۔ سردار جعفری کی یاد میں	:	رضیہ فصیح احمد
6۔ علی سردار جعفری اور انسانی اقدار	:	بشیر احمد انصاری
7۔ علی سردار جعفری کچھ یادیں کچھ باتیں	:	انیس چشتی

کتاب ''علی سردار جعفری: شخص شاعر اور ادیب'' کا دوسرا حصہ ''علی سردار جعفری بہ حیثیت شاعر'' ہے۔ اس حصے میں بھی سب سے پہلے مرتب کتاب کا ابتدائیہ ہے۔ جس میں انہوں نے ترقی پسند شعرا/ ترقی پسند تحریک اور اس کی خوبیاں وخامیاں، علی سردار جعفری کے ہیئت و مواد کے تجربے، عربی، فارسی اور مغربی ادبیات سے ان کے استفادے، علاقائی ادبیات سے استفادے اور بہ حیثیت شاعر پر مجموعی حیثیت سے اظہار خیال کیا ہے۔ اس کے علاوہ سید سجاد ظہیر کے مضمون '' بمبئی میں ترقی پسند تحریک کا منظر نامہ'' جو کہ روشنائی سے ماخوذ ہے۔ اس کو بھی Edit کر کے اس وقت کے بمبئی پر روشنی ڈالی ہے۔ اس حصے کے مضامین یوں ہیں:

1۔ ابتدائیہ : پروفیسر عبدالستار دلوی

2۔ بمبئی میں ترقی پسند تحریک کا منظر نامہ : سید سجاد ظہیر

3۔ علی سردار جعفری رومان سے انقلاب تک : پروفیسر احتشام حسین

4۔ علی سردار جعفری کی شاعری : پروفیسر وارث علوی

5۔ سردار جعفری: خواب اور شکستہ خواب : پروفیسر وحید اختر

6۔ ''نئی دنیا کو سلام'' ایک تجزیاتی مطالعہ : پروفیسر سید محمد عقیل

7۔۔ عہد عزم و پیکار کی یادگار : پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی

8۔ ''نئی دنیا کو سلام'' جمالیاتی جہتی : پروفیسر شکیل الرحمٰن

9۔ سردار جعفری کی شاعری : پرفیسر سلیمان اطہر جاوید

10۔ ہندوستانی ادب میں تخلیقی لین دین اور سردار جعفری کی شاعری : پروفیسر عبدالستار دلوی

11۔ غزل اور سردار جعفری : پروفیسر رحمت یوسف زئی

12۔ سردار جعفری کی نظم نئے ہم عصر شعراٗ کی نظر میں ؛ عبدالاحد سازؔ

13۔ سردار جعفری کی ترقی پسندی : ڈاکٹر علی احمد فاطمی

14۔ سردار جعفری اور ان کی تین نظمیں : محمد حسین پرکار

15۔ سردار جعفری کی آزاد نظم : راشد آزرؔ

16۔ سردار جعفری کا شعری سفر : پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی

17۔ سردار جعفری کی شاعری میں عصری شعور : معزہ ابراہیم قاضی

کتاب ''علی سردار جعفری: شخص، شاعر اور ادیب'' کا تیسرا حصہ علی سردار جعفری بہ حیثیت نثر نگار یا ادیب کے ہے۔ جس کے ابتدائیہ میں مرتب نے سردار جعفری کی تمام نثری تصانیف، تحقیق و تنقیدی مضامین اور مرتبہ شعری تصانیف پر لکھے گئے عالمانہ مقدمات کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔ یہ ابتدایہ اس حصے کے مضامین کے لیے پس منظر کا کام کرتا ہے۔ اس حصے کے مضامین یہ ہیں:

1۔ ابتدائیہ	:	پروفیسر عبدالستار دلوی
2۔ علی سردار جعفری اور نقد شعر	:	پروفیسر شارب ردولوی
3۔ محرم پیغمبرِ سخن: سردار جعفری	:	پروفیسر نقی حسین جعفری
4۔ علی سردار جعفری کی ادبی صحافت	:	پروفیسر محمد انور الدین
5۔ لکھنؤ کی پانچ راتیں: ایک مطالعہ	:	پروفیسر فاطمہ بیگم
6۔ مکاتیب علی سردار جعفری	:	محمد ایوب واقف
7۔ علی سردار جعفری کے مرتبہ کلاسکی دواوین	:	ڈاکٹر صاحب علی
8۔ علی سردار جعفری کی 'منزل' تعارف و تجزیہ	:	ڈاکٹر معین الدین جینابڑے
9۔ سردار جعفری کے افسانے	:	ڈاکٹر ارتضیٰ کریم
10۔ ڈراما اور علی سردار جعفری کی ڈرامہ نگاری	:	اکرام بریلوی

علی سردار جعفری کو ان کی نظم ''اجودھیا'' کی وجہ سے ''فرقہ پرست بتا کر انہیں ''سنت گیا نیشور ایوارڈ دینے کی مخالفت کی گئی تھی تو اس وقت سردار جعفری نے ''اجودھیا'' کے عنوان ہی سے ایک تحریر لکھ کر دی تھی جو امانت کے طور پر عبدالستار دلوی کے پاس محفوظ تھی۔ جس کو کتاب ہذا کے تیسرے حصے میں حرف آخر کے نام سے شامل کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سردار جعفری کی دو تقاریر کو بھی صد بند کر کے اس حصے میں شامل کر لیا گیا ہے۔

کتاب ہذا میں ان تینوں حصوں کے بعد مقالہ نگاروں کا اختصار سے تعارف بھی دیا گیا ہے۔

مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ عبدالستار دلوی نے اپنی عمر کا ایک طویل عرصہ سردار جعفری کی صحبت میں گزارا ہے جس کی وجہ سے انہیں سردار جعفری کو مختلف حیثیتوں سے قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع بھی ملا۔ ان کے دیکھے اور سمجھے ہوئے تجربات و واقعات کو انہوں نے اپنے حرف اول اور ابتدائیوں میں پیش کر دیا ہے۔ انہوں نے اپنی محنت وریاضت سے اس کتاب کو مرتب کر کے نہ صرف اپنے رہنما علی سردار جعفری کو خراج عقیدت پیش کیا ہے بلکہ ادب میں اس موضوع پر ایک وقیع کتاب کا اضافہ بھی کیا ہے۔ جس کی وجہ سے علی سردار جعفری اور عبدالستار دلوی دونوں کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

4.1.13۔جنوبی ہند میں اردو زبان وادب کی تدریس کے مسائل:

عبدالستار دلوی نے اپنی کتاب ''جنوبی ہند میں اردو زبان وادب کی تدریس کے مسائل'' کو ترتیب دے کر 2004ء میں دکن مسلم ایجوکیشن اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، پونے سے شائع کیا ہے جس کی قیمت 150 روپے اور ضخامت 130 صفحات ہیں۔

''جنوبی ہند میں اردو زبان وادب کی تدریس کے مسائل'' میں سب سے پہلے صدر دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ، پونے عابدہ انعام دار کا لکھا ہوا عرض ناشر ملتا ہے۔ جس میں انہوں نے اس کتاب کو انسٹی ٹیوٹ سے شائع کرتے ہوئے مسرت کا اظہار کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ جنوبی ہند کی ریاستوں میں اردو زبان وادب کی تدریس کے معاملے کو بھر پور توجہ کا متقاضی بتایا ہے۔

عبدالستار دلوی نے انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے اس کتاب کا پیش لفظ لکھا ہے اور اس کتاب کے مرتب بھی وہی ہیں۔ انہوں نے اپنے پیش لفظ کی ابتدا میں ہندوستان کو کثیر لسانی ملک قرار دیا ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان ایک کثیر اللسان ہی نہیں بلکہ کثیر تہذیبی ملک ہے............اس کثیر
> لسانی ماحول میں کل ہند زبان کی حیثیت سے اردو کے مسائل متنوع ہیں اور اس

علاقے کے بولنے ولوں پر علاقائی زبانوں کے اثرات کا ہونا فطری ہے۔‘‘

(’’جنوبی ہند میں اردو زبان وادب کی تدریس کے مسائل‘‘، ص۔4)

عبدالستار دلوی اپنے پیش لفظ میں آگے لکھتے ہیں کہ ’’اب علاقائی زبانیں اردو پر حاوی ہو رہی ہیں‘‘۔ اپنی اس رائے کی وضاحت وہ اس طرح کرتے ہیں:

’’تاریخی اعتبار سے اردو کی علمی وادبی اہمیت کے ساتھ فارسی اور عربی کی تعلیم بھی عام تھی۔ جس کی وجہ سے اس کا معیار برقرار تھا۔ لیکن اب جب کہ فارسی/عربی کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہیں ہے اور بعض حالات میں یہ بالکل مفقود ہے۔ اردو زبان کا معیار متاثر ہوا ہے۔ فارسی وعربی کی تعلیم کی کمی جو اردو کے لیے ایک لسانی طاقت تھی۔ اب علاقائی زبانیں اردو پر حاوی ہو رہی ہیں۔‘‘

(’’جنوبی ہند میں اردو زبان وادب کی تدریس کے مسائل‘‘، ص۔4)

اردو جو پورے ملک میں رابطہ عامہ کی زبان ہے۔ اس پر علاقائی زبانوں کے اثرات کی وجہ سے اس کی تدریس میں کئی سطحوں پر مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ اس جامع تمہید کے بعد اب وہ اپنے موضوع ’’جنوبی ہند میں مراٹھی، کنڑ، تلگو، ملیالم اور تامل کے ماحول میں اپنی شناخت بنانا چاہتی ہے۔ چوں کہ اردو ایک ملک گیر زبان ہے۔ اور ہر علاقے و ریاست میں اس کی بولیاں موجود ہیں۔ جن پر علاقائی زبانوں کے لہجے، لفظیات اور صرف ونحو بھی سیکھنے والے کی زبان کو متاثر کرتے ہیں۔ اور یہی علاقائی اثرات اردو زبان وادب کی تدریس کے لیے ایک بڑا مسئلہ ہے۔ جس پر انہوں نے تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

’’اس کثیر لسانی ماحول میں جب بچہ کی تعلیم ہوتی ہے اور وہ شمالی ہندوستان کی اردو کے مقابلے میں جسے معیاری زبان کہا جاتا ہے، تو صوتی، صرفی اور لفظی سطح پر جنوبی ہند میں اردو کی تعلیم و تدریس میں چند مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ یہ مسائل

کیا ہیں اوران کا لسانی پس منظراور تدارک کیسے ہوسکتا ہے......اس پر غور وخوض
کرنا ضروری ہے۔''

(''جنوبی ہند میں اردو زبان وادب کی تدریس کے مسائل''،ص۔6)

عبدالستار دلوی کی نظر میں زبان کی تدریس کئی سطحوں پر ہوتی ہے۔اوراس کی ضروریات بھی الگ الگ ہوتی ہیں۔جن کا تعلق پرائمری سطح پر زبان کی تدریس سے ہوتا ہے۔کیوں کہ گھر کی بول چال کی اردو سے اسے معیاری اردو کی جانب لانے کی ذمہ داری ہمارے اساتذہ کی ہے۔اس کے تحت وہ کن کن منزلوں سے گزرتے ہیں۔کیا وہ اس میں کامیاب ہیں؟اگر کامیاب ہیں تو کس حد تک اس کا بھی مطالعہ اور مشاہدہ کرنا چاہیےاوران کی رائے میں ''معیار'' اہم ہےمگر یہ کوئی ریاضی یا سائنسی فارمولہ نہیں۔اسی لیےاس میں تھوڑی سی لچک ضروری ہے۔کیوں کہ کثیر لسانی ماحول کا یہی تقاضہ ہے۔اس سلسلے میں وہ اورآگے لکھتے ہیں کہ زبان کی تدریس ثانوی سطح پر ادب سے بھی رشتہ جوڑ لیتی ہےتو کیا ہمارا طالب علم ادبی تراکیبوں،تشبیہوں استعاروں اور علامتوں کو سمجھتا ہےاوراگر نہیں تو ناکامی کے اسباب کیا ہوسکتے ہیں۔دراصل ابتدائی تعلیم کے بعد ادب کا ذوق پیدا کرنا بھی اردو کے استاد کا فرض ہے۔اسی لیے یہ بھی ایک غور طلب مسئلہ ہے۔

عبدالستار دلوی کا خیال ہے کہ''جنوبی ہند میں اردو زبان وادب کے مسائل''جنوبی ہند کی تمام ریاستوں میں ایک جیسے ہوں گےاور وہ صرف لفظیات کی سطح پر مختلف ہوسکتے ہیں۔ان مسائل کا حل بھی وہ تجویز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ مسائل ''تقابلی قواعد اور صوتیات''اور''تقابلی لفظیات'' کی مدد سے حل کیے جاسکتے ہیں۔اسی طرح ہم معیاری اردواور علاقائی اردو کی (Recall Vocabulary) ریکال اوکابولری تیار کر کےان کے درمیان کی خلیج کو پر کرسکتے ہیں۔

جنوبی ہند میں اردو زبان وادب کے تدریس کے مسائل میں ایک اور مسئلہ زبان اول اور زبان دوم کا ہے۔ان دونوں کے درمیان فرق کرنا بھی ضروری ہے کیوں کہ ثانوی زبان کی تحصیل کے دوران طلبہ جملوں کی

ساخت اور معنی کو نئی زبان میں تبدیل کرتے ہیں۔ اور علاقائی لسانی مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی لیے ہندوستان جیسے کثیر لسانی ملک میں ان مسائل کے حل کے لیے تدریسی مواد ترتیب دینا ضروری ہوگا۔ دراصل ہماری سرکاری نصابی کتابیں ایک مخصوص تعلیمی و تدریسی روایت کی پابندی کرتی ہیں۔ اسی لیے ان نئے حالات و ماحول میں ان میں تبدیلی کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح تدریسی عمل کے دوران طلبہ کو درپیش مشکلات کی تشخیص بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ جس کا تدریسی کتب کے مرتبین اور اساتذہ دونوں کو خیال رکھنا چاہیے۔ ان کے خیال میں اس مسئلے کی تشخیص، تلفظ، صرف ونحو، لفظیات کے تقابل اور جانچ سے ہو سکتا ہے۔ وہیں تشخیص کے بعد کمزور طلبہ کو مسلسل مشق سے مدد مل سکتی ہے اور یہ مشق تلفظ، صرفی خصوصیات اور املا کی ہونی چاہیے۔

عبدالستار دلوی نے بہ حیثیت ڈائرکٹر دکن مسلم ایجوکیشن اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اردو زبان وادب کی کامیاب تدریس اور اس کے صحیح نتائج سے متعلق مختلف مسائل کے پیش نظر دکن مسلم ایجوکیشن اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے اردو مینیجنگ اور ریسرچ سنٹر لکھنؤ کی اشتراک سے 26 تا 28 ستمبر 2002 کو ایک کل ہند سمینار منعقد کیا تھا۔ جس میں خاص طور پر ''جنوبی ہند میں اردو زبان وادب کی تدریس کے مسائل'' پر اسکولس سے لے کر یونی ورسٹی تک کے اساتذہ نے نظریاتی، تاریخی اور تدریسی موضوعات پر مقالات پیش کیے۔ دراصل کتاب ہذا ان ہی مقالات کا مجموعہ ہے۔ آیئے مقالہ نگار اور ان کے عنوانِ مقالات بھی دیکھتے چلیں:

موضوع		مقالہ نگار
1۔ کلیدی خطبہ بہ زبان انگریزی	:	پروفیسر لچھمی خوبچندانی
2۔ مہاراشٹر میں اردو اور لسانی منصوبہ بندی	:	پروفیسر عبدالستار دلوی
3۔ مشترکہ لسانی نصاب کے مطابق اردو کی درسی کتابو کی تالیف کے مسائل	:	محمد حسن فاروقی
4۔ مہاراشٹر میں اردو ذریعہ تعلیم مسائل اور حل	:	سردار خان
5۔ ریاست آندھرا پردیش میں اردو کی تدریس کے مسائل	:	ڈاکٹر نسیم الدین فریس

6۔ آندھرا پردیش میں اردو نصاب کا تاریخی وتنقیدی مطالعہ : ڈاکٹر فاطمہ بیگم

7۔ اردو شعری اصناف کی تدریس مسائل اور حل : ڈاکٹر یحییٰ نشیط

8۔ کرناٹک میں اردو کی نصابی کتابوں کا تنقیدی جائزہ : پروفیسر محمد نور الدین سعید

9۔ جنوبی ہند میں اردو تدریس کے مسائل : پروفیسر سلیمان اطہر جاوید

10۔ اردو رسم الخط کی تدریس کا مسئلہ : بشیر احمد انصاری

11۔ اردو کی تدریس میں تشخیص اور تدارک کی پڑھائی کی اہمیت : مسرت صاحت علی

12۔ ثانوی زبان کی حیثیت سے اردو کی تدریس کے مسائل : محمد حسین پرکار

13۔ مہاراشٹر میں نصابی کتب سال بھارتی۔ کی ترتیب وتدوین کے انتظامی

مسائل اور طریقہ کار کا اجمالی جائزہ : ڈاکٹر غلام نبی مومن

14۔ تدریسی زبان جدید لسانیات کی روشنی میں : ڈاکٹر معین الدین جینا بڑے

15۔ بمبئی میں اردو کو مادری زبان کی حیثیت سے پڑھائی کا مسئلہ : پروفیسر عبدالستار دلوی

16۔ کوکن میں اردو تعلیم : ڈاکٹر عبدالرحیم نشتر

کتاب ہذا میں ان سولہ (16) تحقیقی وتنقیدی مقالات کے بعد تمام مقالہ نگاروں کا مختصر تعارف بھی دیا گیا ہے۔

''جنوبی ہند میں اردو زبان وادب کی تدریس کے مسائل'' یہ کتاب اپنے عنوان سے تو اساتذہ کے لیے مفید مطلب نظر آتی ہے۔ مگر اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ طلبہ کے لیے بھی فائدہ مند ہے۔ کیوں کہ عام طور پر طلبہ مسائل سے دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ مگر ان کی تشخیص اور حل سے ناواقف ہی رہتے ہیں۔ ایسے طلبہ اس کتاب سے استفادہ کر کے اپنے تحصیلی مسائل بھی حل کر سکتے ہیں۔

4.1.14۔حضرت مخدوم علی مہائمی (تین تحقیقی مقالات):

عبدالستار دلوی جب 2006ء میں حضرت مخدوم علی مہائمی میموریل اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اینڈ لائبریری کے ڈائرکٹر کے منصب پر فائز ہوئے تو انہوں نے حضرت مخدوم علی مہائمی پر لکھے جا چکے تین مختلف مقالات کو حاصل کر کے اپنے پر مغز و معلوماتی مقدمے کے ساتھ کتابی صورت میں حضرت مخدوم علی مہائمی میموریل اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اینڈ لائبریری سے 2007ء میں شائع کیا ہے۔جس کی ضخامت 95 صفحات اور قیمت 50 روپے ہے۔

پیش نظر کتاب حضرت مخدوم علی مہائمی (تین تحقیقی مقالات) میں سب سے پہلے پیر مخدوم علی مہائمی چیریٹیبل ٹرسٹ کے چیرمین ایڈوکیٹ عبدالصمد خطیب کا لکھا ہوا ''اپنی بات'' ہے۔جس میں انہوں نے افسوس ظاہر کیا ہے کہ حضرت مخدوم علی مہائمی چودھویں صدی کے بزرگ ہیں۔لیکن ان کی حیات اور کارناموں پر اب تک کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا سوائے اس کے کہ عبدالستار دلوی کی تحریک پر مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی نے ''مخدوم علی مہائمی احوال و آثار'' کے عنوان سے تحقیقی کام کر کے 1976ء میں کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے۔

ایڈوکیٹ عبدالصمد خطیب ''اپنی بات'' میں یہ بھی بتاتے ہیں کہ عبدالستار دلوی پچھلے ایک سال سے (2006 سے 2007) انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ہیں اور اس ایک سال میں علم دوست حضرات نے مختلف موضوعات پر مشتمل تقریباً چھ ہزار (6000) کتابیں آپ کی وساطت سے لائبریری کو عطیہ دیں ہیں۔انہوں نے آگے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے آئندہ تحقیقی مقاصد سے متعلق یوں لکھا ہے:

> ''حضرت کی کتابوں کی تحقیق و تلاش کا کام جاری ہے۔تفسیر رحمانی کے زیروکس ہم نے حاصل کیے ہیں۔ان کی مشہور کتاب ''اجلۃ التائید فی شرح ادلۃ التوحید'' جس کا نسخہ خود پروفیسر دلوی کی ملک ہے۔ادارے کی طرف سے مرتب ہو رہی ہے۔اسی طرح مخدوم صاحب کے بنیادی ماٰخذ کی تلاش بھی جاری ہے۔ہمیں

امید ہے کہ دو سال میں ہم یہ سب بنیادی آخذات حاصل کر کے ایک بہت بڑی
علمی کمی کو پورا کر سکیں گے۔ تحقیق ایک صبر آزما اور مشکل کام ہے۔ لیکن پروفیسر
دلوی کی علمی اور رہنمایانہ شخصیت کی مدد سے ہمیں امید ہے کہ یہ مراحل آسان
ہو جائیں گے۔'' (''حضرت مخدوم علی مہائمی'' (تین مقالات)، ص:10)

ایڈوکیٹ عبدالصمد خطیب کے بیان کردہ مقاصد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں حقیقت نہ بن سکے کیوں کہ عبدالستار دلوی کی ملکیت میں موجود حضرت کی کتاب ''اجلۃ التائید فی شرح ادلۃ التوحید'' کا نسخہ جو انہوں نے مرتب کر کے شائع کرنے کے لیے دیا تھا وہ کھو گیا۔ اور ایڈوکیٹ عبدالصمد خطیب کے اچانک انتقال کے بعد ذمہ دارانہ نے کہہ دیا کہ انہیں ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور لائبریری نہیں چلانی ہے تو آپ نے بھی ڈائرکٹر کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد انسٹی ٹیوٹ میں نہ کسی مقصد کی تکمیل ہوئی اور نہ لائبریری کی کتابوں میں کوئی اضافہ ہوا لیکن ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور لائبریری کا پروپگنڈہ ابھی بھی جاری ہے۔

عبدالستار دلوی نے بہ حیثیت مرتب اس کتاب میں ایک معلوماتی و مدلل مقدمہ قلم بند کیا ہے۔ جس کی تمہید میں وہ بیان کرتے ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ سیاسی نوعیت کا تھا۔ مگر یہ ملک سنتوں کے ساتھ ساتھ صوفیوں کا بھی مسکن رہا ہے۔ یہاں جہاں سنتوں نے بھکتی مارگ اور ویدوں کے ذریعے روحانیت کی تعلیم دی وہیں صوفیوں نے اپنی تبلیغ سے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کو بھی متاثر کیا جس کی وجہ سے قومی یکجہتی بھائی چارے کا پیغام عام ہوا۔ چوں کہ بھکتی مارگ کا راستہ یہی تھا۔ اسی لیے ہندوؤں اور مسلمانوں میں آپسی بھائی چارہ اور محبت پیدا ہوگئی جس کے نتیجے میں سب کی زندگیوں سے ''میں'' اور ''تم'' کا فرق مٹ گیا اور صوفیوں کے آستانوں پر بلاتفریق ہر مذہب کے افراد اپنا سر جھکاتے رہے ہیں۔

عبدالستار دلوی مقدمے میں شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک کے صوفیوں کا ذکر کرتے کرتے نواح بمبئی کے علاقے ''ماہم'' میں تصوف کا رخ کرتے ہیں۔ ''ماہم'' ہندوستان کے مغربی کنارے پر واقع

ہے جو کبھی سلاطین گجرات اور کبھی جنوبی ہند کے راجاؤں کے زیر اقتدار رہا کرتا تھا۔مگر سلاطین کے دور میں اسے پہلے ماہم اور بعد میں مہائم کا نام دیا گیا۔لیکن تاریخ میں مہائم کے علاقے کو اہمیت اس کے راجاؤ وسلاطین کی وجہ سے کبھی نہیں ملی۔ بلکہ تاریخ میں علاقہ مہائم کی اہمیت حضرت مخدوم علی مہائمؒ کی وجہ سے ہے۔ جو اپنے وقت کے جید عالم،صوفی، فلسفی اور فقیہ بزرگ گزرے ہیں۔اس دور میں دلی پر سلطان فیروز کی حکومت تھی وہ اس کے بعد حضرت کا تعارف اس طرح کرواتے ہیں:

''حضرت مخدوم علی مہائمیؒ اسی مہائم میں دسویں محرم 776ھ مطابق 1372ء کو خاندان نوایت میں پیدا ہوئے۔ان کا اصلی نام علاؤالدین اور علی دونوں ہیں۔ انہیں ابوالحسن کے نام سے بھی یاد کیا جاتا تھا اور لقب زین الدین تھا۔ ماہم کا علاقہ، علاقہ کوکن کا حصہ ہونے کی وجہ سے حضرت مخدوم علی مہائمی کو''قطب کوکن'' کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔اہل نوائط میں ایک خاندان پرو تھا،اسی مناسبت سے ان کے نام کے آگے پرو بھی لگایا جاتا ہے۔علم فقہ میں ان کی مہارت کی وجہ سے انہیں فقیہ بھی کہا جاتا ہے۔''

(''حضرت مخدوم علی مہائمی''(تین مقالات)،ص:10)

حضرت مخدوم علی مہائمی کے والد بزرگوار کا نام مولانا شیخ احمد ہے اور وہ اپنے دور کے بہت بڑے تاجر عالم اور صوفی گزرے ہیں۔وہیں آپ کی والدہ ماجدہ کا نام حضرت فاطمہ بنت ناخدا انکولیا ایک متقی پرہیزگار خاتون تھیں۔حضرت کے والد نے آپ کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ فرمائی۔ چوں کہ آپ کے والد خود بھی عالم تھے اسی لیے ان کی تربیت نے آپ کو بھی عربی، فقہ، منطق، فلسفہ اور حدیث وغیرہ علوم کا عالم بنادیا۔اس موقع پر انہوں نے مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی کے حوالے سے لکھا ہے کہ آپ کی تربیت میں حضرت خضر علیہ السلام کا بھی حصہ ہے۔ انہوں نے مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی کے حوالے سے ایک اور بات یہ بھی لکھی ہے کہ حضرت مخدوم علی مہائمی

مجرد نہ تھے۔ بلکہ بادشاہ وقت سلطان احمد شاہ کی بہن آپ کے نکاح میں تھیں۔

عبدالستار دلوی کے مطابق حضرت مخدوم علی مہائمی ایک عالم، فقیہ اور صوفی بزرگ تھے اور اپنی ریاضت وعبادت سے انہوں نے اللہ عز وجل سے قربت حاصل کر لی تھی وہ حضرت محی الدین اکبر کے ارادت مندوں میں سے تھے جو اپنے فلسفہ وجودیت کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ حضرت محی الدین ابن عربی کے پیرو تھے۔ جن کا تعلق اسپین سے ہے۔ اور ان کے فلسفیانہ افکار اور صوفیانہ خیالات سے صوفی اور فلسفی سبھی متاثر ہیں۔

عبدالستار دلوی مقدمے میں آگے لکھتے ہیں کہ حضرت صوفیانہ اعلیٰ مراتب کے ساتھ ساتھ ماہم کے مسلمانوں کے قاضی مقرر تھے۔ ایک مدرسے میں درس وتدریس بھی دیا کرتے تھے اور اس کے علاوہ تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ان کے شاگردوں سے متعلق معلومات دستیاب نہ ہوسکیں۔ مگر مولوی سید امام الدین گلشن آبادی نے اپنی تصنیف ''تاریخ الاولیاء'' میں آپ کو اور آپ کے ایک شاگرد شیخ محمد سعید کوکنی کو ضلع کوکن کے ''آفتاب ومہتاب'' لکھا ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ شیخ محمد سعید کوکنی رتنا گری میں مدفون ہیں۔

صوفیوں کا بنیاد پیغام اخوت، بھائی چارہ ہوتا ہے لیکن ان میں بھی مختلف سلسلے ہوتے ہیں جیسے قادریہ، سہروردیہ، نقشبندیہ، رفاعیہ، شطاریہ اور چشتیہ وغیرہ وغیرہ لیکن حضرت کا شمار کسی بھی سلسلے میں نہیں ہوتا۔ حضرت کے سلسلے سے متعلق عبدالستار دلوی لکھتے ہیں:

> ''اگر چہ وہ صوفی تھے کسی سلسلے یا مسلک سے تعلق نہ ہونے کی وجہ سے بقول مولانا پرواز اصلاحی ''تذکرہ نگاروں نے نہیں ''اویسی'' لکھا ہے۔ صوفیوں کی اصطلاح میں اویسی اس شخص کو کہتے ہیں جسے بغیر کسی پیر ومرشد کے مبدأ الٰہیہ سے فیضِ ولایت پہنچے۔ اس سلسلے میں بعض کی رائے یہ ہے کہ جو شخص قول اور فعل میں سنت رسول کی اتباع کرے وہ اویسی ہوتا ہے۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ حضرت خضر علیہ

السلام سے جس کو فیض پہنچے وہ ''اویسی'' ہے۔ لیکن بعض کا خیال یہ ہے کہ جس شخص کو اولیاء امت میں سے کسی کے بھی باطن سے بدونِ توسط رسمی بیعت کے فروغ وہدایت حاصل ہوا ''اویسی کہا جائے گا''۔

(''حضرت مخدوم علی مہائمی'' (تین مقالات)، ص:16)

پیش نظر اقتباس میں ''اویسی'' سلسلے سے حضرت کے تعلق کی بات یقینی ہے پھر چاہے اس کی وجہ جو بھی ہو۔ عبدالستار دلوی نے اپنے مقدمے میں آگے مولوی محمد یوسف کھٹکھٹے کی کتاب ''کشف المکتوم'' اور بمبئی کے قدیم مورخ ایڈورڈز (Edwords) کی مشہور کتاب ''Rise of Bombay'' ''رائز آف بامبے'' سے ماخوذ ایک طویل اقتباس دیا ہے جس کو ممبئی گزیٹر نے شائع کیا تھا۔ اس کو یہاں قارئین کی دلچسپی کی خاطر نقل کیا گیا ہے۔

عبدالستار دلوی مقدمے کی اگلی منزل میں حضرت مخدوم علی مہائمیؒ کے مزار کو صدیوں سے مرجع خلائق بتاتے ہوئے اور یہ بھی وضاحت کرتے ہیں کہ 1863ء سے پہلے درگاہ کے معاملات نورنگے خاندان کے زیر اثر تھے۔ لیکن جب نورنگے خاندان میں اختلافات پیدا ہوگئے تو ان اختلافات کے تصفیے کے طور پر 10/ جولائی 1890ء کو ''پیر مخدوم صاحب چیرٹیبل ٹرسٹ'' کا قیام عمل میں لایا گیا تو اس ٹرسٹ کے اولین تین ٹرسٹی اس طرح تھے:

1۔ نواب زدہ نصراللہ خان

2۔ سردار سید علی خان

3۔ محمد حسین مقبہ

ان اولین تین ٹرسٹیوں میں سے نواب زدہ نصراللہ خان اور سردار سید علی خان کے تفصیلی حالات دستیاب نہیں ہوئے ہیں۔ لیکن محمد حسین مقبہ اردو کے باکمال شاعر گزرے ہیں۔ انہیں حکومت بمبئی نے جسٹس آف دی پیس مقرر کیا تھا۔ اور یہ انجمن اسلام کے تعلیمی امور سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ جس کی وجہ سے انجمن اسلام نے محمد

حسین مقبہ لائبریری اور مقبہ جمنا شیم کو انہی کے نام سے موسوم کیا ہے۔

عبدالستار دلوی اپنے مقدمے کے اگلے حصے میں کہتے ہیں کہ آزادی کے بعد ''پیر مخدوم صاحب چیریٹیبل ٹرسٹ'' 17 / اپریل 1952ء کو چیریٹی کمشنر بمبئی کے یہاں رجسٹرڈ ہوا تو دوبارہ ٹرسٹ کے تین ٹرسٹیاں منتخب ہوئے جن کے نام مولوی محمد یونس ہینداد ے، مولوی سید عبدالقادر چور گھے اور حاجی محمود باولا ہیں۔ ان میں سے مولوی محمد یونس ہینداد ے کا شمار بمبئی کی ممتاز ہستیوں میں ہوتا ہے وہ پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے انہوں نے الفسٹن کالج سے بی اے کامیاب کیا تھا اور وہ ممتاز عالم و پروفیسر کان بہادر شیخ عبدالقادر سرفرازؔ کے خاص شاگردوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان سب کے علاوہ وہ ایک کلاسیکی شاعر بھی تھے۔ ان کا کلام ''خم خانہ ازل'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اسی طرح ٹرسٹ کے دوسرے ٹرسٹی مولوی عبدالقادر چو گھے بھی شاعر تھے لطفؔ تخلص کرتے تھے اور شاعری میں وہ محمد یونس ہینداد ے کے ہی شاگرد تھے مگر احمد سیلر ہائی اسکول میں اردو، دینیات اور گجراتی پڑھاتے تھے۔ واضح رہے کہ پروفیسر عبدالستار دلوی کو ان کا شاگرد خاص ہونے کا شرف حاصل ہے۔ آپ کی ٹرسٹی شپ کے دوران 1953ء میں درگاہ کا خوب صورت صدر دروازہ تعمیر ہوا تو انہوں نے اس پر یہ منظوم قطعہ تحریر کیا تھا:

تعالی اللہ باب جنت است ایں
چہ اعلیٰ بارگاہ عظمت است ایں
بگوا ے لطفؔ سالِ بابِ جنت
تجلی گاہِ نورِ رحمت است ایں

عبدالستار دلوی کے مطابق (15 / فروری 2007) میں پیر مخدوم صاحب چیریٹیبل ٹرسٹ کے دو ٹرسٹ ہیں۔ جن میں سے ایک ایڈوکیٹ عبدالصمد خطیب (چیرمین) کا تعلق رتنا گیری ضلع کے کردہ گاؤں سے ہے اور وہ بمبئی میں گورنمنٹ پلیڈر ہیں۔ وہیں دوسرے ٹرسٹی سہیل کھنڈوانی اور جناب غلام علی نائک ٹرسٹ کے ناظر تھے۔ آگے آپ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ''حضرت مخدوم علی مہائمی میموریل اور ینٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور لائبریری کے

قیام میں بھی ان ہی دوٹرسٹیوں کا دخل رہا ہے۔ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور لائبریری کا قیام ایک دیرینہ خواب کی تعبیر ہے۔ اوراس کے مقاصد میں حضرت پر تحقیقی کام، حضرت کی کتابوں کی تلاش، ان کے اردو تراجم اور حضرت کے گجرات ودکن کے معاصر صوفیا پر تحقیق شامل ہے۔

کتاب ہذا میں ایڈوکیٹ عبدالصمد خطیب کے ''اپنی بات'' اور عبدالستار دلوی کے مقدمے کے بعد حضرت پر تین مقالات شامل ہیں۔ جن میں سب سے پہلا تحقیقی (مضمون) مقالہ سید سعداللہ قادری بعنوان ''العالم الربانی العارف الرحمانی المخدوم الفقیہ علاؤالدین ابوالحسن علی بن احمد المہائمی'' ہے مقدمہ نگار سید سعداللہ قادری کا تعارف کرواتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سید سعداللہ قادری، حکیم شمس اللہ قادری (اردو کے حیدرآبادی عالم ومحقق) کے بیٹے ہیں جو 15/اکتوبر 1916ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے اور بہ حیثیت صحافی (23) سال روزنامچہ سلطنت کے مدیر رہے۔ آپ کو مذہب اور تصوف سے گہری دلچسپی رہی ہے۔ جس کے چلتے آپ نے حیدرآباد میں ایک بے مثال عاشورخانہ بھی تعمیر کروایا ہے۔ اسی طرح حضرت پر آپ کا مقالہ آپ کی عمدہ تحقیق کا نمونہ ہے۔ اس نایاب مقالے کو حاصل کرنے میں عبدالستار دلوی کی علمی اعانت کرنے والی شخصیت ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب اور بانی اردو ریسرچ سنٹر عبدالصمد ہیں۔

کتاب ہذا کا دوسرا مقالہ ''تفسیر رحمانی: ایک مطالعہ ہے'' ہے۔ جس کے مقالہ نگار ڈاکٹر محمد عارف عمری ہیں۔ بقول عبدالستار دلوی تفسیر رحمانی ہندوستان کے مفسرین قرآن کی لکھی ہوئی غالباً پہلی تفسیر ہے۔ اوراس کا تعارف ومطالعہ بھی کتاب ہذا میں پیش کیا جارہا ہے۔ یہاں یہ بھی وضاحت ضروری ہے کہ مولانا پرواز اصلاحی کی کتاب ''حضرت مخدوم علی مہائمی احوال وآثار'' مطبوعہ 1976ء میں تفسیر مہائمی کا مطالعہ شامل نہ ہوسکا تھا لیکن جب ان کا تقرر دارالمصنفین میں ہوا تو وہ ''ہندوستان کے مفسرین قرآن'' کے موضوع پر تحقیقی کام میں مصروف تھے۔ اسی دوران ان کی علالت اور پھر انتقال کی وجہ سے یہ تحقیقی کام نامکمل ہی رہ گیا۔ لیکن مولانا پرواز اصلاحی کے کاغذات میں یہ محفوظ تھا جس کو ان کے جانشین مولانا ڈاکٹر محمد عارف عمری نے اپنی کتاب ''مفسرین ہند'' میں شامل

کیا ہے۔حضرت کی جملہ تصانیف میں تفسیر مہائمی کو عالمی شہرت حاصل ہوئی ہے۔یہ تفسیر عاشقانِ مہائمی کے لیے اس کتاب میں شامل کی گئی ہے۔

کتاب ہذا میں شامل تیسرا تحقیقی مقالہ بعنوان ''حضرت مخدوم علی مہائمیؒ'' ڈاکٹر جمیلہ شوکت کا ہے جو شعبہ اسلامیات، پنجاب یونی ورسٹی کی استاد ہیں۔یہ مقالہ ''مجلّہ تحقیق'' لاہور میں شائع ہوا تھا۔اور اس مجلّہ تحقیق کو مشہور محقق و عالم ڈاکٹر تنویر احمد علوی (سابق استاد شعبہ اردو، دلّی یونی ورسٹی) نے فراہم کیا ہے۔

عبدالستار دلوی مقدمے کے آواخر میں کہتے ہیں کہ مولانا پرواز اصلاحی کی مطبوعہ کتاب کے علاوہ یہی تین مذکورہ مقالات حضرت مخدوم علی مہائمیؒ پر ان کی نظر سے گزریں ہیں جنھیں وہ قارئین کے لیے کتابی شکل دے رہے ہیں۔یہ کتاب شائع ہوئی تو مذہب اور تصوف کے دلدادہ حضرت نے اسے خوب پسند کیا اس کتاب کی اہمیت مشہور نقاد شمس الرحمٰن فاروقی کے ان الفاظ سے ظاہر ہوتی ہے جو انہوں نے مورخہ 15 / مارچ 2009ء کے ایک خط میں عبدالستار دلوی کو لکھے ہیں:

> ''حضرت مخدوم علی مہائمی کے بارے میں آپ کا رسالہ میرے لیے بہت معلومات افزاٗ ثابت ہوا۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے حضرت کے بارے میں کچھ سرسری باتیں ہی معلوم تھیں اور میں ان کے روحانی اور علمی مرتبے سے بالکل ناواقف تھا۔''

دراصل ٹرسٹ کے چیرمین عبدالصمد خطیب کے اظہار افسوس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت مخدوم علی مہائمی پر پچھلے چھ سو سال میں کوئی باقاعدہ تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔لیکن مولانا پرواز اصلاحی کی کتاب ''حضرت مخدوم علی مہائمیؒ احوال و آثار'' مطبوعہ 1976ء جو حضرت پر پہلا تحقیقی کام ہے۔اس کا محرک عبدالستار دلوی ہیں۔اور دوسری طرف ان تین مختلف، نایاب و کمیاب مقالات کا علم رکھنا، اپنے کرم فرما و دوست احباب کے وسیلے سے انھیں حاصل کرنا، ان مقالات اور حضرت کے حسیات و کارناموں پر محیط ایک مدلل و پر مغز مقدمہ لکھنا ایک غیر معمولی بات ہے۔

لیکن عبدالستار دلوی کی محنت، ثابت قدمی، مشکل پسندی اور محققانہ شخصیت نے اس کام کو یقینی بنا کر ادب میں ظاہر ہے اضافہ ہی کیا ہے۔ یہ کتاب حضرت کے قارئین کے لیے کسی تحفے سے کم نہیں۔ اور وہیں حضرت کو موضوعِ تحقیق بنانے والے محققین کے لیے مشعل راہ بھی ثابت ہوگی۔

4.1.15۔مقالات پروفیسر نجیب اشرف ندوی:

عبدالستار دلوی نے ''مقالات پروفیسر نجیب اشرف ندوی'' کو مرتب کر کے مارچ 2013ء میں انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے شائع کیا ہے۔ درحقیقت پروفیسر نجیب اشرف ندوی، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے بانی ڈائرکٹر رہے ہیں۔ علاوہ بریں وہ عبدالستار دلوی (مرتب) کے استاد محترم بھی ہیں۔ اسی لیے یہ کتاب ایک طرح سے استاد کو اپنے شاگرد اور اپنے ادارے کی طرف سے خراج عقیدت ہے۔ اور عبدالستار دلوی نے کتاب ہذا کا انتساب پروفیسر نجیب اشرف ندوی کے معاصرین اور احباب جیسے ڈاکٹر محمد بذل الرحمٰن، پروفیسر داؤد پوتا، پروفیسر محمد ابراہیم ڈار، پروفیسر شیخ عبدالقادر سرفراز، پروفیسر سراج الحسن نقوی اور پروفیسر اے۔اے۔اے فیضی کے نام معنون کیا ہے۔

''مقالات پروفیسر نجیب اشرف ندوی'' میں سب سے پہلے صدر انجمن اسلام ڈاکٹر ظہیر قاضی کا لکھا ہوا ''ابتدائیہ'' ہے جس میں انہوں نے ادارے انجمن اسلام کی مختصر تاریخ مع اہم شخصیات کے بیان کی ہیں۔

عبدالستار دلوی نے اپنے مقدمے کے آغاز میں اسماعیل یوسف کالج کی مختصر تاریخ بیان کی ہے۔ جس میں انہوں نے کالج کے اساتذہ کے ماضی، حال اور مستقبل میں فائز عہدوں کا تفصیلی طور پر احاطہ کیا ہے جو اس مقدمے کا پس منظر کہا جا سکتا ہے۔ جس کے بغیر پروفیسر نجیب اشرف ندوی تک پہنچنا اور ان کو سمجھنا ذرا مشکل کام ہے۔

بقول عبدالستار دلوی پروفیسر نجیب اشرف ندوی کا تعلق علامہ سید سلیمان ندوی سے ہے۔ دراصل پروفیسر ندوی عالم صفت شخصیت سید مبین الدین کے گھر یکم نومبر 1900ء کو ریاست مہاراشٹر کے چاندہ علاقے میں پیدا ہوئے۔ اسی لیے ان کی ابتدائی تعلیم بھی مراٹھی میڈیم سے ہوئی۔ جس پر وہ ہمیشہ ناز کیا کرتے تھے۔ یہاں

خاص بات یہ ہے کہ شبلی کی بلاواسطہ شاگردی کا سلسلہ ان پر ختم ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ شبلی کے زندہ شاگردون میں آخری شخص تھے۔

عبدالستار دلوی جب 1954ء میں دسویں جماعت میں زیر تعلیم تھے تب ہی سے انہوں نے اپنے پرنسپل وشفیق استاد محترم انصار علی مرحوم کی زبانی پروفیسر محمد ابراہیم ڈار کی عربی دانی کا چرچا سن رکھا تھا۔ جس کے چلتے انہوں نے اپنی اعلیٰ تعلیم کے لیے اسماعیل یوسف کالج کو منتخب کیا۔ لیکن آپ کے داخلے سے پہلے پروفیسر محمد ابراہیم ڈار کا انتقال ہو چکا تھا۔ اسی لیے آپ کی نظریں صرف اور صرف پروفیسر نجیب اشرف ندوی پر ٹک گئیں۔

عبدالستار دلوی کے مطابق پروفیسر ندوی کی شخصیت میں بلا کا جادو تھا۔ علم کا دفینہ تھے اور اس پر یہ کہ سفید اور نرم ملائم بالوں والی شخصیت کے مالک تھے۔ اسی لیے عبدالستار دلوی کو بھی اکثر ایسی شخصیت کی خواہش ہوتی۔ دراصل پروفیسر ندوی کی شخصیت میں ملنساری کی صفت ہی تھی جو ان کو ہر دل عزیز بناتی تھی وہ کالج کے وائس چانسلر سے لے کر چپراسی تک سب سے سلام وکلام کرتے کسی کو اپنے سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ وہ مختلف زبانیں جانتے تھے اور اپنے ملنے والوں میں جس کو جو زبان آتی اس سے اسی زبان میں ہم کلام ہوتے۔ پھر چاہے اس مخصوص زبان پر انہیں عبور حاصل ہو کے نہ ہو۔

مقدمہ نگار عبدالستار دلوی، پروفیسر نجیب اشرف ندوی ہی کے انداز گفتگو کے مختلف پہلوؤں جیسے حاضر جوابی، بذلہ سنجی، طنز اور ''PUN'' یعنی ذو معنی الفاظ کے استعمال سے مزاح پیدا کرنا وغیرہ وغیرہ سے متعلق اپنی یاداشت سے واقعات قلم بند کیے ہیں۔ جس میں ذو معنی الفاظ کے استعمال سے مزاح پیدا کرنے والا واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ پروفیسر ندوی نے عید کے موقع پر تمام طلبہ کو اپنے گھر واقع ''اندھیری'' پر مدعو کیا تھا۔ جب آپ کے شاگردِ خاص عبدالستار دلوی نے آپ سے آپ کے گھر آنے سے متعلق معلومات جیسے بس اسٹاپ، بس کا نمبر وغیرہ دریافت کیا تو پروفیسر ندوی نے جواب دیا کہ آپ اندھیری کی بس میں بیٹھ کر کنڈیکٹر سے پوچھ لیجیے۔ یہ جواب آپ کو مذاقیہ لگا مگر جب یہ مذاق صحیح ثابت ہوا۔ یعنی انہوں نے اندھیری کی بس چڑھ کر پروفیسر ندوی کے گھر جانے

کا ارادہ ظاہر کیا تو کنڈ یکٹر نے انہیں ''ندوی اسٹاپ پر اتار دیا۔ دراصل پروفیسر ندوی اپنی خوش اسلوبی اور ملنسار صفات کی وجہ سے بس کنڈکٹروں میں بھی مشہور تھے جس بنا پر آپ کو بس میں جلدی جگہ مل جاتی۔ اور آپ کے گھر کا بس اسٹاپ ''ندوی اسٹاپ'' کہلاتا تھا۔ اسی لیے جب آپ کو کسی کو اپنے گھر مدعو کرنا ہوتا تو کہتے'' آپ ہماری اندھیری میں آیئے تاکہ وہاں اجالا ہو۔'' اس پورے واقعے سے پروفیسر ندوی کے مزاحیہ انداز گفتگو کا پتہ چلتا ہے۔

بقول عبدالستار دلوی، پروفیسر ندوی کی طنزیہ گفتگو میں بھی بلا کی تیزی ہوتی۔ جس سے متعلق وہ اپنی انٹرمیڈیٹ فرسٹ ایئر کے حصہ نثر کی کلاس میں پیش آئے ایک واقعے کا یوں ذکر کرتے ہیں کہ پروفیسر ندوی شؔرر کا مضمون ''لکھنؤ کے رکاب دار'' پڑھا رہے تھے جس میں لکھنؤ کے مختلف النوع اقسام کے کھانوں کا ذکر آیا تو انہوں نے کلاس میں موجود لڑکیوں سے سوال کیا ''نرگسی کباب'' کسے کہتے ہیں؟ اور تمام لڑکوں کو جواب نہ دینے کی تاکید کر دی اور جب لڑکیوں میں سے کسی نے اس سوال کا جواب نہیں دیا تو انہوں نے لڑکوں کی جانب متوجہ ہو کر ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا'' آپ سب کا مستقبل بہت تاریک دکھائی دے رہا ہے اگر ایسی بیویاں ملیں تو کیا کرو گے۔ کھانے کی ساری لذتوں سے محروم رہ جاؤ گے۔''

عبدالستار دلوی کو پروفیسر ندوی کی حاضر جوابی کا ایک واقعہ آج بھی یاد آتا رہتا ہے جو اس طرح ہے کہ پروفیسر ندوی دھوپ سے بچنے کے لیے ہیٹ پہنتے تھے اور ہم چھوٹے بڑے کو سلام کرنے میں پہل کرنا ان کی ایک مخصوص عادت تھی۔ عبدالستار دلوی اور ان کے ساتھیوں کا ایک گروپ Corridor سے گزر رہا تھا اور جب پروفیسر ندوی نے اس گروپ کو دیکھا تو اپنی مخصوص عادت کے مطابق بلا تامل ہیٹ کو اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑ کر مخصوص انداز میں سلام کیا۔ مگر چوں کہ آپ کے دائیں ہاتھ میں ہیٹ تھی اسی لیے سلام کے لیے اٹھایا گیا ہاتھ بایاں تھا تو طالب علموں کے گروپ میں سے ایک طالب علم نے کہا کہ ہمیں آپ کا سلام قبول نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ دائیں کے بجائے بائیں ہاتھ سے کیا گیا ہے۔ تب پروفیسر ندوی نے اس طالب علم سے مخاطب ہو کر کہا'' بیٹا دل کس طرح ہوتا ہے۔؟'' یہ سن کر وہ طالب علم لاجواب ہو گیا۔

یہاں عبدالستار دلوی نے پروفیسر ندوی کی بذلہ سنجی کو بتانے کے لیے ایک دلچسپ واقعہ یوں بیان کیا ہے کہ اسماعیل یوسف کالج کی ادبی مجلس ''مجمع الادب'' کے صدر پروفیسر ندوی ہی تھے۔ اور اس مجلس کے تحت ''اردو ڈراما'' کے عنوان سے مقابلہ ہونا تھا۔ جس کے لیے ایک جج فلم ڈائرکٹر وِلی آ چکے تھے مگر دوسرے جج نے عین وقت پر معذرت کرلی۔ اور اس لمحے فکریہ میں پروفیسر ندوی نے ڈائرکٹر وِلی کو جب یہ پوری بات بتائی تو انھوں نے دوسرے جج کے طور پر اپنی شریک حیات ممتاز شانتی کو بلالیا۔ مقابلہ ہو بھی گیا اور جب میزبان پروفیسر ندوی مہمانوں کے شکریے کے لیے کھڑے ہوئے انہوں نے یہ سارا واقعہ سب کو پرلطف انداز میں سنایا اور کہا:

> ''آج مقابلہ شروع ہونے سے قبل ہمیں سخت مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ ہمارے ایک جج کسی مجبوری سے تشریف نہ لا سکے۔ جس کی وجہ سے عین موقع پر ہم بہت پریشان تھے لیکن ہمارے درمیان وِلی تھے ہم نے اپنی مشکل آسان کرنے کے لیے ان سے گزارش کی تو انہوں نے شانتی کو بلایا اور وہ بھی کیسی ممتاز!''

(مقالات پروفیسر نجیب اشرف ندوی'' ص:18)

عبدالستار دلوی کے بیان کردہ واقعات سے پروفیسر ندوی کی شخصیت میں موجود بذلہ سنجی، طنز اور مزاح ساری خصوصیات ظاہر ہو رہی ہیں۔ فاضل مقدمہ نگار نے ایسے کئی اور بھی واقعات قلم بند کیے ہیں۔ لیکن یہاں صرف ایک ایک ہی واقعہ نموناً پیش کیا گیا ہے۔

عبدالستار دلوی نے اسکول میں مولانا انصار علی مرحول اور مولوی بشیر الدین جیسے اساتذہ سے اردو پڑھی تھی۔ مگر جب وہ اسماعیل یوسف کالج میں آئے تو پروفیسر ندوی سے اردو پڑھنی شروع کی تو وہ مشکل الفاظ کے معنی تو بتا دیتے مگر کسی جملے کی وضاحت نہیں کرتے تھے۔ اور اگر طلبہ وضاحت کی خواہش ظاہر کرتے کہتے کہ آپ کالج میں کس لیے آئے ہیں؟ آپ کو اتنا بھی نہیں معلوم'' دراصل پروفیسر ندوی کے اس اندازِ تدریس سے عبدالستار دلوی کو بھی کبھی کبھی مایوسی ہوتی تھی جس کا ذکر انہوں نے مقدمہ میں واضح طور پر کیا ہے۔ اور وہ مقدمہ کی اگلی سطروں میں

پروفیسر ندوی کے تدریسی عمل سے متعلق یوں اپنی رائے دیتے ہیں:

''سال میں دو تین لیکچر ہی ہوتے کہ طبیعت خوش ہو جاتی۔ طلبہ پر ندوی صاحب کی علمیت کی دھاک یہی دو تین لیکچر میں ہوتے۔''

(مقالات پروفیسر نجیب اشرف ندوی'' ص:16)

یہ تو ہوئی پرفیسر ندوی کے درس و تدریس کی بات۔ اب آیئے اپنے شاگرد خاص سے ان کی محبت اور شفقت کو ظاہر کرتے ہوئے دو مختصر واقعات پر بھی نظر ڈالی جائے۔

ایک دفعہ شاگرد خاص عبدالستار دلوی نے استاد محترم پروفیسر ندوی سے آٹو گراف کی گزارش کی تو استاد محترم نے آٹو گراف میں لکھا ''پڑھو اور پڑھو''۔ یہ آٹو گراف لے کر شاگرد خاص کو اطمینان نہ آیا۔ کیوں کہ وہ تو چاہتے تھے کہ استاد محترم کوئی رنگین عبارت لکھتے یا اقبالؔ کا کوئی شعر لکھتے۔ مگر آج عبدالستار دلوی کو یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کے استاد محترم نے کتنے امیدوں سے انھیں وہ آٹو گراف دیا ہوگا۔

ایک دفعہ پروفیسر ندوی اور عبدالستار دلوی، دونوں کو ساتھ میں ڈبل ڈیکرس میں سفر کرنے کا اتفاق ہوا تو انہوں نے استاد محترم کی عمر کا لحاظ کرتے ہوئے نیچے ہی بیٹھنا چاہا مگر استاد محترم نے فوراً نصیحت کی کہ ''بیٹا ہمیشہ اوپر رہنا۔''

مذکورہ دونوں واقعات سے استاد محترم اور شاگرد خاص کے پر خلوص رشتے پر روشنی پڑتی ہے۔

عبدالستار دلوی کے مطابق پروفیسر ندوی نے تقریباً اڑسٹھ (68) سال کی عمر پائی جس میں سے چالیس سال انہوں نے علمی و ادبی خدمات انجام دی ہیں۔ جن میں مقدمہ رقعاتِ عالم گیر، لغات گجری اور چالیس مضامین و تبصرے شامل ہیں۔ مگر مقالات پروفیسر نجیب اشرف ندوی میں صرف انیس مضامین و مقالات ہی شامل ہیں جو اس طرح ہیں:

1۔ بمبئی میں اردو

2۔ اردو کے لغت

3۔ دیوان حافظ؟ اور سلاطین مغلیہ

4۔ ایک تاریخی غلطی کی اصلاح

5۔ کتب خانہ خدا بخش خان کی چند نادر کتابیں

6۔ ایک تاریخی معمہ شاہ جہاں نامۂ صادق (۱)

7۔ ایک تاریخی معمہ شاہ جہاں نامۂ صادق) (۲)

8۔ مشرقی کتب خانہ پٹنہ کی فارسی کتابوں کی فہرست

9۔ مے خانۂ عبدالنبی

10۔ حیات اقبال؟

11۔ میرؔ کی کہانی خود ان کی تصانیف کی زبانی

12۔ انڈیا آفس لائبریری کی فہرست مخطوطاتِ اردو

13۔ پنجاب میں اردو

14۔ بابَر یا بابُر

15۔ کوکن کے اربعہ عناصر

16۔ بمبئی سے متعلق دو قدیم مثنویاں

17۔ ایک کہانی چار شاعروں کی زبانی

18۔ ہندوستانی سلکشن

19۔ مراثی جواد

20۔ اردو افسانہ نگاری: ایک لیکچر

عبدالستار دلوی پروفیسر ندوی کے غیر دستیاب شدہ مضامین سے متعلق مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''یہ مضامین دو برسوں کی سخت محنت اور تلاش و جستجو کے بعد حاصل کیے گئے ہیں''الناظر میں مطبوعہ مقالہ''اردو کا سب سے بڑا انشا پرداز کون؟''اسی طرح ''شبلی اور بمبئی''،مطبعہ پامز (اسماعیل یوسف کالج کی میگزین) تلاش و بسیار کے باوجود دستیاب نہ ہوسکے۔'' (مقالات پروفیسر نجیب اشرف ندوی''ص:20)

خیر یہ سب تو ہوئیں ان کے مضامین سے متعلق باتیں۔اب آیئے تصانیف سے متعلق خود ان کے خیالات بھی دیکھتے چلیں:

''بڑی تعداد میں کیڑے مکوڑوں کو جنم دینے کی بجائے ایک شیر کو جنم دینا زیادہ بہتر ہے۔'' (مقالات پروفیسر نجیب اشرف ندوی''ص:19)

اسی لیے عبدالستار دلوی کا خیال ہے کہ''رقعات عالم گیری'' کی ادبی و علمی حیثیت وہی ہے جو ایک شیر کے بچے کی ہوتی ہے۔اور رقعات عالم گیری کے بعد ان کا سب سے بڑا یا وقیع کارنامہ لغات گجری کے تدوین ہے جس کی وجہ سے ان کا نام ہمیشہ ادب میں زندہ رہے گا۔

پروفیسر نجیب اشرف ندوی نے اپنی زندگی میں جن اصولوں کو طرز جان بنا رکھا تھا ان پر وہ عملی طور پر بھی عمل پیرا رہے جس کی ایک مثال تصانیف سے متعلق ان کے خیالات اور ان کی تصانیف سے دی جاسکتی ہے۔

مختصراً کہا جائے تو عبدالستار دلوی نے پروفیسر نجیب اشرف ندوی کے مقالات کو ان ہی کے شاگردوں کی مدد سے تلاش کر کے ترتیب دے کر اپنے شاگرد خاص ہونے کا فرض ادا کر دیا ہے۔

4.1.16۔مقالات پروفیسر محمد ابراہیم ڈار:

عبدالستار دلوی نے''مضامین ڈار'' مرتبہ ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی کو اضافے کے ساتھ''مقالاتِ پروفیسر محمد ابراہیم ڈار'' کے عنوان سے ترتیب دے کر اپریل 2014ء میں انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ،

ممبئی سے شائع کیا ہے۔ جس کی ضخامت (400) چار سو صفحات اور قیمت بھی 400 روپے ہے۔

''مقالات پروفیسر محمد ابراہیم ڈار'' میں سب سے پہلے صدر انجمن اسلام، ڈاکٹر ظہیر قاضی کا ''اپنی بات'' ہے۔ جو انجمن سے شائع ہونے والی ہر کتاب میں شامل ہوتا ہے۔ اس کے بعد پروفیسر سید عبداللہ کا پیش لفظ موجود ہے جس میں انہوں نے پروفیسر محمد ابراہیم ڈار سے ان کے تعلقات، پروفیسر محمود شیرانی سے پروفیسر ڈار کے تعلقات، پروفیسر ڈار کی تاریخ دانی اور تاریخ نگاری اور مضامین ڈار میں شامل مضامین پر مختصر مگر جامع اظہار خیال کیا ہے۔ کتاب ہذا میں بعد ازاں ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی کا لکھا ہوا مضمون ''مرحوم ڈار'' ملتا ہے۔ جس میں انہوں نے پرفیسر ڈار کے اہل خانہ، تعلیم، استاد، ملازمت تبادلے، تبادلوں کے دوران احوال، دوست احباب، کثرت مطالعہ، بہ حیثیت استاد، علالت اور انتقال سے متعلق تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ جس سے پروفیسر ڈار کو مختلف حیثیتوں سے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان سب کے بعد پروفیسر ڈار کے ایک قریبی دوست مہر محمد خان شہاب مالیر کوٹلوی کا تقریباً 30 صفحے کا مضمون درج ہے۔ جس میں انہوں نے پروفیسر ڈار کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی اور مہر محمد خان شہاب مالیر کوٹلوی کے مضامین، اشاعت اول مرتبہ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی میں بھی شامل تھے۔ انھیں ان کی اہمیت کے پیش نظر مضامین اشاعت ثانی مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی میں بھی جوں کا توں رکھے گئے ہیں۔

''مقالات پروفیسر محمد ابراہیم ڈار'' میں مذکورہ مضامین کے بعد پروفیسر عبدالستار دلوی کا ابتدائیہ ہے۔ جس کی ابتداً انہوں نے اسماعیل یوسف کالج کی تاسیس سے کی ہے۔ اور آگے کالج کے پرنسپل ڈاکٹر محمد بذل الرحمٰن، پروفیسر داؤد دیوتا، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، پروفیسر محمد ابراہیم ڈار، پروفیسر عبدالصمد مولوی، پروفیسر حسین ہمدانی اور ڈاکٹر باقر علی ترمذی کو کالج کے روشن ستارے کہہ کر یاد کرتے ہیں۔

عبدالستار دلوی نے اپنے ابتدائیہ میں پروفیسر ڈار کو بہ حیثیت استاد پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ فارسی کے طلبہ کے علاوہ اردو کے طلبہ میں بھی مقبول تھے۔ اتنا ہی نہیں وہ صرف اسماعیل یوسف کالج کے شاگردوں میں ہی

نہیں بمبئی شہر کے دوسرے کالجوں کے طلبہ میں بھی مقبول عام کا درجہ رکھتے تھے۔ وہیں طلبہ کالج کے علاوہ ان کے گھر پر بھی ان کی عربی، فارسی اردو اور تاریک دانی سے مستفیض ہوتے تھے۔ اور طلبہ کے لیے ان کا دسترخوان بھی ہمیشہ کھلا رہتا۔ طلبہ تو طلبہ تمام شعبے جات کے اساتذہ بھی آپ کی عزت وتوقیر کرتے تھے۔ جیسے 17 / مئی 1953ء کو پروفیسر ڈار کا انتقال ہوا تو فلسفہ کے پروفیسر، پروفیسر سوامی داسن نے کالج کی میگزین ''پامز'' میں ایک طویل انگریزی مضمون لکھ کر شائع کیا تھا۔ جس کا کچھ حصہ ''ابتدائیہ'' میں جوں کا توں نقل کیا گیا ہے۔

فاضل مرتب عبدالستار دلوی نے اپنے ''ابتدائیہ'' میں پروفیسر ڈار سے متعلق ایک واقعہ یوں قلم بند کیا ہے کہ تقسیم ہند 1947ء کے بعد حکومت صوبہ بمبئی اخرجات کے بہانے اسماعیل یوسف کالج کو بند کرنے جا رہی تھی تو اس وقت کے پرنسپل جی۔ سی۔ بینرجی نے پروفیسر ڈار سے گزارش کی کہ اب صرف آپ ہی کالج کو بند ہونے سے بچا سکتے ہیں۔ تو پروفیسر ڈار دلی چلے گئے اور وہاں مولانا ابوالکلام آزاد (وزیر تعلیم سے ملاقات کر کے انھیں پورے معاملے سے واقف کرایا۔ جس کے بعد اسماعیل یوسف کالج بند ہونے سے بچ گیا۔ لیکن مولانا ابوالکلام آزاد، پروفیسر ڈار سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اسی لیے انہوں نے جب ساہتیہ اکادمی، للت کلا اکادمی اور یو۔جی سی وغیرہ کے لیے گیارہ اراکین کی ایک کونسل بنائی تو اس میں پروفیسر ڈار کو بھی شامل کیا گیا جو ان کا پروفیسر ڈار کی طرف ایک علمی اعتراف تھا۔

عبدالستار دلوی نے پروفیسر ڈار کے بے شمار شاگردوں کا ذکر اپنے ''ابتدائیہ'' کی ابتدائی سطروں ہی میں کیا تھا۔ لیکن اب اس مقام پر آ کر وہ پروفیسر ڈار کے چند مخصوص شاگردوں جیسے پروفیسر سید مقبول احمد، ڈاکٹر اکبر علی ترمذی، ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی، ڈاکٹر مومن محی الدین، ڈاکٹر عالی جعفر، ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی اور ڈاکٹر عصمت جاوید کے نام گنواتے ہوئے کچھ کا مختصر تعارف پیش کیا ہے۔

''مضامین ڈار'' مرتبہ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی کی پہلی اشاعت پروفیسر ڈار پبلی کیشن کمیٹی سے شائع ہوتی تھی۔ جس میں بقول پروفیسر سید عبداللہ ''جاحظ'' پر لکھے گئے مقالات مفقود ہیں۔ وہیں اس کتاب کی دوسری

اشاعت اردو اکادمی گجرات سے شائع ہوئی تھی جو بقول عبدالستار دلوی ناقص تھی۔ اسی لیے انھیں اس کتاب کی دوبارہ اشاعت کی ضرورت محسوس ہوئی تو انہوں نے اپنے ادبی دوست ڈاکٹر شہاب الدین ثاقت (استاد شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی) کی مدد سے تلاش کر کے اضافے کے ساتھ نہایت ہی خوب صورت اور مجلد انداز میں ترتیب دیا ہے۔اور اس اشاعت میں شامل مضامین اس طرح ہیں۔

1۔ جہاں آرا بیگم کی ایک غیر معروف تصنیف صاحبیہ

2۔ دیوان خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ

3۔ شیخ فریدالدین عطار کے حالات وتصانیف کے متعلق ہندوایران کے علماء کی تحقیقات

4۔ ہندوستان میں مغلوں سے قبل فارسی ادب شمس العلماء عبدالغنی کا تازہ علمی کارنامہ

5۔ اقبالؔ کی وطن پرستی

6۔ حیات شبلی پر ایک نظر

7۔ اقبال اور عربی شعراٗ

8۔ اسپین کی اسلامی تاریخ کا ایک ورق۔اشبیلہ کا نامور تاجدار

9۔ باقر علی ترمذی مرحوم

10۔ رقعات عالم گیر

11۔ گوجری اور اردو زبان کی نشو ونما میں اہل گجرات کا حصہ

12۔ جاحظ کی سوانح حیات اور اس کی تصانیف

پروفیسر ڈار نے ان متعدد اردو مضامین کے علاوہ گجرات کے خلجیوں سے متعلق مضامین بہ زبان انگریزی قلم بند کیے تھے جو بعد میں پروفیسر ڈار پبلی کیشن کمیٹی سے مشہور مورخ کامیسیرٹ (M.S.COMMISARIAT)

کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوئے۔ دراصل پروفیسر ڈار کا اردو اور انگریزی مضامین سے زیادہ وقیع کارنامہ مشہور عربی دانشور ''جاحظ'' کی کتاب البغلا'' کا اردو ترجمہ ہے۔ نیز یہ مضامین اور ترجمہ پروفیسر ڈار کو ایک اعلیٰ پائے کا محقق ونقاد ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔

مختصراً کہا جائے تو ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی، پروفیسر ڈار کو اپنا استاد مانتے تھے اسی لیے انہوں نے پروفیسر ڈار کے انتقال کے بعد ان کے مضامین ویکجا کر کے ''مضامین ڈار'' شائع کی تھی۔ جس پر ایک تنقید یہ ہوئی کہ اس میں ''جاحظ'' پر ان کے مقالے شامل نہیں ہیں تو ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی کے شاگرد خاص پروفیسر عبدالستار دلوی نے جاحظ سے متعلق مقالہ تلاش کر کے ''مضامین ڈار'' کو از سر نو ترتیب دے کر اپنے استاد حقیقی ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی اور استاد معنوی پروفیسر ڈار دونوں کی شاگردی کا حق ادا کر دیا ہے۔

4.1.17۔مبادیاتِ تحقیق:

عبدالستار دلوی نے عبدالرزاق قریشی کی نایاب تصنیف مبادیاتِ تحقیق کو اضافے کے ساتھ ترتیب دے کر 2014ء میں انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے دوبارہ شائع کیا ہے۔ جس کی قیمت 100 روپے اور ضخامت 116 صفحات ہیں۔ واضح رہے کہ عبدالرزاق قریشی نے ریسرچ اسکالرس کے لیے ''مبادیات تحقیق'' لکھ کر 1968ء میں ادبی پبلیشر، بمبئی سے شائع کی تھی مگر وہ اب دستیاب نہیں ہوتی۔ جس کی جہ سے انہوں نے اسے دوبارہ شائع کیا تو صدر انجمن اسلام، ممبئی ڈاکٹر ظہیر قاضی اس کتاب کی اشاعت ثانی سے متعلق اپنے ابتدائیہ میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر پروفیسر عبدالستار دلوی کی اس اہم اور مفید کتاب کی جانب توجہ دلانے اور اصرار پر انجمن اسلام نے اس کتاب کی دوبارہ اشاعت کا فیصلہ کیا۔''

(''مبادیاتِ تحقیق''، مرتبہ: پروفیسر عبدالستار دلوی، ص:5)

اگر ہم ''مبادیات تحقیق'' اشاعت اول اور اشاعت ؟ ثانی دونوں کا بغور جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ اشاعت ثانی میں کوئی ترمیم نہیں ہے۔صرف اضافہ ہے اور یہ اضافی حصہ ''تعارف وتذکرہ'' کے عنوان سے پروفیسر عبدالستار دلوی نے ہی تحریر کیا ہے جس کی طویل تمہید میں انہوں نے اردو میں تحقیقی مضامین اور تصانیف کی تاریخ بیان کرتے ہوئے عبدالرزاق قریشی کی ''مبادیات تحقیق'' سے متعلق یوں لکھا ہے:

> ''عبدالرزاق قریشی مرحوم کی کتاب ''مبادیات تحقیق'' اردو میں تحقیق کے اصول وضوابط اور طریق کار پر پہلی کتاب ہے جو اپنی اہمیت اور تحقیق میں سائنسی ادراک کی بنیادی اور اہم ترین کتاب کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رہے گی۔''

(''مبادیاتِ تحقیق'' مرتبہ: پروفیسر عبدالستار دلوی، ص:8)

عبدالستار دلوی اپنے ''تعارف وتذکرے'' میں آگے عبدالرزاق قریشی کا تعارف کرواتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ اعظم گڑھ میں بستی بسہم سے تعلق رکھتے ہیں۔وہاں سے اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ بمبئی آ کر انجمن اسلام ہائی اسکول میں درس وتدریس دینے لگے تو طلبہ میں کافی مقبول ہوئے۔جس کی بنا پر ان کا شمار شہر بمبئی کے تین اردو اساتذہ، استاد مولانا جالب مظہری، استاد محمد بشیر اور استاد عبدالرزاق قریشی میں ہوتا ہے۔جنھوں نے طلبہ کی زبان دانی، درس وتدریس میں مہارت، طلبہ کی ذہنی تربیت اور ادبی ذوق وشوق کو پروان چڑھایا ہے۔ان کے تعلقات اسماعیل یوسف کالج کے اساتذہ جیسے ڈاکٹر محمد بذل الرحمٰن، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، پروفیسر محمد ابراہیم ڈار اور پروفیسر داؤد پوتا سے قریبی تھے۔مگر پروفیسر نجیب اشرف ندوی اور عبدالرزق قریشی میں ایک مشترکہ قدر اعظم گڑھ تھی۔جس کی وجہ سے وہ ان سے زیادہ ہی قریب تھے۔اسی لیے جب پروفیسر نجیب اشرف ندوی انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے تو انہوں نے عبدالرزاق قریشی کو ریسرچ اسسٹنٹ کے عہدے پر مامور کیا۔تو یہاں سے ان کی علمی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا جس میں مبادیات تحقیق، دیوان عزلت، مثنوی راگ مالا، نوائے آزادی (نظموں کا مجموعہ)، تاثرات (مضامین کا مجموعہ) کئی نصابی کتابیں اور دوسرے

مضامین شامل ہیں۔اور چوں کہ عبدالرزاق قریشی اپنے شاگردوں میں خاصے مقبول تھےاسی لیےان کے شاگرد آج بھی اپنے استادمحترم کو بڑے احترام سے یاد کرتے ہیں اورانہوں نے مسز کلثوم سایانی کےہفت روزہ ''رہبر'' کی بھی صحافت کی اور اپنی عمر کے آخری دور میں واپس اعظم گڑھ میں دارالمصنفین کے فیلو کی حیثیت سے لوٹ گئے جہاں 30/ جولائی 1977ء کوآپ نے انتقال کیا۔

4.1.18۔ مولانا ابوالکلام آزاد: ایک مطالعہ:

عبدالستار دلوی نے ''مولانا ابوالکلام آزاد :ایک مطالعہ'' کوترتیب دے کر 2015ء میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی سے شائع کیا ہے۔جس کی قیمت 216 روپےاورضخامت 474 صفحات ہیں اور کتاب کے سرورق پرمولانا آزاد کی نہایت ہی خوب صورت اور رنگین تصویر دی گئی ہے جو کتاب کی زینت بڑھا رہی ہے۔

پیش نظر کتاب میں سب سے پہلے ڈائرکٹر قومی کونسل پروفیسر سیدعلی کریم کاقلم بند کیا ہوا'' پیش لفظ'' ہے۔ جس میں انہوں نے مولانا آزاد کامختلف حیثیتوں سے تعارف کرایا ہے۔

عبدالستار دلوی نے اپنے مقدمے کی تمہید میں ابن عربی (وحدت الوجود کے پیرو) اور حضرت شیخ احمد سرہندی (وحدت الشہود کے پیرو) کے مذہبی عقائد پرانیسویں صدی میں پڑنے والے سیاسی اثرات کا ذکر کرتے ہوئے سرسید، مولوی چراغ علی، مولانا شبلی اور دیگر کے نام گنوائے ہیں۔جنہوں نے اسلامی تعلیمات کو جدید تعلیم کے ساتھ ایک نئے تناظر میں پیش کیا۔اور بیسویں صدی میں اس سلسلے کوآگے بڑھانے والوں میں ومولانا مودودی، علامہ اقبالؒ، مولاانا ابوالکلام آزاد اور پروفیسر آصف علی اصغر ضیفی کے نام دیے ہیں۔جن کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں نے''اظہارخودارادیت'' کوسمجھا اور پیش کیا ہے۔

عبدالستار دلوی اب پس منظر میں مولانا ابوالکلام آزاد کو بہ حیثیت صحافی پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انہوں نے کم سنی ہی میں شاعری اور صحافت کا آغاز کر دیا تھا۔ان کے مضامین مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوکر

شرف مقبولیت حاصل کرر ہے تھے۔ جس میں ان کی آزادانہ رائے کا بڑا دخل تھا جو دراصل جمال الدین افغانی کے زیر اثر تھی۔ اور جب انگریزوں نے 1905ء میں تحریک آزادی کو دبانے کے لیے تقسیم بنگال کیا تو اس کے اثر سے ان کے مضامین میں تنقید کا عنصر اور نمایاں ہوگیا اب انہوں نے ''الہلال'' کے ذریعہ مسلمانوں میں بیداری اور اصلاح کی جس کا لازمی نتیجہ تھا کہ مسلمان تعداد میں کم ہونے کے باوجود ہندوؤں کے شانہ بہ شانہ تحریک آزادی اور خلافت کی تحریک میں شریک ہوئے اور ملک کو غلامی سے آزاد کرایا۔ غالباً مسلمانوں کی اسی بیداری مہم اور اصلاح سازی میں مولانا نے ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کے سہارے ایک اہم رول ادا کیا ہے۔

مقدمہ نگار نے مولانا ابوالکلام آزاد کو بہ حیثیت سیاست داں پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ پہلے ہی، چانکیہ، ابن تیمیہ، امام ابوحنیفہ، ٹیپو سلطان، شیخ الہند محمود الحسن اور تانتیا ٹوپے کا گہرائی سے مطالعہ کر چکے تھے۔ اور 1920ء میں گاندھی جی سے ملے تو اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنے آخری وقت تک ان کے قدم سے قدم ملا کر چلتے رہے۔ جس کے نتیجے میں انہوں نے قید و بند کی صعوبتیں بھی سہی، اپنوں کی ناراضگی برداشت کی اور چند لوگوں نے ہدف ملامت کا نشانہ بھی بنایا۔ مگر وہ اپنے ارادوں پر مضبوطی سے ڈٹے رہے۔ جس کے لیے کبھی باطل کے سامنے سر جھکایا اور نہ کبھی اپنے اصولوں کی قربانی دی۔ ان کی سیاسی عظمت کی دلیل یہ ہے کہ وہ تقریباً پچاس سال ہندوستانی سیاسی فضا پر چھائے رہے اور تین بار کانگریس پارٹی کے صدر منتخب ہوئے۔

عبدالستار دلوی لکھتے ہیں کہ مولانا آزاد مسلم رہنما تھے جنہوں نے متحدہ قومیت کا تصور پیش کیا اور اپنی تمام تر قوتوں کے ذریعے اسے عملی جامع پہنایا۔ وہ مسلم لیگ کی دوقومی سیاست سے پریشان تھے۔ اور مسلمانوں کو ان کی پالیسیوں اور تقسیم ہند کے مضر اثرات سے واقف کراتے تھے۔ آج ماہرین متحدہ قومیت پر زور دے رہے ہیں مگر انہوں نے تقریبا ساٹھ سال پہلے ہی عالمی اتحاد اور متحدہ قومیت کا تصور پیش کیا تھا۔ جس کے تحت انہوں نے کہا تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کو یہاں رہ کر ہندوستان اور اسلام دونوں سے رشتہ بنائے رکھنا چاہیے۔ اور انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ جتنے مسلمان حملہ آور ہندوستان آئے انہوں نے یہی بود و باش اختیار کی اور اپنی تہذیب و معاشرت

سے ہندوستانی تہذیب ومعاشرت کو متاثر کرتے رہے اور تہذیبی ملاپ ہوتا رہا۔ اس ملاپ نے ہندوستان کی تہذیب کو قدیم وجدید کے دوراہے پر کھڑا کر دیا تھا۔ جو ہماری مشترکہ تہذیب ہے اور اسی تہذیب میں ہماری متحدہ قومیت کی نشوونما ہوئی تھی۔ لیکن تحریکِ آزادی کے دوران ہندوستان میں مذہبی اعتبار سے تہذیبی جنگوں کا آغاز ہوا۔ جس میں ایک کے دعویدار ہندو تھے تو دوسرے کے مسلمان۔ انہوں نے اس کشمکش کو بہ خوبی سمجھ لیا تھا اسی لیے انہوں نے ہمیشہ متحدہ قومیت کو ہی اپنا نصب العین بنائے رکھا۔

فاضل مقدمہ نگار اپنے مقدمے میں آگے لکھتے ہیں کہ ہندوستان کی تحریک آزادی کے دوران ایک لسانی فتنہ ''اردو اور ہندی'' زبان کا کھڑا ہو گیا کہ تقسیم کے بعد ہندوستان کی قومی زبان کون سی ہوگی؟ اس سلسلے میں گاندھی جی نے ہندوستانی کا نظریہ پیش کیا تو انہوں نے اردو کے ادیب وصحافی ہونے کے باوجود قومی مفاد پر زور دیا۔ اور ہندی کو قومی زبان تسلیم کر لیا۔ لیکن اپنی ذات سے ہمیشہ اردو کی بقا کے لیے کوشاں رہے اور ہندوستان میں مسلمانوں کی مجموعی شناخت کے پیش نظر اردو کو ہندوستانی زبانوں میں قومی حیثیت سے منوا کے ہی چھوڑا۔

عبدالستار دلوی مقدمے میں آگے یہ بھی لکھتے ہیں کہ مولانا آزاد سرسید کے بعد وہ مصلح ہیں جنہوں نے مسلمانوں کے مسائل پر سنجیدگی سے غور کیا اور اقدامات کیے۔ جہاں انہوں نے تحریک آزادی کے دوران مذہب اور فرقے کی بنیاد پر سیاسی جماعتوں کی مخالفت کی تھی وہیں تقسیم ہند کے بعد جامع مسجد دہلی میں مسلمانانِ ہند سے مخاطب ہوئے تو اس خطاب کے ایک ایک لفظ سے ان کا خلوص اور دردمندی ظاہر ہوتی ہے۔

عبدالستار دلوی کے خیال میں مولانا آزاد مادری زبان کی اہمیت سے بہ خوبی واقف تھے اور انگریزی ذریعے تعلیم کی خوبیوں اور خامیوں سے بھی آگاہ تھے جس کی وجہ سے انہوں نے جہاں انگریزی ذریعے تعلیم کی تائید کی وہی تعلیم کو فنی تربیت سے بھی جوڑ دیا۔ اتنا ہی نہیں انہوں نے تعلیمی میدان میں ترقی کے لیے یونی ورسٹی گرانٹ کمیشن (UGC) جیسی مستقل تنظیم بھی بنائی ہے اور سائنس کی ترقی کے لیے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی بھی قائم کیا ہے وہیں زرعی شعبے میں ترقی کے لیے انڈین کونسل فار ایگری کلچر اینڈ سائنٹفک ریسرچ سنٹر بنایا۔ ان کے

علاوہ انڈین کونسل فار میڈیکل ریسرچ اور انڈین کونسل فار انٹرنیشنل ریسرچ کی بھی بنیاد ڈالی ہے۔علاوہ بریں انہوں نے للت کلا اکادمی، سنگیت ناٹک اکادمی اور ساہتیہ اکادمی بھی قائم کیں تاکہ مصوری، موسیقی، رقص، سنگ تراشی اور ادب کی ترقی ہو جو ہمارا تہذیبی وثقافتی ورثہ ہے۔انھیں تاریخ سے بھی دلچسپی تھی۔لہٰذا وہ چاہتے تھے کہ مغربی اقوام سے ماضی کے جو رشتے ہیں وہ مستقل میں بھی قائم رہے اسی لیے انہوں نے نیشنل کونسل فار کلچرل ریلیشن کی بھی بنیاد ڈالی۔

عبدالستار دلوی مقدمے کے آخری مرحلے میں مولانا آزاد پر اب منعقد ہو چکے سمیناروں، شائع شدہ کتب اور مختلف رسائل کے خصوصی نمبروں کا ذکر کرتے ہوئے اپنی طرف سے اس کتاب کو مرتب کرنے کی وجہ یوں بیان کرتے ہیں کہ قومی کونسل مولانا آزاد کے یوم پیدائش 11 /نومبر 2015 کو انھیں خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ایک کتاب ترتیب دینا چاہتی تھی جس کے لیے کونسل نے ان کو منتخب کیا تو انہوں نے بھی بقیہ کتابوں سے اس کتاب کو مختلف بتانے کے لیے ایسے مضامین کا انتخاب کیا جو مولانا آزاد کے معاصرین کے علاوہ ایسے علمائے ادب کی یادگار ہوں جنھیں لوگ اب بھول گئے ہوں۔دراصل انہوں نے کتاب ہذا میں شامل 36 مضامین کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے جیسے حصے اول سوانح، یادیں، ملاقاتیں اور تاثرات کے عنوان سے ہے جس میں شامل مضامین یوں ہیں:

1۔	امام الہند مولانا آزاد کی سوانح عمری	: آصف علی فیضی
2۔	زلیخا بیگم	: حمیدہ سلطانہ
3۔	مولانا ابوالکلام آزاد: ایک نادرروزگار شخصیت	: غلام رسول مہر
4۔	مولانا آزاد فقر وفاقہ میں: کچھ تاثرات	: عبدالرزاق ملیح آبادی
5۔	مولانا آزاد کے فکر ونظر کی چند جھلکیاں	: حافظ علی بہادر خان
6۔	ایک میزبان کے مشاہدات	: اروناز آصف علی
7۔	عہد آفرین شخصیت	: ہمایوں کبیر

8۔ آزاد: ایک باغ و بہار شخصیت : احمد سعید ملیح آبادی

9۔ کچھ بھولی بسری یادیں : مالک رام

10۔ ایک غیر معمولی شخصیت : ڈاکٹر راجندر پرشاد

11۔ مولانا ابوالکلام : پنڈت جواہر لال نہرو

12۔ مولانا ابوالکلام : پنڈت سندر لال

13۔ مولانا ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت : ڈاکٹر ذاکر حسین

14۔ مولانا آزاد سے ایک ملاقات : جمنا داس اختر

اسی طرح حصہ دوم کا عنوان ''سیاسی، تعلیمی اور صحافتی مطالعہ'' ہے جس میں کل آٹھ مضامین شامل ہیں جیسے:

1۔ مولانا آزاد کا علمی تبحر : پروفیسر خلیق احمد نظامی

2۔ مولانا آزد کا تعلیمی فلسفہ : خواجہ غلام السیدین

3۔ مولانا آزاد کے دو بڑے سیاسی کارنامے : پروفیسر رشید الدین خان

4۔ ہندوستانی کلچر کی نشاۃِ ثانیہ میں مولانا آزاد کی خدمات : ڈاکٹر محی الدین قادری

5۔ مولانا آزاد: فلسفی، انسان اور قائد کی حیثیت سے : ڈاکٹر اختر اورینوی

6۔ مولانا آزاد اور سائنسی علوم : پروفیسر وہاب قیصر

7۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور ہندی فلسفہ : صفی الدین صدیقی

8۔ مولانا آزاد: قومی تعلیمی پالیسی 1986ء کے پیش رو مفکر : عبداللہ ولی بخش قادری

اور حصہ سوم ''صحافی و سیاسی پہلو'' کے عنوان سے ہے تو اس حصے کے مضامین اس طرح ہیں:

1۔ مولانا آزاد کی صحافتی عظمت	:	نیاز فتح پوری
2۔ مولانا آزاد کی صحافتی عظمت	:	پروفیسر خواجہ احمد فاروقی
3۔ مولانا آزاد کا ذوقِ جمال	:	علی سردار جعفری
4۔ مولانا آزاد کے مکاتیب	:	ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی
5۔ مولانا ابوالکلام آزاد: سیاست اور ادب کی آویزش	:	سید حامد
6۔ مولانا آزاد غبار خاطر کے آئینے میں	:	گوپی ناتھ امن لکھنوی
7۔ جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر	:	صدیق الرحمٰن قدوائی
8۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے احسانات اردو پر	:	مالک رام

حصہ چہارم ''مذہبی افکار'' کے عنوان سے ہے اس حصے میں چھ مضامین موجود ہیں جو یہ ہیں:

1۔ ترجمان القرآن	:	سید احمد اکبر آبادی
2۔ مولانا آزاد کی مفسرانہ حیثیت	:	علامہ سید اختر علی تاہری
3۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی فکر کا مذہبی پہلو	:	پروفیسر انور معظم
4۔ مولانا آزاد کی عصری معنویت	:	پروفیسر انور معظم
5۔ آزاد کی فکری زندگی	:	عالم خوندمیری
6۔ ترجمان القرآن: ایک مطالعہ	:	مشیر الحق

کتاب ہذا کے چاروں حصوں میں سب سے پہلے مقدمہ نگار کا ابتدائیہ ملتا ہے جو اس حصے کے مضامین کا پس منظر محسوس ہوتا ہے کیوں کہ ان میں انہوں نے اس مخصوص حصے میں شامل مضامین سے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔

مختصر کہا جائے تو پیش نظر کتاب ''مولانا ابوالکلام آزاد: ایک مطالعہ'' مولانا آزاد سے متعلق ایک اہم حوالہ جاتی کتاب ہے جس سے ادب کا ہر خاص و عام طالب علم استفادہ کر سکتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مقدمے میں اختصار اور رواداری سے کام لیا جاتا ہے۔ لیکن پروفیسر عبدالستار دلوی کے بیشتر مقدمے طویل ہیں۔ اور ان کے طویل مقدموں میں ''من سمجھاون'' ''رانی کیتکی کی کہانی'' ''دکنی اردو'' ''گھر آنگن'' اور ''علی سردار جعفری: شخص، شاعر اور ادیب'' وغیرہ کتابوں پر لکھے گئے مقدمے شامل ہیں۔ اور جہاں تک رواداری کا تعلق ہے۔ بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ پروفیسر عبدالستار دلوی بہ حیثیت مرتب و مقدمہ نگار غیر روادار ہیں۔ جس کی مثال کے طور پر ''انتخاب کلام مصحفی'' ''من سمجھاون'' ''رانی کیتکی کی کہانی'' ''امرت بانی'' ''دکنی اردو'' اور حضرت مخدوم علی مہائمی (تین مقالات) وغیرہ وغیرہ کتابوں پر لکھے گئے مقدمے پیش کیے جا سکتے ہیں۔

دراصل اختصار اور رواداری سے کام لینے کی وجہ سے مقدمے رسمی اور تعارفی بن جاتے ہیں۔ مگر پروفیسر عبدالستار دلوی کے ''انتخاب کلام مصحفی'' کرشن چندر، شخص، شاعر اور ادیب اور ''نوائے سروش'' وغیرہ کتابوں پر لکھے ہوئے مقدمے مختصر ہونے کے باوجود جامع اور مدلل ہیں۔ اسی لیے یہ تعارفی اور رسمی سطح سے آگے بڑھ کر تحقیقی و تنقیدی میدانوں میں داخل ہو جاتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ان کی اہمیت حوالہ جاتی بن جاتی ہے۔

کسی بھی مقدمے کو اچھے اور بُرے کی سطح پر پرکھنے کے لیے یہ بھی ایک اصول ہے کہ مقدمہ نگار مطالب کتاب میں اضافہ کرے جس کے لیے وہ کہیں سوالیہ انداز اختیار کر سکتا ہے۔ کہیں رائے دیتا ہے اور کہیں ہیں اس رائے کی وضاحت یا تشریح بھی کر دیتا ہے۔ اور اگر ہم پروفیسر عبدالستار دلوی کے لکھے ہوئے مقدمات کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے ہر مقدمے میں مطالب کتاب میں اضافہ کیا ہے جس کے لیے وہ بھی کہیں سوالیہ انداز اختیار کرتے ہیں تو کہیں وضاحتی اور کہیں کہیں پر صرف رائے پر اکتفا کر جاتے ہیں۔ دراصل وہ اپنی بات کہنے

کے لیے جو انداز مناسب سمجھتے ہیں وہ انداز اختیار کر لیتے ہیں۔ اسی لیے ان کے مقدمے کتاب پر اضافی حیثیت حاصل کر جاتے ہیں۔ جیسے کتاب ''ادبی ولسانی تحقیق اصول وطریق کار'' کا مقدمہ۔ یہ مقدمہ اپنی اضافی حیثیت کی بنا پر اتنا مقبول ہوا کہ اسے سندھی میں بھی ترجمہ کیا گیا۔ اور اس ترجمہ پر پروفیسر بلدیو متلانی کو 1999ء میں ساہتیہ اکادمی کا ترجمہ ایوارڈ ملا اور اسے پاکستان میں بھی اس قدر سراہا گیا کہ وہاں کی تحقیقی کتابوں میں شامل کر لیا گیا۔ ان دلائل سے اس مقدمے کی کامیابی اور اضافی حیثیت دونوں ظاہر ہو رہی ہیں۔

غرض کہ پروفیسر عبدالستار دلوی کے سپرد قلم کیے گئے مقدمات اپنی مختلف نوعیت، اختصار، طویل، غیر روادار اور تحقیق وتنقید کے باوجود قاری کے ذہن میں کتاب سے متعلق جستجو بڑھانے کے لیے کافی ہے۔ جس کی بنا پر وہ بہ حیثیت مرتب وہ مقدمہ نگار ایک اعلیٰ مقام کے حق دار ہیں۔

4.2۔ تحقیق وتنقید (عبدالستار دلوی بہ حیثیت محقق ونقاد)

ادب لغت کے اعتبار سے ایک ایسا عمل ہے جس میں فکر یا ذہن کے تخلیقی فعل کا حصہ کچھ زیادہ نہیں۔ اور اگر ہم ادب کی تعریف یا اصطلاحی معنی دیکھیں تو اس کی تعریف سے متعلق مختلف نظریوں کا اختلاف پایا جاتا ہے کیوں کہ کوئی اس کو ماہیت کے اعتبار سے دیکھتا ہے تو کوئی موضوع کے نقطۂ نظر سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور کوئی صورت کو اہمیت دیتا ہے تو کوئی اس کے مضمون پر نظر رکھتا ہے۔ غرض جتنے نظریات اتنی تعریفیں ملتی ہیں۔ ایسے میں ڈاکٹر سید عبداللہ ادب کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''ادب ایک فن لطیف ہے جس کا موضوع زندگی ہے اس کا مقصد اظہار ترجمانی اور تنقید ہے۔ اس کا سرچشمہ تحریک احساس ہے اس کے معاون اظہار، تخیل اور قوت مخترع ہے اور اس کے خارجی روپ میں بہت اور خوب صورت پیرایہ ہائے اظہار ہیں جو لفظوں کی مدد سے تحریر کی صورت اختیار کرتے ہیں۔''

(''مباحث''، ص:343)

ادب سے متعلق چار مختلف نظریات (ماہیت، مقصد، موضوع صورت اور مضمون) پر مشتمل ڈاکٹر سید عبداللہ نے ادب کی جو تعریف کی ہے وہ دوسری تمام تعریفوں سے جامع اور اہم ہے۔

دراصل ادب انسانی زندگی کا ایک ایسا ترجمان ہے، جس میں انسانی جذبات واحساسات کے علاوہ مشاہدات، تجربات اور خیالات کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ اس میں تاریخی حقیقت، زندگی کا سچا تصور اور فن کے صحیح احساس کا ہونا ضروری ہے۔

ادب کو تین شعبوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جو تخلیق تحقیق اور تنقید ہیں۔ اور آیئے ایسا ان تینوں شعبوں فن تخلیق فن تحقیق اور فن تنقید کا مختصر احاطہ کرتے چلیں تا کہ ان کی اہمیت وافادیت کا بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکے۔

فن تخلیق:

تخلیق دراصل تخلیقی قوت کی اختراع ہوتی ہے اور تخلیقی قوت کم یا زیادہ ہر انسان میں پائی جاتی ہے۔ لہٰذا جس میں یہ قوت زیادہ ہوتی ہے وہ اس کی مدد سے اپنے خیالات واحساسات کو فن کے مختلف پیرایوں میں بیان کرتا ہے۔ اسی لیے کوئی شاعر ہے تو کوئی افسانہ نگار، کوئی ادیب ہے تو کوئی ناول نگار، غرض کہ وہ اپنی طبیعت کے میدان کے مطابق ادب کی کسی مخصوص صنف کا انتخاب کرتا ہے اور اپنی تخلیقی قوت کے ذریعے کوئی نئی تخلیق عالم وجود میں لاتا ہے۔ تخلیق اور تخلیقی قوتوں سے متعلق ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کے خیالات دیکھیے:

> ''تخلیق کرنے والا، تخلیقی قوت رکھنے والا جیسے زندگی کو دیکھتا ہے ویسے ہی ایک اپنے کو دیکھتا ہے۔ جیسے وہ کسی فرد کا زندگی کے معاملے کو ایک تخیلی صورت دیتا ہے۔ ویسے ہی ایک شاعر یا شاعری کے بابت معاملے کو ایک نیا جامعہ پہنا کر ایک نئے عالم میں لے آتا ہے۔ اور اسی طرح دائمی تصورات میں اضافہ کرتا ہے۔'' (''فریبِ نظر''،ص:29)

ڈاکٹر احسن فاروقی کے تخلیق سے متعلق ان خیالات کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ تخلیقی عمل، تخلیق، تخلیق

کاراور قاری کے درمیان انجام پاتا ہے۔

فن تحقیق:

انسان ہر واقعے اور حادثے سے جانکاری حاصل کرنے کے لیے بے چین رہتا ہے اور اپنی بے چینی کو دور کرنے کے لیے وہ سچ کی تلاش کرتا ہے۔اسی طرح وہ کسی بھی چیز کی تلاش، دریافت اور شناخت کے لیے جو کچھ کرتا ہے وہ عمل ''تحقیق'' کہلاتا ہے۔

لفظ ''تحقیق'' کے لغوی معنی کھوج، تفتیش، دریافت اور چھان بین کے ہیں اور ڈاکٹر قاضی عبدلقادر تحقیق کی تعریف یوں کرتے ہیں:

> ''علمی تحقیق سے جو ایک عام تصویر ذہن میں آتی ہے۔اس میں گرد آلود کتابیں، کرم خوردہ مسودے یا پیچیدہ سائنسی آلات نظر آتے ہیں۔ حالاں کہ تحقیق ایسا خائف کرنے والا علمی کام نہیں۔ سادہ ترین الفاظ میں تحقیق، علم کی خاطر ضابطوں اور قاعدوں کا لحاظ رکھتے ہوئے تفتیش اور ہڑتال کرنا ہے۔''

(تصنیف وتحقیق کے اصول،ص:55)

علمی تحقیق کی ابتداً مفروضے (شک) سے ہوتی ہے۔ دوران تحقیق ضابطوں اور قاعدوں کے ذریعے اس مفروضے کو صحیح یا غلط ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور آخر میں نتیجے کے طور پر بتا دیا جاتا ہے کہ ہمارا مانا ہوا مفروضہ صحیح ہے یا غلط۔اس پورے عمل میں مفروضے کو صحیح یا غلط ثابت کرنے کی جو کوشش ہے وہی اصل میں تفتیش، دریافت چھان بین، ہڑتال وغیرہ وغیرہ ہیں اور اسی کو علمی اصطلاح میں ''تحقیق'' کہا جاتا ہے۔

فن تنقید:

ہر انسان کے پاس اچھے بُرے، صحیح غلط اور کھرے کھوٹے کی پرکھ کا شعور ہوتا ہے۔لیکن کمیت کے اعتبار

سے یہ کسی میں کم اور کسی میں زیادہ ہوتا ہے۔ یہ وہ شعور ہے جو اشرف المخلوقات کو دوسرے جانداروں سے ممیّز کرتا ہے۔اوراسی شعورکوہم ''تنقید'' یا ''تنقیدی شعور'' بھی کہتے ہیں۔

لغت کی رو سے تنقید کھرے کھوٹے کی پرکھ کا نام ہے اور آل احمد سرورتنقید کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

> ''تنقید کا نام فیصلہ ہے۔دودھ کا دودھ، پانی کا پانی الگ کر دیتی ہے۔تنقید وضاحت ہے۔ تجزیہ ہے۔تنقید قدریں متعین کرتی ہیں۔ادب اور زندگی کو ایک پیمانہ دیتی ہے۔تنقید انصاف کرتی ہے۔ادنیٰ اور اعلیٰ جھوٹ اور سچ، پست اور بلند کا مقام قائم کرتی ہے۔'' (''تنقید کیا ہے؟''ص:199)

آل احمد سرور کی بیان کردہ اس تعریف سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ انسان اپنے روزمرہ معاملات و معمولات میں اپنی تحریروں میں غرض، زندگی کے ہر میدان میں جو اچھے برے، سچ جھوٹ، ادنیٰ اعلیٰ، کھرے کھوٹے، پست بلند اور صحیح و غلط کے جو فیصلے اور امتیاز کرتا ہے وہ ''تنقید'' ہے اور ''فن تنقید'' ادب کے لیے ایک ناگزیر حیثیت رکھتی ہے۔

ان اوراق میں ہم نے ادب اور اس کے شعبے فن تخلیق، فن تحقیق اور فن تنقید سے متعلق بنیادی معلومات حاصل کر لی ہیں تو آیئے اب ان کے ایک دوسرے مشترک ومختلف عناصر کا بھی مختصراً جائزہ لیتے چلیں۔

واضح رہے کہ تخلیق، تحقیق اور تنقید میں تخلیق کو بنیادی حیثیت حاصل ہے جب کہ تحقیق اور تنقید ثانوی درجہ رکھتے ہیں کیوں کہ تحقیق اور تنقید دونوں تخلیق ہی پر منحصر ہیں۔اور محقق ہو یا نقاد دونوں کو تخلیق سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ اسی لیے تخلیق بنیادی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔

تحقیق اور تنقید کے لغوی اور اصطلاحی معنوں میں اختلاف ہے۔ویسے ہی دونوں کے باہمی رشتوں میں بھی چند اختلافات پائے جاتے ہیں۔

1۔ تحقیق کا موضوع پوشیدہ ہوتا ہے جب کہ تنقید کا موضوع عیاں ہوتا ہے۔

2۔ تحقیق تخلیق کے پست پردہ عناصر کا پتہ لگاتی ہے تو تنقید تخلیق کی اہمیت و ماہیت کو بیان کرتی ہے۔

3۔ تحقیق سے علم میں اضافہ ہوتا ہے لیکن تنقید سے علم میں اضافہ نہیں ہوتا مگر وہ علم سے واقف ضرور کراتی ہے۔

4۔ تحقیق کا مقصد حقائق کی دریافت ہے تو وہیں تنقید کا مقصد قدریں متعین کرنا ہے۔

5۔ تحقیقی عمل سائنسی ہوتا ہے مگر تنقید میں ایسی کوئی شرط نہیں۔

6۔ تحقیق معروضی ہوتی ہے جب کہ تنقید جانب دار بھی ہوسکتی ہے۔ان اختلافات کے باوجود دونوں میں مشترکہ عناصر بھی ملتے ہیں جیسے:

1۔ تحقیق وتنقید ادب کے ہی شعبے ہیں۔

2۔ تحقیق وتنقید دونوں کا دارومدار ''تخلیق'' پر ہے۔

3۔ تحقیق وتنقید دونوں کا مقصد ادب میں اضافہ اور ادب کو مفید بنانا ہے جس سے سماج کو فائدہ پہنچے۔

4۔ تحقیق وتنقید دونوں ہی میں تشریح، وضاحت، دلائل جیسی خصوصیات سے کام لیا جاتا ہے۔

ادب، ادب کے مختلف شعبے، تخلیق، تحقیق، تنقید ان کے اشتراک اور اختلافات کو جان لینے کے بعد اب آیئے عبدالستار دلوی کی تحقیق وتنقیدی کتب کے حوالے سے ان کی تحقیق وتنقید کی نوعیت ومعیار کا جائزہ لیا جاسکے۔

4.2.1۔ نئی تحریریں:

''نئی تحریریں'' عبدالستار دلوی کے گیارہ تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو 1986ء میں کوکن اردو رائٹرز گلڈس شائع ہوا ہے۔اس مجموعہ مضامین میں شامل مضامین یہ ہیں:

1۔ اقبال اور بمبئی

2۔ پریم چند کا قیام بمبئی

3۔ مولوی عبدالحق: نفسیاتی مطالعہ

4۔ سکندر علی وجدؔ: فنون لطیفہ کا شاعر

5۔ شاہ تراب چشتی: نظیرا کبرآبادی کا پیش رو

6۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی۔ علمی زندگی کے تین دور

7۔ ندوی صاحب: شخصیت اور کردار

8۔ وشنوسکھا رام کھانڈیکر

9۔ ہندوستان کا لسانی مسئلہ اور گاندھی جی

10۔ اردو کا ہندوستانی رجحان

11۔ شبلی مکتوب نگار کی حیثیت سے

متذکرہ بالا مضامین مختلف ادیب وشعراؑ کی مختلف خصوصیات سے متعلق ہیں مگر ان میں سے اکثر مضامین کا تعلق کسی نہ کسی طرح، کبھی نہ کبھی مہاراشٹر بالخصوص بمبئی سے رہا ہے۔ جیسے اقبال اور بمبئی، کبھی نہ کبھی مہاراشٹر بالخصوص بمبئی سے رہا ہے۔ جیسے اقبال اور بمبئی، پریم چند کا قیام بمبئی، ندوی صاحب شخصیت و کردار، نجیب اشرف ندوی، علمی زندگی کے تین دور، شبلی مکتوب نگار کی حیثیت سے، سکندر علی وجد: فنون لطیفہ کا شاعر اور وشنوسکھا رام کھانڈیکر وغیرہ وغیرہ۔ عبدالستار دلوی اپنے پیش لفظ میں ان ادیب وشعراؑ کے بمبئی اور مہاراشٹر سے تعلقات پر لکھتے ہیں:

''بمبئی اردو کا ایک اہم مرکز ہے۔ اس کی تہذیبی و تجارتی حیثیت کے پیش نظر ہندوستان کے مختلف علاقوں سے شاعر اور ادیب یہاں آتے رہے۔ یہاں کی زندگی سے انہوں نے روشنی حاصل کی۔ کچھ کامیاب بھی ہوئے اور کچھ ناکام بھی

رہے۔ایسے ہی لوگوں میں شبلی، اقبال اور پریم چند کا شمار ہوتا ہے۔شبلی نے اپنی
ہر متاع کہنہ وتو کو بمبئی پر نثار کر دیا تھا۔اور کنارِ آب چوپائی اور گلگشت اپالو کے
گرویدہ ہو گئے تھے۔ اس کا رنگین عکس، ''خطوط شبلی'' ''اور دستہ گل'' میں پایا
جاتا ہے۔مولوی عبدالحق نے اردو تحریک کا کام اورنگ آبادی سے شروع کیا اور
مختلف جہتوں میں کام کر کے اردو کے جسم میں تازہ خون دیتے رہے۔ گجری اور
دکنی کی تحقیقات کا پودا بھی یہیں پروان چڑھا۔سکندر علی وجؔد، سراج اور ولی کے
بعد اردو شاعری کو مہاراشٹر کی سب سے بڑی دین۔ پروفیسر ندوی کی باغ و بہار
شخصیت نے بمبئی کی تعلیمی زندگی پر دور رس اثرات چھوڑے ہیں۔ ہزاروں
طالب علموں کی ادبی تربیت کی اور ان کے علمی و تحقیقی ذوق کو جلا بخشی۔ ان
مضامین میں یہی مقامی رنگ جاری وساری ہے۔اور ان مضامین کو اس مجموعہ
میں پیش کرنے کا یہی منطقی و علمی جواز بھی ہے۔''   (نئی تحریریں، ص:14)

عبدالستار دلوی کی اس وضاحت سے معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ ادیب وشعرا اپنی مختلف خصوصیات اور مختلف ادوار سے تعلق خاطر رکھنے کے باوجود شہر بمبئی اور پورے مہاراشٹر سے کس طرح منسلک ہیں۔ اور ان کی اپنی زندگیوں میں ان مقامات کی کیا اہمیت رہی ہے۔اس پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

اب آیئے مجموعہ میں شامل ان گیارہ مضامین کا علاحدہ علاحدہ جائزہ لیا جائے۔جس سے ادب میں ان کی اہمیت وافادیت کا اندازہ لگایا جاسکے۔

1۔ اقبال اور بمبئی:

عبدالستار دلوی نے اس مضمون میں اقبالؔ کے مختلف اوقات میں قیام بمبئی اور ان کی مختلف علمی وادبی سرگرمیوں کا سیر حاصل جائزہ لیا ہے اس خصوص، میں عطیہ بیگم فیضی اور ایوان رفعت کا بیان دلچسپ اور معلوماتی بھی

ہے۔جس کے مطالعے سے جہاں اقبال کی بمبئ قیام کے دوران کی ہوئی سرگرمیوں کا علم تو ہوتا ہی ہے وہیں اقبال اور عطیہ بیگم فیضی کے جذبات رشتے پر اقبال کے خطوط کے حوالے سے روشنی بھی پڑتی ہے۔اس مخصوص مضمون کے حوالے سے ڈاکٹر خورشید نعمانی یوں رقم طراز ہیں:

''پہلا مضمون،''اقبال اور بمبئ'' ہے اس مضمون میں علامہ اقبال کی بمبئ آمد کا ذکر کیا گیا ہے۔اوران کی مصروفیات وسرگرمیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اقبالؔ اور بمبئ کا ذکر ہواور عطیہ فیضی کا ذکر نہ ہو یہ ممکن نہیں۔اس مضمون کا سب سے دلچسپ حصہ وہی ہے جہاں ان دونوں کا ذکر ہے۔خاص طور سے وہ پرائیویٹ شعر جوکہ انہوں نے عطیہ فیضی کے نام 10 ستمبر 1931ء کولکھا تھا:

عالم جوش جنوں میں ہے روا کیا کیا کچھ
کہیے کیا حکم ہے دیوانہ ہوں یار ہوں

(تبصرہ:''نئی تحریریں''روزنامۂ انقلاب،بمبئ یکم/جنوری 1989ء)

2۔ پریم چند کا قیام بمبئ:

عبدالستار دلوی نے یہ مضمون مکاتیب پریم چند اور پریم چند کے چند احباب کے بیانات کے حوالے سے لکھا ہے۔جن کے توسط سے انہوں نے واضح کر دیا ہے کہ پریم چند فلمی دنیا کو پسند کرتے تھے مگر پھر بھی وہ اپنے مالی مفاد کے پیش نظر بمبئ کی ایک سنیما کمپنی کے ایک سال کے کنٹراکٹ پر بمبئ آئے مگر ایک سال پورا ہونے سے پہلے ہی کمپنی چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر بند ہوگئی۔تو پریم چند کو اپنے وطن لوٹنا پڑا۔جس کے بعد وہ اپنی ادبی سرگرمیوں میں مشغول ہوگئے۔یہ مضمون مختصر ہے پر از معلوماتی ہے اور تحقیقی انداز لیے ہوئے ہے۔اور مضمون کے اختتام پر وہ اظہار افسوس کرتے ہیں کہ اگر کمپنی بند نہ ہوتی۔ان کی اصلاح پسند کہانیوں پر فلمیں بنائی جاتیں تو ہمارے آج کے معاشرے کی صورت حال ہی مختلف ہوتی۔

3۔ مولوی عبدالحق: نفسیاتی مطالعہ:

پیش نظر مجموعے کا تیسرا اور اہم مضمون ''مولوی عبدالحق: نفسیاتی مطالعہ'' ہے۔ دراصل بابائے اردو مولوی عبدالحق پر متعدد کتابیں اور تحقیق وتنقیدی مضامین ضبط تحریر میں آچکے ہیں مگر یہ مضمون مولوی عبدالحق کی مختلف الجہات شخصیت (مورخ، محقق، نقاد، لغت نویس، مترجم اور خاکہ نگار) کا تفصیلی احاطہ کرتا ہے۔ اس مضمون سے متعلق ڈاکٹر محمد علی اثر کے خیالات دیکھیے:

> ''مولوی عبدالحق نفسیاتی مطالعہ'' پروفیسر دلوی کا ایک جامع اور بھرپور مقالہ ہے۔ جس میں بابائے اردو کی شخصیت حیات اور ان کی علمی ادبی اور تحقیقی زندگی کے بعض نئے گوشے پہلی بار سامنے آتے ہیں۔'' (''تحقیقی نقوش'' ص:148)

دراصل ڈاکٹر محمد علی اثر کی ''بعض نئے گوشے'' سے مراد مولوی عبدالحق پر سرسید اور حالؔی کے اثرات ہیں۔ اور ان اثرات کو بابائے اردو کے مضامین، تبصرے، خاکے اور تنقید میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ بہر حال بابائے اردو پر یہ مضمون اہمیت کا حامل ہے۔

4۔ سکندر علی وجدؔ: فنون لطیفہ کا شاعر:

عبدالستار دلوی نے اس مضمون میں سکندر علی وجدؔ کی غزل گوئی ورنظم گوئی کا تفصیلی بیان کیا ہے۔ اور اس میں خاص طور پر ان کی مشہور زمانہ نظمیں اجنتا، ایلورہ، رقاصہ اور تاج محل کا فنی ثقافتی اور مذہبی اعتبار سے تجزیہ کیا ہے۔ واضح رہے کہ وجدؔ ولی اور سراج کے بعد اورنگ آباد کی اردو شاعری کو دین ہیں۔ لیکن وجدؔ جیسے قادرالکلام اور پرگو شاعر پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ ایسے میں یہ مضمون اس کمی کی تلافی کرتا ہے۔

5۔ شاہ تراب چشتی: نظیر اکبرآبادی کا پیش رو:

شاہ تراب چشتی ایک صوفی بزرگ وشاعر ہیں جب کہ نظیؔر اکبرآبادی کا شمار عوامی شعرا میں ہوتا ہے۔

دونوں کے زمانۂ شاعری مختلف ہیں۔مگر عبدالستار دلوی نے ان دونوں شعراء کا تحقیق،تنقیدی اور تقابلی تجزیہ کیا ہے اور نتیجہ اخذ کیا ہے کہ نظیر کی عوامی شاعری کے پیش رو شاہ تراب چشتی ہیں۔یا باالفاظ دیگر شاہ تراب چشتی کی شعری روایات کی توسیعی نظیر اکبرآبادی کی شاعری ہے۔اس مضمون کے ذیل میں ڈاکٹر محمد علی آثر یوں اپنی رائے دیتے ہیں:

> ''تحقیقی نقطۂ نظر سے ''نئی تحریریں'' کا سب سے اہم مقالہ ''شاہ تراب چشتی:نظیر اکبرآبادی کا پیش رو'' ہے۔شاہ تراب چشتی اور نظیر اکبرآبادی دونوں اردو کے بڑے نظم نگار اور صاحب دیوان شاعر تھے۔ دونوں کے بیان مضامین وموضوعات اور انداز بیان میں مماثلت اور اشتراک کے حیرت انگیز نمونے ملتے ہیں۔ڈاکٹر دلوی نے تراب اور نظیر کے کلام کا تنقیدی اور تقابلی جائزہ لیتے ہوئے دونوں کے مزاج وکردار،ان کی وسیع المشربی،انسان دوستی اور بھائی چارگی کے جذبات کی ترجمانی کو ان کے کلام کا نمایاں وصف قرار دیا ہے۔''

(''تحقیقی نقوش''ص:150)

ڈاکٹر محمد علی آثر کی اس تفصیلی رائے سے اس مذکورہ مضمون کی اہمیت اور افادیت دونوں کا پتہ چلتا ہے۔

6۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی۔علمی زندگی کے تین دور:

پروفیسر نجیب اشرف ندوی کا تعلق دبستان شبلی سے ہے اور وہ تلامذہ شبلی میں آخری فرد تھے۔آپ اپنی علمی وادبی زندگی میں مختلف مقامات پر مختلف حیثیتوں سے خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔اور عبدالستار دلوی نے اپنے اس مضمون میں آپ کی علمی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔جو اس طرح ہیں:

1۔ 1921 تا 1930 تک دارالمصنفین میں قیام کا دور

2۔ 1931 تا 1955 تک اسماعیل یوسف کالج کی پروفیسری کا دور

3۔ 1955 تا 1968 تک انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی ڈائرکٹری کا دور

دراصل عبدالستار دلوی نے آپ کی علمی زندگی کو ان تین ادوار میں تقسیم کر کے ان ادوار میں آپ کی علمی فتوحات کا سیر حاصل جائزہ لیا ہے۔

7۔ ندوی صاحب: شخصیت اور کردار:

عبدالستار دلوی پروفیسر نجیب اشرف ندوی کے شاگرد خاص ہیں۔ انہوں نے پروفیسر ندوی کی شاگردی وصحبت میں ایک طویل عرصہ گزارا ہے۔ جس میں اسماعیل یوسف کالج کی پروفیسری اور انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی ڈائرکٹری، دونوں دور شامل ہیں۔ اور اس طویل عرصے میں عبدالستار دلوی اپنے استاد محترم کی شخصیت اور کردار سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اور یہی اثر و تاثر آپ کے اس مضمون کا محرک بنا۔ اس مضمون میں آپ نے اپنے استاد کی مختلف الجہات شخصیت، ان کے کردار، ان کی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی وغیرہ وغیرہ پہلوؤں کو نہایت لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔ یہ مضمون تحقیقی وتنقیدی مضمون بھی ہے اور خاکہ نگاری کی عمدہ مثال بھی ہے۔ غرض کہ آپ کا پیش نظر مضمون پروفیسر نجیب اشرف ندوی پر ایک حوالہ جاتی مضمون ہے۔

8۔ وشنو سکھا رام کھانڈیکر:

وشنو سکھا رام کھانڈیکر، مراٹھی ادب کا ایک معتبر نام ہے۔ انہوں نے مراٹھی میں ناول، افسانہ، انشائیے اور تنقید پر مشتمل متعدد کتابیں قلم بند کی ہیں۔ آپ کی انہی خدمات کے چلتے حکومت ہند نے آپ کو گیان پیٹھ ایوارڈ سے بھی نوازا ہے۔ عبدالستادلوی نے آپ کے ان کثیر الجہات ادبی کارناموں سے متاثر ہو کر آپ پر زیر نظر مضمون سپرد قلم کیا ہے جس سے جہاں اردو دنیا وشنو سکھا رام کھانڈیکر جیسے مراٹھی، کے مایہ ناز ادیب سے متعارف ہوئی ہے وہیں عبدالستار دلوی کی بہ حیثیت محقق ونقاد مصروفیت بھی عیاں ہوتی ہے۔ اور تو اور یہ مضمون آپ کی مراٹھی زبان وادب سے دلچسپی اور قدرت کا ثبوت بھی ہے۔

9۔ ہندوستان کا لسانی مسئلہ اور گاندھی جی اور اردو کا ہندوستانی رجحان:

عبدالستار دلوی کا شمار اردو کے کمیاب ماہر لسانیات میں ہوتا ہے۔ لسانیات میں زبانوں کے آپسی رشتے اوران کی تاریخ آپ کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ دونوں مضامین ہیں جن میں سے اول الذکر میں آپ نے اردو کے تاریخی پس منظر میں اردو اور ہندی کے جھگڑے پر تفصیلی بحث کی ہے اوراس سلسلے میں گاندھی جی اوران کے لسانی نظریے ''ہندوستانی'' کا بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اگر گاندھی جی کے نظریے ''ہندوستانی'' کو قبول کرلیا جاتا تو اردو ہندی کا جھگڑا ہی ختم ہو جاتا اور آپ کا موخرالذکر مضمون ''اردو کا ہندوستانی رجحان'' ہے۔ جس میں آپ نے اردو کو تین ادوار میں تقسیم کر کے بتایا ہے کہ اردو کے ہر دور میں اس میں ہندوستانی عناصر شامل رہے ہیں اور آپ نے اس کو اردو تصانیف سے مثالیں دیتے ہوئے سمجھایا ہے۔ دراصل یہ مضمون ان حضرات کے لیے جواب ہے جو اردو کو غیر ملکی اور بالخصوص مسلمانوں کی زبان سمجھتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں انہیں یہ بھی غلط فہمی ہے کہ دکنی دراصل جدید ہندی کی بولی ہے نہ کہ اردو کی۔ مگر عبدالستار دلوی نے ان فکر وبصیرت انگیز مضامین سے ثابت کر دیا ہے کہ اردو ایک ہندوستانی زبان ہے۔ اس کا خمیر ہندوستانی تہذیب و معاشرت سے اٹھا اوراس کی نشو ونما میں سبھی نے اپنا اپنا رول ادا کیا۔ بلکہ مسلمان و ہندو کی تفریق کے اپنی انہی خصوصیات کی بنا پر یہ مضامین حوالہ جاتی حیثیت رکھتے ہیں۔

11۔ شبلی مکتوب نگار کی حیثیت سے:

''شبلی مکتوب نگاری کی حیثیت سے'' نئی تحریریں کا آخری مضمون ہے۔ جس میں عبدالستار دلوی نے خطوط شبلی سے انتخاب کر کے جہاں شبلی کو بہ حیثیت مکتوب نگار بتاتے ہوئے اردو خطوط نگاری میں غالب کے بعد شبلی کو دوسرا مقام دیا ہے۔ وہیں ان خطوط سے شبلی کے زہرہ بیگم فیض اور عطیہ بیگم فیضی سے تعلقات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ س کے علاوہ یہ مضمون شبلی کے بمبئی سے رشتے کو بھی بیان کرتا ہے۔ لہٰذا ''شبلی مکتوب نگار کی حیثیت سے'' نہ صرف

اس مجموعہ مضامین کا بلکہ عبدالستار دلوی کے اہم مضامین میں سے ایک ہے۔

ان میں جملہ گیارہ مضامین کو عبدالستار دلوی نے مختلف وقات میں اور مختلف وجوہات کی بنا پر ضبط تحریر میں لایا تھا۔ بقول عبدالستار دلوی یہ مضامین مجموعہ کی ترتیب واشاعت سے قبل پچیس سال کے عرصے پر محیط ہے۔ لیکن انہوں نے مجموعہ مضامین کے انتخاب وترتیب میں جو مخصوص انداز اختیار کیا ہے اس سے یہی لگتا ہے کہ مصنف نے باقاعدہ منصوبے کے تحت مہاراشٹر اور بالخصوص شہر بمبئی سے ادبی رشتہ رکھنے والی اور بمبئی کی علمی وادبی فضا کو منور کرنے والی شخصیات کا انتخاب کیا ہے۔ آپ کے اس حسنِ انتخاب سے متعلق ڈاکٹر محمد علی اثر یوں لکھتے ہیں:

> ''مہاراشٹر اور بمبئی کی علمی وادبی فضاؤں اور مقامی شخصیات سے متعلق ان مقالات ومضامین میں پروفیسر دلوی نے اپنی ژرف نگاہی اور تحقیقی بصیرت کا ثبوت دیتے ہوئے تمام منتشر اور بکھرے ہوئے مواد کو بڑی مہارت اور چابکدستی سے یکجا کر دیا ہے۔ مختلف شخصیتوں کے متنوع پہلوؤں پر لکھی گئی ان تحریروں کو دلوی صاحب نے اس خوب صورتی کے ساتھ ایک گلدستہ کے روپ میں پیش کیا ہے کہ اس کتاب کو ایک مستقل تصنیف کی حیثیت دی جا سکتی ہے۔''

(''تحقیقی نقوش''ص:145)

بہر حال یہ مجموعہ انتخاب مضامین آپ کے حسن انتخاب اور گہری تنقیدی وتحقیقی بصیرت کی دلکش مثال ہے۔ اور اس کی تصدیق ڈاکٹر محمد علی آثر کے متذکرہ بالا اقتباس سے بھی ہو جاتی ہے۔

عبدالستار دلوی کم گویائی اور نرم ونازک لب ولہجے کی عادات وصفات رکھتے ہیں۔ اور یہی عناصر آپ کی تحریروں میں بھی ملتے ہیں۔ جیسے آپ کے ان پیش نظر مضامین کا لب ولہجہ بھی نرم ونازک ہے۔ زبان سادہ، سلیس اور رواں ہے۔ اور آپ کی تحقیق وتنقید غیر جانب دار ہے۔ جس کی مثال آپ کا مضمون ''ندوی صاحب شخصیت وکردار'' ہے۔ یوں کہ پروفیسر ندوی آپ کے استاد محترم رہے ہیں۔ آگر آپ چاہتے تو جانب داری اپنا کر ان کی

صرف خوبیاں ہی بیان کرتے لیکن آپ نے بعض جگہوں پر ان کی کچھ خامیاں بھی گنوائی ہیں۔اسی لیے اس مضمون کو مضمون کے ساتھ ساتھ شخصی خاکہ بھی کہا جاسکتا ہے۔غرض آپ کے مضامین اپنی گہری تحقیقی وتنقیدی بصیرت اور کثرت مطالعہ کی وجہ سے حوالہ جاتی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔

4.2.2۔ پونے کے مسلمان (تاریخی،تہذیبی اور ادبی مطالعہ):

''پونے کے مسلمان'' عبدالستار دلوی کی سالوں سال کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے۔حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ پونے سے 2001 میں شائع ہوکر پذیرائی حاصل کر چکی ہے۔واضح رہے کہ ''پونے کے مسلمان'' پونے اور اس کے گردونواح میں مسلمانوں کی تاریخی،تہذیبی اور ادبی تاریخ ہے۔دراصل اس طرز کی علاقائی تاریخیں تصنیف وتالیف کرنے کا رواج اردو ادب میں تقریباً ابتدا ہی سے رائج ہیں۔مگر اس طرز کی تصانیف کی تعداد مختصر ہے۔جیسے گزشتہ لکھنو از عبدالحلیم شرر،تاریخ فرخ آباد،تاریخ گولکنڈہ از عبدالمجید صدیقی اور مقدمہ تاریخ دکن از عبدالمجید صدیقی وغیرہ وغیرہ۔

عبدالستادلوی نے اپنی اس ادبی وتاریخی تصنیف کو''مولوی سر رفیع الدین احمد مرحوم اور خان بہادر محمد ہدایت اللہ مرحوم کے نام معنون کیا ہے۔کیوں کہ ان دونوں معلمین پونے جیسے تقریباً نئے شہر میں نہ صرف اردو ذریعہ تعلیم کو رواج دیا بلکہ اس کے لیے ادبی فضا وساز گار ماحول بھی پیدا کیا ہے۔

پیش نظر تصنیف ''پونے کے مسلمان'' نو ابواب پر مشتمل ہے۔جس کے پہلے باب کا عنوان ''پونے کا تاریخی پس منظر اور مسلمان'' ہے۔جس میں مصنف نے دکن کے قدیم اردو مراکز کا تذکرہ کرتے ہوئے اٹھارہویں صدی میں پونے کی ترقی، پونے مرہٹوں کا فوجی مرکز،انگریزوں کے زیر تسلط پونے کی ترقی اور تعلیمی اداروں کے قیام ومعیار پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔

''پونے کے مسلمان'' کا دوسرا باب ''پونے کی ممتاز شخصیتیں'' ہے۔جس کے ذیل میں سیٹھ حاجی غلام محمد اعظم،مولوی سر رفیع الدین احمد،خان بہادر محمد ہدایت اللہ، پروفیسر،شیخ عبدالقادر سرفراز،سر ابراہیم ہارون جعفر،احمد

ابراہیم، ہارون جعفر، خان صاحب عبدالقدیر خان، موید ینا محمد ہاشم حاجی دوست محمد پیر محمد، محمد علی دوست محمد، مسز قمر النساء محمد علی، نواب میر احمد علی خان آف ادا، مرزا یوسف بیگ، بیگم حلیم النساء، زبیدہ خاتون، سردار محمد بیگم کی جیسی علم نواز اور علم دوست شخصیات کی حیات اور کارناموں کا تفصیلی احاطہ کیا ہے۔

کتاب ہذا کا تیسرا باب ''پونے میں اردو تعلیم'' کی سرخی کے تحت ہے۔ اس باب میں فاضل مصنف نے بتایا ہے کہ پونے کے چند افسران یہ ماننے کو تیار نہیں تھے کہ پونے اور اس کے قریب وجوار میں آباد مسلمانوں کی مادری زبان اردو ہے۔ مگر اس سلسلے میں پونے کی ممتاز علم دوست شخصیات و مسلم رہنماؤں نے اپنی کاوشوں سے ان افسران کو ماننے پر مجبور کر دیا۔ جس کے بعد 1920ء میں پونے میں پہلا اردو ذریعہ تعلیم اسکول ''اینگلو اردو بوائز ہائی اسکول'' قائم ہوا اور اسی کی تقلید میں اسلامیہ اردو اسکول، مولید ینا اینگلو اردو ہائی اسکول اور بدرجہ ہائی اسکول قائم ہوئے۔ عبدالستار دلوی نے اس مختصر باب میں پونے میں اردو ذریعہ تعلیم اسکولس کے اس وقت کے ماضی اور حال کے متعلق مختلف اسکولوں کے حوالے سے روشنی ڈالی ہے۔

''پونے کے مسلمان'' کا چوتھا باب ''پونے کی مسجدیں اور درگاہیں'' کے عنوان سے ہے۔ جس میں بقول عبدالستار دلوی کم و بیش 37 مساجد ہیں جن میں سے کچھ کے نام یہ ہیں: ''آئینہ مسجد، خاکسار مسجد، روشن مسجد، بکر قصاب مسجد، ٹانڈے مسجد، انشیوں کی مسجد، قمر الدین حضرت مسجد، عثمانیہ مسجد، باب اللہ شاہ مسجد، گاؤ قصاب کی مسجد، نیا مودی خانہ مسجد، شولا پور مسجد، ٹلیکٹے مسجد، باغبانوں کی مسجد، شیخ ملا مسجد، کاغذ پورہ مسجد، گر پیر مسجد، امانش مسجد، چاند تارا مسجد، پنشن والوں کی مسجد، ناگیش پیٹھ مسجد، تنبوی مسجد، دارو والا پل مسجد، جمعہ مسجد، مدار چھلا مسجد، ابان پیر مسجد، بڑے ملا مسجد، بارا امام مسجد، طیبہ مسجد، عبدالوہاب مسجد، شاہی مسجد اور جماعت مسجد وغیرہ وغیرہ۔ اس باب میں پونے کی مسجدوں کے بعد، پونے کے درگاہوں کا رخ کیا گیا ہے۔ اور بقول عبدالستار دلوی پونے شہر میں 326 درگاہیں ہیں۔ جن میں سے چند اہم درگاہیں اس طرح ہیں: حضرت شیخ صلاح الدین غازی چشتی معروف بہ شیخ صلاؒ، حضرت سید اکبر صاحب سرخ ابدالؒ، حضرت سید حسام الدین قتال جنجانی سید السادات، ابراہیم عرف انگڑ

شاہ، یٰسین جھک مسان، بان جانؒ، حضرت احمد شاہ محمد شاہ قادری شطاری معروف بہ جنگلی پیرؒ، عبدالستار دلوی، نے اس مذکورہ باب میں ان مسجدوں اور درگاہوں کی نشاندہی کے علاوہ انکے پس منظر، ان کی اہمیت، ان کے سلسلے اور ان کی موجودہ صورت حال سے متعلق معلومات درج کی ہیں۔

پیش نظر کتاب کا پانچواں باب ''پونے کی انجمنیں'' ہے۔ جس کے تحت شہر پونے کی مسلم اسٹوڈینس یونین، پونے کی مختصر تاریخ اور اہمیت بیان کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اینگلواردو اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، نیو پروگریسیو ایجوکیشن سوسائٹی پونا اور بزم خواتین جیسی انجمنوں پر بھی مختصر روشنی ڈالی گئی ہے۔

''پونے کے مسلمان کا چھٹا باب ''پونے میں اردو'' ہے جس میں مصنف نے تمہید کے بعد ''تعلیمی زندگی اور پونا، فلم نگر، جوش اور پونا، پروفیسر عبدالقادر سرفراز، پروفیسر عبدالقادر فراز اور شبلی، پونے میں اردو شعر و ادب کی موجودہ صورت حال، اور اعظم کیمپس کی تعلیمی تحریک جیسے ذیلی عنوانات کے تحت پونہ میں اردو کی نشوونما اور فروغ کو بیان کیا ہے۔

کتاب ہذا کا ساتواں باب ''جوش ملیح آبادی پونے میں کی سرخی کے ساتھ ہے۔ اس باب میں فاضل مصنف نے جوشؔ کے ساغر نظامی کے ساتھ شالیمار پکچرز سے منسلک ہونے، وہاں سے جوشؔ کے بمبئی ترقی پسند جلسوں میں شریک ہونے، جوشؔ کی سجاد ظہیر، رضیہ سجاد ظہیر اور مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقاتیں اور جوشؔ کے بیٹے سجاد حیدر خان کی فقیہ خاندان میں شادی سے متعلق دلچسپ انداز اختیار کیا ہے۔

''پونے کے مسلمان'' کا آٹھواں باب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ جس کے پہلے حصے میں جسٹس سر عبدالرحیم کا خطبہ صدات بمقام محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ پونا 1915ء دیا گیا ہے۔ جب کہ دوسرے حصے میں سر ابراہیم ہارون جعفر کا خطبہ صدارت بمقام محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، منعقدہ امراوتی 1920ء دیا گیا ہے۔ یہ دونوں مقررین پونے کی ممتاز شخصیات ہیں جس کی وجہ سے یہ خطبات اس کتب میں شامل ہونے کا جواز پیدا کرتے ہیں۔

پیش نظر کتاب کا نواں اور آخری باب ''خطوط شبلیؒ بنام بہادر پروفیسر القادر سرفراز'' ہے۔اس باب میں شبلی کے خان بہادر پروفیسر عبدالقادر سرفراز کے نام لکھے گئے تیس (30) خطوط دیے گئے ہیں، جو جنوری 1908ء سے مارچ 1914ء کے درمیانی وقفے میں لکھے گئے ہیں۔جن کا ماخذ ''مکاتیب شبلی'' مرتبہ پروفیسر سید سلیمان ندوی ہے۔جن سے شبلی اور خان بہادر پروفیسر عبدالقادر سرفراز کے دیرینہ دوستانہ تعلقات کا پتہ چلتا ہے۔لہٰذا پروفیسر عبدالقادر سرفراز کا تعلق پونے سے ہونے کی وجہ سے یہ خطوط اس کتاب کا حصہ ہیں۔

''پونے کے مسلمان'' ایک تاریخی، تہذیبی اور ادبی مطالعہ ہے جس کی وضاحت اس کے تاریخی تہذیبی اور ادبی نوعیت کے ابواب سے بھی ہو جاتی ہے۔ دراصل یہ کتاب شہر پونے کے مسلمانوں، مسلمان معلمین اور اردو سے متعلق وہ اسد جانی حیثیت رکھتی ہے اور منور پیر بھائی (چیرمن حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ) اپنے عرضِ ناشر میں مصنف عبدالستار دلوی اور کتاب ہذا کی اہمیت بتاتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''پونے کے مسلمان'' ڈاکٹر دلوی کے تحقیق جنوں اور زورِ قلم کا ایک شاہکار ہے۔ جو ادب میں محض اضافہ ہی نہیں اہل ل پونہ پر ان کا ایک مستقل احسان بھی ہے۔ یہ کتاب پونے کے ڈھائی سو سالہ علمی، ادبی تہذیبی اور ثقافتی تاریخ کا احاطہ کرتی ہے۔اس میں ان اکابرین پونہ پر تاریخی دلائل کی روشنی میں مفصل معلومات ہیں جو آج تک خود اہل پونہ سے پوشیدہ اور مخفی رہیں۔اس کتاب کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شہر خوبان پونہ جو آج بھی تعلیمی مرکز کے طور پر جانا جاتا ہے، ماضی قریب و بعید میں کیسی کیسی علم دوست اور علمنواز شخصیتوں کا گہوارہ رہا ہے۔ ان کے قائم کردہ ادارے آج بھی مسلمان طلبہ کے لیے تعلیمی پناہ گاہیں ہیں۔ وہ محض ذہن ساز نہیں بلکہ زمانہ ساز لوگ تھے اور یہ کتاب انہی روشن میناروں کی خدمت میں ادنیٰ خراجِ عقیدت ہے۔''

منور پیر بھائی نے اس اقتباس میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ان سے اتفاق کرنا پڑتا ہے۔کیوں کہ

''پونے کے مسلمان'' پونے کے مسلمانوں کی ڈھائی سوسالہ تاریخ ہے۔ جس سے خود اہل پونہ ناواقف تھے۔ لہٰذا عبدالستار دلوی نے اپنے مقدمے میں تاریخ، تاریخ سازی اور پونے کے مسلمانوں کی تاریخ پر یوں وضاحت کرتے ہیں:

> ''اس کتاب کا خاکہ اولاً ایک مجموعہ مضامین سے زیادہ نہ تھا، مگر مطالعہ کے دوران یہ احساس شدت سے جاگا کہ مختلف شہروں میں اور بالخصوص بمبئی اور پونے میں مسلمانوں کی تاریخ پر باقاعدہ تحقیقی کام نہیں ہوا ہے اور ہم اپنے اسلاف کے کارناموں سے ہنوز ناواقف ہیں۔ اپنے بزرگوں کی خدمات کو فراموش کرنا ایک ایسا جرم ہے کہ جسے تاریخ بھی معاف نہیں کرسکتی۔ اگر کوئی قدم اس طرح کی تاریخی مواد سے محروم ہے تو وہ یہی بیچارے مسلمان ہیں۔ جو دنیا کی تاریخ میں اپنی تاریخ سازی کے لیے شہرت رکھتے ہیں جس نے تاریخ بنائی ہے اور تاریخ لکھنے کا فن دنیا کو سکھایا ہے۔ اس احساس جرم کے تحت میں نے اپنے کام کی نیوز رکھی اور جو بھی مطالعہ میں کرسکا اور جتنا یکجا کرنے میں کامیاب رہا۔ ایسے مجموعہ مضامین کی بجائے ایک مستقل کتاب کی صورت عطا کرنے کی کوشش کی ہے۔''

(''پونے کے مسلمان''، ص:6)

بقول عبدلستار دلوی اپنے اسلاف کے کارناموں کو فراموش کرنے والی قوموں کو تاریخ کبھی معاف نہیں کرتی۔ دراصل اسی احساسِ جرم کے تحت عبدالستار دلوی نے سالوں کی محنت و ریاضت اور تحقیق و تنقید کے بعد ''پونے کے مسلمان'' جیسی شاہکار تصنیف مسلمانوں بالخصوص اردو ادب کو دی۔ جو اہل پونہ کے ساتھ ساتھ تمام اردو والوں پر آپ کا ایک احسان ہے۔ جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اور چوں کہ یہ پونے کے مسلمانوں کی تہذیبی تاریخ بھی ہے اور تہذیبی تاریخ کی اہمیت موجودہ دور میں مسلم ہے ہی مگر مستقل کی نسلوں کے لیے ہماری تہذیبی وراثت بھی ہے۔

4.2.3۔ پونے اور ممبئ میں فارسی کے ممتاز محقق

خان بہادر پروفیسر شیخ عبدالقادر سرفراز (احوال اور آثار):

خان بہادر پروفیسر شیخ عبدالقادر سرفراز کا شمار فارسی کے جدید عالموں میں ہوتا ہے۔جنہوں نے نہ صرف اپنے تلامذے کو علمی وادبی صلاحیتیں بخشی بلکہ اپنے معاصرین کو بھی اپنی فارسی عربی، اردو اور مغربی زبانوں کی غیر معمولی دسترس سے مستفیذ ہونے کا موقع دیا۔اور ان معاصرین میں بطور خاص علامہ شبلی نعمانی کو دیگر معاصرین پر امتیاز حاصل ہے۔

علامہ شبلی نعمانی بہ حیثیت مورخ، محقق، نقاد اور ادیب اردو ادب میں ایک مخصوص مقام رکھتے ہیں۔مگر ان کے علمی رفقوں میں چند ممتاز شخصیات ایسی بھی ہیں جو اپنے علم وفضل کے باوجود آج بھی پردۂ خفا میں ہیں۔لیکن کبھی کبھی ہمارے دقت پسند، ذی علم اور غیر جانب دار محققین ایسی شخصیات کو تلاش کر کے دنیا بالخصوص اردو دنیا سے متعارف کرانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔اور ایسے ہی محققین میں عبدالستار دلوی کا شمار ہوتا ہے۔جنہوں نے علامہ شبلی نعمانی کے علمی رفیق، عطیہ دہندہ اور غم خوار ''پروفیسر عبدالقادر سرفراز'' کو گمنامی کے اندھیروں سے نکال کر ادب میں محفوظ کر دیا ہے۔

دراصل 1908ء میں علامہ شبلی کی پروفیسر عبدالقادر سرفراز سے ملاقات بمبئ میں ہوئی اور تاریخ سے دلچسپی دونوں میں قدرے مشترک تھی جس کی بنا پر میلوں کے فاصلے کے باوجود دوستانہ مراسم پیدا ہوئے۔اور اس دوران شبلی ''شعر العجم'' کی تکمیل میں مصروف تھے اس سلسلے میں شبلی کو جب بھی مشرقی نادر کتب یا ان کے مغربی تراقیم مطلوب ہوتے تو پروفیسر عبدالقادر سرفراز انھیں حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتے کیوں کہ پروفیسر عبدلقادر سرفراز جہاں مختلف مشرقی ومغربی زبانوں کے ماہر تھے وہیں مطالعہ کے شوقین بھی تھے۔ایسے میں پروفیسر عبدلقادر سرفراز بھی بلا تامل علامہ شبلی کی مدد فرماتے تھے۔مگر افسوس کہ ہمارے ادیبوں، محققوں اور نقادوں نے پروفیسر عبدالقادر

سرفراز کی شخصیت کو قابل اعتنا نہیں سمجھا۔سوائے شبلی کے شاگرد خاص سید سلیمان ندوی کے۔ جنھوں نے ''یاد رفتگاں'' میں اور ''مکاتیب شبلی'' میں ان کا مختصر سا تعارف تحریر کیا ہے لیکن عبدالستار دلوی نے برسوں کی محنت اور تلاش وجستجو کے بعد پروفیسر عبدالقادر سرفراز پر یہ پیش نظر کتاب (مونوگراف) قلم بند کیا ہے جیسے انہوں نے تین مختلف حصوں میں منقسم کیا ہے۔ جہاں پہلے حصے میں ان کی حیات مختلف شخصیات سے ان کے تعلقات، ملازمت اور ڈاکٹر عبدالحق (جانشین سرفراز) وغیرہ وغیرہ موضوعات پر تفصیلی گفتگو کی ہے جب کہ دوسرے حصے میں پروفیسر عبدالقادر سرفراز کے منتخب مضامین شاملِ کتاب ہیں۔ اور تیسرے حصے میں شبلی کے خطوط بنام پروفیسر عبدلقادر سرفراز دیے گئے ہیں۔

حصہ اول: حیات

1۔ پروفیسر شیخ عبدالقادر سرفراز:

پیش نظر کتاب کا پہلا حصہ ''حیات'' کے عنوان سے جس کی پہلی ذیلی سرخی ''پروفیسر شیخ عبدالقادر سرفراز ہے جس میں ان کا مختصر تعارف، والدین، پیدائش، تعلیم اور ملازمت تبادلے، پروفیسر مرزا اسماعیل حیرت اور پروفیسر قاسم تھاریانی سے ملاقاتیں اور استفادے جیسے عنوانات کا احاطہ کیا ہے۔

2۔ پروفیسر عبدالقادر سرفراز اور شبلی:

قابل مصنف نے پروفیسر شیخ عبدالقادر سرفراز اور شبلی کے علمی اور ذاتی دوستانہ مراسم کو خطوطِ شبلی بنام پروفیسر عبدالقادر سرفراز کے پس منظر میں بیان کیا ہے۔ یہ علمی امداد شبلی نے اپنی مختلف کتابوں جیسے شعرالعجم اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر وغیرہ وغیرہ کے لیے عربی، فارسی اور تاریخ کی نادرونایاب کتب اور جرمن وفرانس زبانوں میں ان کے تراجم وتبصروں کو حاصل کرنے سے متعلق ہے۔ اس کو شبلی نے اپنے خطوط میں بھی لکھا ہے کہ سید سلیمان ندوی کو دکن کالج کی اسسٹنٹ پروفیسری خود ان کی قابلیت کی بنا پر نہیں بلکہ پروفیسر شیخ عبدالقادر سرفراز کی سفارش

سے ملی ہے۔

3۔ پروفیسر عبدالقادر سرفراز اور مولانا سید سلیمان ندوی:

عبدالستار دلوی نے اس ذیلی عنوان کے تحت مولانا سید سلیمان ندوی کو دکن کالج کی اسسٹنٹ پروفیسری ملتے ہی وہ بھی پروفیسر شیخ عبدالقادر سرفراز کے زیر اثر اور ان کے پونے سے متعلق لکھا ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ قیام پونے کے دوران مولانا سید سلیمان ندوی سے پروفیسر عبدالقادر سرفراز کے تعاون، ارض القرآن اور سیرت عائشہؓ کی تصنیف و تالیف میں علمی رفاقت شامل تھی جس کا ذکر مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے خطوط بنام مولوی سید عبدالحکیم دسنوی میں بار ہا کہا ہے۔ اور اس کے علاوہ پروفیسر شیخ عبدلقادر سرفراز کے علمی تبحر، قابلیت، اثر ورسوخ اور مختلف کمیٹیوں سے منسلک ہو کر علمی و ادبی سرگرمیاں انجام دینے کی تفصیل ملتی ہے۔

4۔ مولانا عبدالباری ندوی اور شیخ عبدالقادر:

عبدالستار دلوی اس ذیل میں لکھتے ہیں شبلی کے انتقال کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی دارالمصنفین ،اعظم گڑھ لوٹ گئے تو انہوں نے اپنی جگہ مولانا عبدالباری ندوی کی سفارش کی اور چوں کہ پروفیسر عبدالقادر سرفراز صدر شعبہ فارسی تھے انہوں نے اپنے اثر ورسوخ کے چلتے مولانا عبدالباری ندوی کا تقرر عمل میں لایا اور ان کے ساتھ بھی وہی حسن سلوک اور تعاون رواں رکھا جو سید سلیمان ندوی کے ساتھ تھا۔

5۔ دارالمصنفین اور پروفیسر شیخ عبدالقادر:

1914ء میں شبلی کے انتقال کے بعد سلیمان ندوی نے 1915ء میں دارالمصنفین کا قیام عمل میں لایا تو انہوں نے اس سلسلے میں مشاہیر علم و ادب سے خط و کتابت کی جس میں دیگر علم دوست علم نواز اور ذی علم شخصیات کے ساتھ ساتھ پروفیسر شیخ عبدالقادر کو بھی شامل کیا ہے اور جب دارالمصنفین کی کمیٹی بنائی گئی تب بھی ان ممبران میں پروفیسر عبدلقادر سرفراز کو منتخب کیا گیا ہے۔ جس سے پروفیسر عبدالقادر سرفراز کی علمی لیاقت کا اندازہ ہوتا ہے۔

6۔ تعلیم اور ملازمت:

اس عنوان کے تحت پروفیسر عبدالقادر سرفراز کی تعلیم اور تین مختلف کالجوں میں تدریسی خدمات کو بیان کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ سبکدوش، علالت اور رحلت کا بھی مختصر طور پر احاطہ کیا گیا ہے۔

7۔ پروفیسر شیخ عبدالقادر سرفراز کے شاگرد:

عبدالستار دلوی نے پروفیسر شیخ عبدالقادر سرفراز کو ذہن ساز اور ہزاروں شاگردوں کے استاد بتاتے ہوئے ان کے چند شاگردوں کا ذکر کیا ہے جو یہ ہیں۔مولوی محمد یونس ہینڈادے، عبدالقادر جمال الدین بانگی، خان عبدالمجید خان، مولوی سراج الدین، شیخ یوسف عبداللہ، عبدالقدیر خان، شیخ عبدالوہاب محی الدین ہلیانی، سید عبدالرؤف، حسین الہمدانی، ڈی۔ایل مارشل اور شیخ شاندوغیرہ وغیرہ۔ان شاگردوں نے اپنی قابلیت سے اعلیٰ سرکاری وغیر سرکاری عہدے حاصل کیے اور اپنے استاد کا نام روشن کیا۔

8۔ پروفیسر شیخ عبدالقادر سرفراز کی علمی خدمات:

عبدالستار دلوی نے پروفیسر عبدالقادر سرفراز کو سراپا علم قرار دیا ہے۔اوران کی فارسی، اردو، عربی، اسلامی تاریخ، سماجی علوم اور مختلف مغربی زبانوں کی دسترس کو غیر معمولی بتایا ہے۔اور وہ ان کے علمی وتحقیقی مقالات جیسے ''یائی مجہول'' شاہنامہ کے دواشعار'' مولانا جامی کے خط کی عکسی تصویر اور بزم تاریخ ہند کا تعارف کرایا ہے۔اس کے علاوہ پروفیسر عبدالقادر سرفراز کی مختصر تصنیف ''مرزا حیرتؔ'' سے متعلق ہے۔مگر ان کا زندہ جاوید کارنامہ بمبئ یونی ورسٹی کی لائبریری میں محفوظ اردو، عربی اور فارسی کے مخطوطات کی توضیحی فہرست ہے۔ جیسے بمبئ یونی ورسٹی سے 1935ء میں شائع بھی کیا ہے۔ یہ فہرست بزبانِ انگریزی میں ہے جس کا عنوان یہ ہے:

''A Descriptive Catalouge of the Arabic, Persian and Urdu Manuscripts in the library of the University of Mumbai.''

9۔ڈاکٹر عبدالحق جانشین سرفراز:

پروفیسر عبدالقادر سرفراز کے تین صاحب زادے تھے۔جن میں ڈاکٹر عبدالحق سرفراز سب سے بڑے اور حقیقی جانشین تھے۔کیوں کہ وہ اپنے والد کی طرح عربی، فارسی اردو اور مذہبیات پر دسترس رکھتے تھے۔اورانہوں نے اپنے والد ہی کی سرپرستی میں مشہور فارسی شاعر ''انوری'' پر مقالہ لکھ کر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری لی تھی اور اپنی وفات تک درس وتدریس دیتے رہے۔ان کی تصانیف فارسی اردو اور انگریزی زبانوں میں ہے۔اس کے علاوہ تصوف اور مذہب ان کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔جس کا نتیجہ ان کی یادگار تصنیف ''حضرت خواجہ بندہ نواز، گیسو دراز صدرالدین ابوالفتح سید محمد حسینی'' ہے، جو دراصل ان کی تقاریر کا مجموعہ ہے۔

ڈاکٹر عبدالحق ایک خوش گوشاعر بھی تھے۔جس کی مثال ان کی طویل نظم ''جذبہ حرم'' ہے جو 1937ء میں دوران طالب علم یہ مقام مکہ معظّمہ میں تخلیق کی گئی ہے۔اور اکتیس حصوں پر مشتمل یہ نظم اس کتاب کا حصہ ہے۔اس نظم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر عبدالحق اقبال سے متاثر ہیں۔اور اقبال کا کثرت سے مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔

ان نو ذیلی عنوانات پر پہلا حصہ ''حیات'' اختتام پاتا ہے۔اور دوسرے حصے میں پروفیسر عبدالقادر سرفراز کے چار تحقیقی مضامین ''یای مجہول'' ''شاہ نامہ کے دو اشعار'' ''مولانا جامی کے خط کی عکسی تصویر'' ''بزم تاریخ ہند'' شامل کتاب ہیں۔علاوہ بریں ضمیمہ کے طور پر فارسی مضمون ''یای معروف ومجہول'' از سید ناناظر الحسن ہوش بلگرامی بھی کتاب کا حصہ ہیں۔

کتاب ہذا کے تیسرے حصے میں شبلی کے خطوط بنام پروفیسر عبدالقادر سرفراز کو شامل رکھا گیا ہے۔ان خطوط کی تعداد تیس ہے۔جو بقول عبدالستار دلوی اس مخصوص حصے کا نہیں بلکہ پوری کتاب کا ماخذ ہے۔یہ خطوط ''مکاتیب شبلی'' مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی سے انتخاب ہیں۔مگر یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ شبلی نے جب متعدد خطوط پروفیسر عبدلقادر سرفراز کے نام تحریر کیے ہیں تو کیا پروفیسر عبدالقادر سرفراز نے کوئی جواب خط بنام شبلی

نہیں لکھا؟ اور اگر لکھا ہے تو وہ کہاں ہیں۔ عبدالستار دلوی ''پروفیسر عبدالقادر سرفراز اور شبلی'' کے تعلقات پر لکھتے ہوئے یہ امکان ظاہر کرتے ہیں:

''شبلی کے نام پروفیسر عبدالقادر سرفراز کے خطوط کا پتہ نہیں چلا۔ ممکن ہے کہ دارالمصنفین کے علمی ذخیرے میں یہ محفوظ ہوں۔''

(خان بہادر پروفیسر عبدالقادر سرفراز (احوال وآثار)،ص:26)

عبدالستار دلوی نے خطوطِ خان بہادر پروفیسر عبدالقادر سرفراز بنام مولانا شبلی کے دارالمصنفین کے علمی ذخیرے میں محفوظ ہونے کا جو امکان بتایا ہے اس سے متفق ہونا پڑتا ہے کیوں کہ شبلی کے انتقال کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی نے شبلی کے ادبی سرمائے کو دارالمصنفین منتقل کر دیا تھا۔

''خان بہادر پروفیسر شیخ عبدالقادر سرفراز (احوال وآثار) سے جہاں پونے کے ادبی ماحول، پونے کی ادبی شخصیات بالخصوص فارسی پروفیسروں سے متعلق مواد ملتا ہے۔ وہیں دوسری طرف مطالعہ شبلیاں میں بھی اہم دستاویز ہے۔ اسی لیے کتاب ہذا کی اہمیت بتاتے ہوئے ڈاکٹر مزمل سرکھوت رقم طراز ہیں:

''پروفیسر عبدالستار دلوی کی کتاب............ ''شبلیات'' کے مطالعہ میں ایک اہم دستاویزی کتاب ہے جس سے علامہ شبلی نعمانی کی تحقیقات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اسی طرح کی کتابیں علامہ شبلی کے دیگر احباب اور شاگردون کے حوالے سے تصنیف کی جانی چاہیے۔''

(سہ ماہی ''نوائے ادب'' (تبصرہ) خان بہادر پروفیسر عبدلقادر سرفراز (احوال وآثار) ایک مطالعہ' اپریل 2017 تا ستمبر 2017،ص:88-87)

بہر حال عبدالستار دلوی کو ''خان بہادر پروفیسر شیخ عبدالقادر سرفراز (احوال وآثار) کے پیش منظر میں صبر آزما، غیر جانب دار، دقت پسند اور اکابرین و صالحین کے ساتھ مودبانہ رویہ رکھنے والے محقق کی طرح پیش کیا جا سکتا ہے

4.2.4۔ اقبال کا ایک ممدوح عظیم سنسکرت شاعر اور مفکر بھرتری ہری

(تحقیقی مطالعہ اور اس کے مستند کلام کا اردو ترجمہ)

عبدالستار دلوی کی تصنیف ''بھرتری ہری'' اگست 2004ء میں دائرۃ الادب ممبئی سے شائع ہوئی ہے۔ جس کا انتساب انہوں نے اپنے بزرگ و محترم علمی رہنما اور ممتاز مورخین پنڈت ستیو مادھو راؤ پگڑی اور ڈاکٹر پی۔ ایم جوشی کی کبھی نہ بھولنے والی یادوں کے نام کیا ہے۔ اس کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر رفیق زکریا نے اور دیباچہ علی سردار جعفری نے لکھا ہے۔

عبدالستار دلوی نے ''بھرتری ہری'' کا مقدمہ تحقیقی اور تفصیلی انداز میں قلم بند کیا ہے۔ جس کا ہم یہاں تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کرنے کی کوشش کریں گے۔

مقدمے کی ابتدأ سنسکرت زبان و ادب کے پس منظر سے ہوتی ہے۔ جس میں مقدمہ نگار نے سنسکرت ادب کو چھ مذہبی اور چار غیر مذہبی اجزأ میں تقسیم کیا ہے۔ اور سنسکرت کے ویدک دور کو مختلف اپنیشدوں میں تقسیم کرتے ہوئے اجمالی جائزہ لیا ہے۔

مقدمے کی دوسری سرخی ''مہابھارت'' ہے جس میں عبدالستار دلوی نے مہابھارت کو دنیا کی ادبی تاریخ میں طویل نظم قرار دیا ہے۔ جو 3200ق۔م میں تخلیق کی گئی ہے۔

مقدمے کی تیسری سرخی ''بھگوت گیتا'' ہے جو بقول عبدالستار دلوی پانچویں صدی ق۔م کی تخلیق ہے اور سارے اپنیشدوں کی تلخیص ہے جو ترک دنیا اور نفس کشی کی تعلیم دیتی ہے۔

مقدمے کی چوتھی سرخی ''ہری ونش'' ہے جو مہابھارت میں کرشن سے متعلق خامی کو دور کرنے کے لیے تصنیف کی گئی ہے۔ جس میں 16374 اشعار ہیں۔ یہ پوری نظم تین اجزأ پر مشتمل ہے۔

مقدمے کی پانچویں سرخی ''پران'' ہے اور مقدمہ نگار کے مطابق ہندوؤں میں پرانوں کو بڑی اہمیت دی

جاتی ہے کیوں کہ ویدوں کی تعلیم صرف ہندو سماج کے اعلیٰ طبقے تک محدود تھی اسی لیے درمیانی طبقے کے لیے ''پران'' اور ادنیٰ طبقے کے لیے ''اپ پران'' کو تخلیق کیا گیا۔ان پرانوں کی مجموعی تعداد اٹھارہ ہے جن میں سے دس کو مہا پران کہا جاتا ہے۔بھگوت گیتا کا شمار بھی انہی مہا پرانوں میں ہوتا ہے۔

مقدمے کی چھٹی سرخی ''رامائن'' ہے۔جس پر بات کرتے ہوئے عبدالستار دلوی جدید تحقیقات کی روشنی میں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ رامائن ایک تمثیلی داستان ہے جو مختلف تحریفات وتعریفات کے بعد آج اس کی حیثیت کچھ کی کچھ ہو گئی ہے۔

مقدمے کی ساتویں سرخی ''والمیکی کی فنی صلاحیتیں'' ہے جس میں مقدہ نگار نے والمیکی کے عہد، رامائن کی تخلیق اور رامائن کی فنی خوبیوں سے متعلق معلومات دیں ہیں۔

مقدمہ کی آٹھویں سرخی'' کالی داس اوران کا عہد'' ہے۔جس میں فاضل مقدمہ نگار نے کالی داس کے زمانے وکرم آدتیہ کے دربار سے منسلک ہونے اور ان کی تخلیقات بالخصوص شکنتلا سے بحث کی ہے۔

مقدمے کی نویں سرخی'' کالی داس اور ان کے بعد کی تخلیقات'' ہے جس میں کالی داس کی تخلیقات کے پس منظر میں ان سے بعد کے زمانے میں تخلیق ہونے والی تمام تخلیقات کو تاریخی اعتبار سے بیان کیا ہے۔

مقدمے کی دسویں سرخی ''رومانی نثر اور چمپو'' ہے جس میں مقدمہ نگار نے سنسکرت کی رومانی نثر کی ابتداء اور ارتقاء کو مختصر انداز میں قلم بند کیا ہے۔

مقدمے کی گیارھویں سرخی'' حکیمانہ شاعری'' ہے جس میں ان شعراء کو بیان کیا گیا ہے۔جنہوں نے حکیمانہ انداز میں شاعری کی ہے ایسے شعراء میں بھرتری ہری، سلہانا، بھلت، شہمشور، ویریشور، نیل کنٹھ اور گوردھن کا شمار ہوتا ہے۔

مقدمے کی بارھویں سرخی'' بھرتری ہری'' ہے جس میں عبدالستار دلوی نے بھرتری ہری کی شاعرانہ خصوصیات بالخصوص ''ترائے ستک'' کے حوالے سے گفتگو کی ہے اور شاعر مشرق علامہ اقبال پر مولانا رومی اور نطشے

کے شعری اثرات بتاتے بتاتے بھرتری ہری کے اثرات کا بھی جائزہ لیا ہے اور انہوں نے اقبال کے فلسفہ خودی کو بھرتری ہری کے عرفان ذات اور خود شناس سے ماخوذ بتایا ہے۔

مقدمہ کی تیرھویں سرخی ''بھرتری ہری کے شتک'' ہے جس میں مقدمہ نگار نے بھرتری ہری کے شتکوں کے سلسلے میں مختلف نسخوں اور الفاظ کے اختلافات کو مختصر انداز میں قلم بند کیا ہے۔

مقدمہ کی چودھویں اور پندرھویں سرخیاں الترتیب ''شتک ترالیم اور بھرتری ہری کی شخصیت اور شاعری'' ہیں۔ جن میں مقدمہ نگار نے بھرتری ہری کی شخصیت سے متعلق مختلف واقعات، شاعرانہ خصوصیات اور بالخصوص شتک ترالیم (واکیہ پدیا) کے فنی رموز کا تفصیلی مطالعہ کیا ہے جس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

مقدمے کی سولہویں سرخی ''بھرتری ہری کے اردو تراجم'' ہے جس میں عبدالستار دلوی نے گوری شنکر لال اختر کے جوہر تثلیث 1913ء کو اولین ترجمہ قرار دیا ہے۔ اور اس کے بعد علامہ اقبال میراجی، اثر لکھنوی، جے کرشن شنکر چودھری، تلوک چند محروم، جذب عالم پوری، امتیاز الدین احمد، یوسف ناظم، عصمت جاوید اور ایک سنسکرت پروفیسر جوزف بروَن کے ترجموں کو تفصیلی طور پر مدلل انداز میں بیان کیا ہے۔

مقدمے کی سترھویں اور آخری سرخی ''بھرتری ہری اور اقبال'' ہے جس میں عبدالستار دلوی نے کلیات اقبال سے چن چن کر ایسے اشعار کو پیش کیا ہے جس پر بھرتری ہری کی فکر اور آہنگ کا اثر نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

''بھرتری ہری'' پر یہ پیش نظر کتاب مقدمے کے اعتبارے سے تحقیقی وتنقیدی زمرے میں شامل ہے جب کہ دوسو شتکوں کا اردو ترجمہ ''ترجمے'' کے ذیل میں شامل کیا گیا ہے۔ جو آئندہ اوراق میں دیکھنے اور پڑھنے کو ملے گا۔

''بھرتری ہری'' پر عبدالستار دلوی کا یہ مقدمہ تحقیقی وتنقیدی دونوں اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ کیوں کہ مقدمہ نگار نے جہاں اس میں محقق کی جستجو اور دقت پسندی کے تحت بھرتری ہری سے متعلق مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے وہیں دوسری جانب بہ حیثیت ناقد قدیم اور عالمانہ شاعر پر لکھتے ہوئے تنقیدی بصیرت کے لیے بہترین

نمونے پیش کیے ہیں۔مقدمہ نگار عبدالستار دلوی کی انہی خصوصیات سے متعلق رفعت سروش یوں اپنی رائے دیتے ہیں:

''پروفیسر عبدالستار دلوی نے بہ حیثیت محقق معلومات کے دریا بہائے ہیں اور اردو ادب کے گوشے گوشے سے بھرتری ہری کو دریافت کیا ہے اور بہ حیثیت ناقد کے ان تراجیم کو ناقدانہ نظر سے دیکھا ہے۔ ان کی قدر و قیمت متعین کی ہے۔ بالخصوص اقبال اور بھرتری ہری پر لکھتے ہوئے انہوں نے ان اشعار اور نظموں کی بھی نشاندہی کی ہے جن پر بھرتری ہری کے فکر و آہنگ کا اثر نظر آتا ہے۔''

(''ادب شناسی''ص:11-10)

عبدالستار دلوی کو بہ حیثیت محقق غیر جانب دار قرار دیتے ہوئے ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا لکھتے ہیں:

''پروفیسر دلوی ایک غیر جانب دار محقق ہیں۔انہوں نے یہ مقدمہ تحریر کر کے ثابت کر دیا کہ اقبال نے جتنا اثر اسلامی تعلیمات کا قبول کیا اتنا ہی انہوں نے ہندو مذہب اور اس کی تہذیبی روایات کا بھی قبول کیا ہے۔اس حقیقت سے کوئی بھی محقق انکار نہیں کر سکتا۔''

(ادبی اور تحقیقی مضامین،ص:142)

بھرتری ہری کے طویل مقدمے کے مطالعہ، رفعت سروش اور ڈاکٹر ٹی۔آر رینا کے اقتباسات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اردو ادب میں بھرتری ہری سے متاثر شعراء اور بھرتری ہری کے مترجم تو بہت ہیں مگر عبدالستار دلوی سے پہلے کسی نے بھی بھرتری ہری کی حیات شخصیت،عہد،تخلیقات،شاعری کے ساتھ ساتھ سنسکرت ادب میں اس کے مقام و مرتبے پر تحقیقی،تنقیدی، مدلل اور تفصیلی انداز گفتگو نہیں کی ہے۔اسی لیے بھرتری ہری پر آپ کی یہ کتاب حوالہ جاتی اہمیت رکھتی ہے۔

4.2.5۔ اقبالؔ اور بمبئی (روزنامہ خلافت، بمبئی کے حوالے سے):

عبدالستار دلوی کی کتاب ''اقبالؔ اور بمبئی'' تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے نومبر 2012ء میں شائع ہوئی ہے۔ انہوں نے اس کتاب کا انتساب مشہور دانشور محقق اور ماہر قانون داں پروفیسر آصف علی اصغر فیضی اور مشہور رہنما و ماہر تعلیم معین الدین حارث کے نام معنون کیا ہے جنھیں اقبال سے ملاقات کا شرف حاصل تھا۔

''اقبالؔ اور بمبئی'' کا ابتدائیہ ڈاکٹر ظہیر قاضی، پیش لفظ پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی اور مقدمہ خود عبدالستار دلوی نے تحریر کیا ہے۔ اور مکمل کتاب کو دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے جس کے پہلے حصے میں ''نو'' مضامین شامل ہیں۔ حصے دوم میں تین مضامین درج ہیں۔ اسی طرح ضمیمے کے طور پر دو مضامین دیے گئے ہیں۔ تو آیئے اب جملہ مضامین کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کیا جائے۔

حصہ اول:

1۔ اقبالؔ اور بمبئی:

عبدالستار دلوی نے اس مضمون میں اقبالؔ کے مختلف اوقات میں قیام بمبئی اور ان کی یہاں مختلف علمی و ادبی سرگرمیوں کا تحقیقی انداز میں جائزہ لیا ہے۔ اس خصوص میں عطیہ بیگم فیضی اور ایوان رفعت کا بیان دلچسپ بھی ہے اور معلوماتی بھی ہے۔ اس کے مطالعہ سے جہاں اقبال کی بمبئی قیام کے دوران پیش آئی سرگرمیوں کا علم تو ہوتا ہی ہے۔ وہیں اقبال اور عطیہ بیگم فیضی کے جذباتی رشتے پر خطوط اقبالؔ ہی کے حوالے سے روشنی بھی پڑتی ہے۔

2۔ اقبال کی بمبئی میں آمد اور مسلمانوں کے نام ان کا پیغام:

عبدالستار دلوی نے اس مضمون میں 10 / ستمبر 1931ء کو اقبال کی بمبئی آمد، اقبالؔ کا پر جوش استقبال،

خلافت ہاؤس میں رہائش اور بمبئ میں اقبال کی تین روز کی متعدد سرگرمیوں کا جائزہ روزنامہ ''خلافت'' کے حوالے سے لیا ہے اور اقبؔال کا وہ پیغام بھی نقل کیا ہے جو انہوں نے 12/ستمبر 1931ء کو لندن روانگی سے قبل، مسلمانانِ ہند کو مخاطب کر کے دیا تھا۔ وہ پیغام یہ ہے:

> ''اسلامی تعلیم کے تحت مسلمانوں کو لازم ہے کہ بنی نوع انسان کے کسی فرد بشر کے ساتھ بھی تعصب اور تنگ نظری کا برتاؤ روا نہ رکھیں۔ اس کا سینہ فراخ اور بے کینہ ہو کسی قسم کی توہم پرستی کو اپنے دل میں جگہ نہ دے۔ میرا ایمان ہے کہ مومن کے دل کی وسعتیں تمام بنی نوع انسان کو احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ اسلام کیا ہے؟ ایک عالم گیر اتحاد انسانی یہ ایک حقیقت ہے جو تمام مسلمانوں کو ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے۔'' (اقبؔال اور بمبئی، ص:38)

اقبؔال نے اس پیغام میں جہاں مسلمانانِ ہند کو تنگ نظری اور توہم پرستی سے دور رہنے کی تلقین کی ہے وہیں اسلامی تعلیمات کے حوالے سے عالمی، اتحاد، اخوت اور بھائی چارگی کو قائم رکھنے کا درس بھی دیا ہے۔

3۔ علامہ اقبال: اسلام اور ملوکیت:

دراصل اس مضمون کا مآخذ اقبال کا وہ انٹرویو ہے جو انہوں نے 1931ء میں دوسری گول میز کانفرنس کے لیے لندن روانہ ہونے سے پہلے انگریزی روزنامے ''بمبئی کرانیکل'' کو دیا تھا۔ مگر یہیں انٹرویو اردو اخبار ''رونامہ خلافت'' بمبئی میں بھی جمعہ 9 اکتوبر 1931ء کو شائع ہوا ہے۔ دراصل ''بمبئی کرانیکل'' انگریزی رونامہ ہے۔ لیکن اس میں خوشہ چینیاں'' کے عنوان سے اردو اخبارات کے اقتباسات، اردو ادیبوں اور شاعروں کے مضامین، نظمیں اور تراجم شائع ہوا کرتے تھے اور ''خوشہ چینیاں کے تحت شائع ہونے والے مواد کو تحریر کرنے کی ذمہ داری ضیاء الدین برنی (مصنف، عظمت رفتہ) کی تھی۔ اور اقبؔال کا مذکورہ انٹرویو بھی اسی خوشہ چینیاں کے تحت شائع ہوا ہے۔ جس میں اقبؔال نے اسلام اور ملوکیت پر اپنے ذاتی تاثرات کو یوں بیان کیا ہے:

''مجھے دنیا کے کسی فرقہ یا قوم سے کوئی بغض و عناد نہیں ہے۔ میری تو صرف خواہش یہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی زمانہ کی زندگی پھر عود کر آئے۔ میں اہل ہند کو امن وسکون کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں اور میرا عقیدہ ہے کہ ایسا اس صورت میں ناممکن ہے کہ ہر ایک فرقہ اپنی تہذیب وتمدن اور انفرادی حیثیت کو برقرار رکھے۔'' (اقبالؔ اور بمبئی،ص:41)

اس اقتباس سے اقبال کے سیکولر خیالات پر روشنی پڑتی ہے اور یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ پاکستان کی تائید میں نہیں تھے۔مگر فرقہ پرستوں نے اقبال کو پاکستان کا حامی بنا کر موردِ الزام ٹھہرایا۔اس کے علاوہ اقبال نے اس انٹرویو میں تحریک اتحاد اسلامی (بان اسلامزم)،اسلام اور قومیت اور عرب ممالک کا فیڈریشن جیسے موضوعات پر بھی اپنے آزادانہ خیالات کا اظہار کیا اور یہ مضمون عبدالستار دلوی کا ایک تحقیقی مضمون ہے۔

4۔ اقبال ایشیاء کے ملک الشعراء:

عبدالستار دلوی نے اپنا یہ مضمون لندن کی ''اقبال لٹریری اسوسی ایشن'' کی جانب سے 6 نومبر 1931ء کو اقبال کو پیش کی گئی تہنیت سے متعلق لکھا ہے۔جس میں دوسری گول میز کانفرنس کے تمام مندوبین کے ساتھ معزز ہستیاں بھی موجود تھیں۔اس جلسے میں تقریباً چارسو شرکا شریک تھے۔جنہوں نے متفقہ طور پر اقبالؔ کو ایشیاء کا ملک الشعراء قرار دیا۔یہ تہنیت اقبالؔ کے لیے ایک بڑا اعزاز تھی۔

5۔ ہسپانیہ میں علامہ اقبال کے مشاہدات:

عبدالستار دلوی کا یہ مضمون بھی روزنامہ ''خلافت'' بتاریخ 25 فروری 1933ء میں شائع ہونے والے ایک یادگار انٹرویو سے ماخوذ ہے۔جس میں اقبالؔ کے تیسری گول میز کانفرنس سے واپسی پر پیریس،فرانس اور اسپین (ہسپانیہ) کے سفر کے مشاہدات اور تاثرات بیان کیے گئے ہیں۔ بالخصوص ہسپانیہ(اسپین) سے متعلق وہ کہتے ہیں

کہ انھیں وہاں کے بازار، غذااور لوگ بالکل مشرقی لگے اور کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ کیوں کہ اسپین پر مسلمانوں نے سات سو سال حکومت کی ہے۔اسی لیے شاید اقبال کو یہاں کی تہذیب وتمدن میں کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ اقبال اسی سفر میں شہر قرطبہ کی بھی سیاحت کی، اس تاریخی مسجد میں نماز ادا کی اور اپنی شاندار نظم ''مسجد قرطبہ'' کی تخلیق بھی اسی سفر میں کی ہے۔

6۔ تیسری گول میز کانفرنس، لکھنو مسلم کانفرنس اور اقبال:

لکھنؤ مسلم کانفرنس اکٹوبر 1932ء میں منعقد ہوئی تھی۔ جس میں تمام مسلمان رہنما شریک ہوئے۔ مگر اقبال اور ان کے رفقاء نے اس میں شریک ہونے سے پرہیز کیا۔ کیوں کہ اس وقت گاندھی جی قید میں تھے اور ہندو بغیر گاندھی جی کے کوئی بھی تجویز پیش کرنے سے قاصر تھے۔ اسی لیے اقبال کی نظر میں یہ کانفرنس غیر ضروری تھی کیوں کہ ان کے مطابق تمام مسلمان رہنما کے جن نکات پر بات کرنے کے امکانات ہیں وہ تو پہلے ہی سے موضوع بحث رہے ہیں۔ یہ مضمون اقبال کے مختلف انٹرویوز اور خطوط کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے۔ اسی لیے اس کی اہمیت دستاویزی ہوگئی ہے۔

7۔ اقبال اور عطیہ بیگم فیضی:

عبدالستار دلوی نے اپنے مضمون ''اقبال اور عطیہ فیضی'' میں اقبال اور عطیہ فیضی کی پہلی ملاقات (یکم اپریل 1906ء) سے عطیہ فیضی کے انتقال 4 جنوری 1967ء تک کا احاطہ کیا ہے۔ جس میں پہلے پہل دوستی پھر عشق اور عطیہ فیضی کی سمیول رحمین سے شادی کے بعد صرف دوستانہ عزیزانہ تعلقات قائم رہے۔ اور مصنف نے مشفق خواجہ کے حوالے سے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ اقبال اور عطیہ فیضی کے درمیان جذباتی رشتہ تھا جس کا اعتراف خود عطیہ بیگم فیضی نے کیا تھا۔

مطالعات اقبال اور مطالعات شبلی میں تو عطیہ فیضی پر خوب لکھا گیا ہے۔ مگر عطیہ فیضی کو موضوع بنا کر شاید

ہی کسی نے کچھ لکھا ہو۔ ایسے میں پیش نظر مضمون جو عطیہ فیضی کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

8۔ اقبالؔ کا ایک غیر مطبوعہ خط

(بیگم صاحبہ نازلی رفیعہ بیگم، جنجیرہ کے حوالے سے):

اقبالؔ نے یہ خط ''بیگم صاحبہ نازلی رفیعہ بیگم'' کے نام نان ونفقہ اور سرکاری ٹائٹل ''بیگم صاحبہ'' کو جاری رکھنے کے لیے وئسرائے کو لکھا تھا۔ جس میں وئسرائے کی توجہ اس طرف مبذول ہو سکے۔ غالبًا عطیہ فیضی نے ہی اقبال کو اس معاملے سے آگاہ کر کے مدد طلب کی ہوگی کیوں کہ اقبالؔ قانون داں تھے۔ مسلمان رہنماؤں اور سرکاری افسران دونوں پر ان کا اثر ورسوخ تھا تو اقبال نے بھی وئسرائے کو یہ طویل خط لکھ کر دوستی کا حق ادا کر دیا ہے۔

اقبال نے یہ خط وئسرائے کو بزبان انگریزی لکھا تھا۔ عبدالستار دلوی نے اسے دریافت کر کے، اردو ترجمے کے ساتھ اس مضمون میں شامل کر دیا ہے۔

9۔ ترانہ ہندی کے سو سال:

عبدالستار دلوی نے اس مضمون میں ترانہ ہندی بخط اقبال ترانہ ہندی کے پس منظر میں دلچسپ واقعات، ترانہ ہندی پر تنقید وتبصرے ترانہ ہندی سے متعلق گاندھی جی کی رائے اور اسے ''ہندوستانی'' زبان کا بہترین نمونہ قرار دینے سے متعلق تفصیلی انداز اختیار کیا ہے۔ اور دوران میں وزیر اعظم اندرا گاندھی کے پوچھے جانے پر کہ ''انھیں ہوائی سفر کے دوران ہندوستان کیسا لگتا ہے۔'' تو راکیش شرما نے جواب دیا۔ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا''۔ اس واقع سے ترانہ ہندی کی مقبولیت اور اہمیت دونوں کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

مذکورہ ''نو'' مضامین پر کتاب ''اقبال اور بمبئی'' کا حصہ اول اختتام پذیر ہوتا ہے اور یہیں سے دوسرے حصے کی ابتدا بھی ہو جاتی ہے۔ جس میں تین مضامین شامل ہیں۔

1۔ مہاتما گاندھی اردو اور اقبالؔ:

عبدالستار دلوی نے اس مضمون میں مہاتما گاندھی کی اردو دانی، اردو زبان سے لگاؤ، ان کے اردو خطوط، اقبال کے ترانۂ ہندی سے ان کے فطری لگاؤ اور ترانہ ہندی کو ان کی طرف سے زبان ہندوستانی کا نمونہ قرار دینا وغیرہ وغیرہ کو گاندھی جی کے خطوط کے حوالے سے مدلل لکھا ہے۔

2۔ مصر میں اردو اور اقبالؔ:

عبدالستار دلوی نے اس مضمون میں مولانا ابوالکلام آزاد کے وزیر تعلیم کے عہدے پر فائز ہونے، انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز کے قائم کرنے، مختلف اردو سفر ناموں میں مصر کی روداد، ہندوستانی مختلف کتابوں کے عربی تراجم، عربی تراجم سے متعلق تجاویز ہندوستانی قصے، کہانیوں اور شاعری مصر میں اردو سے دلچسپی، مصر میں اردو تحقیق، مصر میں اردو شاعری سے دلچسپی اور اقبال جیسے مختلف موضوعات کا احاطہ کیا ہے۔ جس سے ایک طرف اردو قارئین مصر اور مختلف مما لک سے سفر ناموں کے حوالے واقف ہو رہے ہیں۔ وہیں عربی قارئین اردو ادب اور اس کی مختلف اصناف وقلم کاروں سے متعارف ہو رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر عبدالستار دلوی کی پیش کردہ تجاویز پر عمل کیا جائے تو مصر میں اردو کو مزید فروغ دینے میں آسانی ہوگی۔

3۔ اقبالؔ اور احمد شوخی کی شاعری میں تاریخی حسیت:

عبدالستار دلوی نے اس مضمون کے پس منظر میں احمد شوخی کی پیدائش، تعلیم شاعری وغیرہ پر گفتگو کرتے ہوئے اقبال اور احمد شوخی کے کلام میں موضوعات، فنی رموز اور اسی طرح اقبال اور احمد شوخی کی شاعری کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ ان تین مضامین پر کتاب ''اقبال اور بمبئی'' کا دوسرا حصہ بھی اختتام پذیر ہے۔ اس کے بعد کا حصہ ضمیمہ ہے۔ جس کے تحت دو مضامین یہ ہیں:

1۔ علامہ اقبالؔ بمبئی میں

2۔ اقبآل کی زندگی کے چند گوشے

یہ دونوں مضامین محی الدین غازی اجمیری (سیکریٹری خلافت ہاؤس، بمبئی) کے قلم کا نتیجہ ہیں جو دراصل یادداشتوں پر مبنی ہیں۔ اقبآل سے متعلق ان مضامین کی اہمیت کے پیش نظر ان کو ضمیمہ کے طور پر شامل کتاب کرلیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ کتاب ''اقبال اور بمبئی'' کے پہلے حصے کے مضامین ہی کتاب کے عنوان سے راست تعلق رکھتے ہیں۔ جب کہ دوسرے حصہ کے مضامین کا تعلق ''اردو'' سے ہے۔لیکن ضمیمہ کے دونوں مضامین تحقیقی اور دستاویزی نوعیت کے ہیں۔ ان میں تنقید کا عنصر غالبًا کہیں نظر نہیں آتا کیوں کہ یہ مضامین حقائق Facts پر مبنی ہیں۔ ان مضامین سے متعلق پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی یوں اپنی رائے دیتے ہیں:

> ''پروفیسر عبدالستار دلوی نے ممبئی سے اقبآل کے تعلق کے بارے میں تحقیق کی ہے جس میں بہت کچھ وہ ہے جواب تک لوگوں کو متوجہ نہیں کرسکا۔ اس معلومات کے ذریعے ان کی نجی اور تخلیقی زندگی کی نشوونما سے متعلق کڑیاں مل جائیں گی۔''

(اقبآل اور بمبئی، ص:12)

''اقبآل اور بمبئی'' کے جملہ مضامین سے متعلق خود عبدالستار دلوی کا کہنا ہے:

> ''اس کتاب کے مضامین تنقید وتبصرہ سے زیادہ دستاویزی ہیں۔ اور ان سے حیات وفکر اقبال کے کئی نامعلوم گوشے ہمارے سامنے آتے ہیں۔''

(اقبآل اور بمبئی، ص:12)

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور عبدالستار دلوی دونوں کی آراء اور مطالعہ مضامین سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ''اقبآل اور بمبئی'' کے مضامین نہ تنقیدی ہیں نہ تبصراتی ہیں بلکہ یہ تو تحقیقی ودستاویزی ہیں۔ جن سے عبدالستار دلوی بہ حیثیت محقق اور بہ حیثیت ماہر اقبالیات دونوں خصوص میں اعلیٰ مقام کے حق دار قرار دیے جاسکتے ہیں۔

4.2.6۔ مہاتما گاندھی اردو اقبالؔ اور دوسرے مضامین:

''مہاتما گاندھی اردو اقبالؔ اور دوسرے مضامین عبدالستار دلوی کے اکیس مضامین کا مجموعہ ہے۔اس مجموعہ مضامین کے بیشتر مضامین مہاتما گاندھی اردو اور اقبالؔ سے متعلق ہیں۔اسی مناسبت سے مجموعے کو یہ نام دیا گیا ہے۔اور وہ بالکل مناسب معلوم ہوتا ہے۔اب آیئے ایک ایک کر کے ان مضامین کا مختصر احاطہ کیا جائے۔

1۔ مہاتما گاندھی اور ہندوستان کا لسانی مسئلہ:

عبدالستار دلوی نے اس مضمون میں مہاتما گاندھی کی پہلودار شخصیت پر بات کرتے ہوئے انھیں مہاتما کہا ہے اور ان کی اسی حیثیت سے ہندوستان کے لسانی مسئلے یعنی اردو ہندی کے جھگڑے پر ان کے پیش کردہ نظر یے ''ہندوستانی''کو تفصیلی طور پر بیان کیا ہے۔ یہ مضمون سب سے پہلے ماہنامہ ''شاعر'' کے گاندھی جی نمبر 1969 میں شائع ہوا تھا۔اس کے بعد آپ کے پہلے مجموعے مضامین میں ''نئی تحریریں'' 1986ء میں شامل کیا گیا ہے اور اب اس مضمون کو گاندھی جی اور اردو کی مناسبت سے اس مجموعے میں دوبارہ جگہ دی گئی ہے۔

2۔ مہاتما گاندھی، ہندوستانی اور پیرین بہن کیپٹن:

عبدالستار دلوی کا مضمون ''مہاتما گاندھی'' ہندوستانی اور پیرین بہن کیپٹن'' ہے۔ یہ مضمون مہاتما گاندھی اور ان کے نظریے ہندوستانی کے پس منظر میں ہندوستانی کی حامی پیرین بہن کیپٹن کی شخصیت اور مثالی لگاؤ کو بیان کرتا ہے۔

3۔ مہاتما گاندھی قومی زبان اور ہندوستانی:

عبدالستار دلوی کے مضمون ''مہاتما گاندھی'' قومی زبان اور ہندوستانی'' کی ابتداء سنسکرت اور دیگر زبانوں کی ابتداء وارتقاء سے ہوتی ہے جس میں قومی زبان کے مسئلے اور گاندھی جی کے نظریے ''ہندوستانی'' کو

گاندھی جی کے خطوط اور خطبات کے حوالے سے مدلل بیان کی گیا ہے۔ یہ مذکورہ مضمون آپ ہی کی مرتبہ کتاب امرت بانی (انتخاب) کا مقدمہ ہے۔

4۔ مہاتما گاندھی اردو اور اقبال:

عبدالستار دلوی نے اس مضمون میں مہاتما گاندھی کی اردو دانی، اردو زبان سے فطری لگاؤ، ان کے اردو خطوط، اقبال کے ترانہ ہندی سے ان کے لگاؤ اور ترانہ ہندی کو انکی طرف سے زبان ہندوستانی کا مثالی نمونہ قرار دیے جانے کو گاندھی جی کے ہی خطوط کی روشنی میں مدلل لکھا ہے۔۔ یہ مضمون پہلے سرمایہ ''نوائے ادب'' اپریل تا ستمبر 2008 میں شائع ہوا۔ پھر'' اقبال اور بمبئی'' میں شامل رہا اور اب پیش نظر کتاب کا حصہ ہے۔

5۔ ہندوستان میں اردو: کل اور آج:

عبدالستار دلوی نے مضمون ''ہندوستان میں اردو: کل اور آج'' میں ہندوستان میں سنسکرت کے عروج، مسلمانوں کی آمد، رابطہ عامہ کی زبان، جنوبی ہند میں قطب شاہی و عادل شاہی سلاطین کی سرپرستی، اردو کی شمالی ہند منتقلی، فروغ، اردو میں تصنیف تالیف و ترجمہ، نظم ونثر، انیسویں صدی میں اس کے فروغ اور موجودہ دور میں اس کی ترقی اور حکومت ہند کی پالیسیوں اور مختلف سرکاری و نیم سرکاری اداروں کے ذریعہ اردو کی ترقی و ترویج کو تفصیلی انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ الفاظ دیگر اردو کی ابتداء اور ارتقا کو بیان کیا ہے۔ دراصل یہ مضمون آپ کا ایک یادگار خطبہ ہے جو آپ نے جنوری 1995ء میں بہ حیثیت بانی اردو پروفیسر عین شمس یونی ورسٹی' قاہرہ' مصر میں دیا تھا۔

6۔ امیر خسرؔو کی عوامی شاعری اور سیاسی اخلاقیات:

عبدالستار دلوی نے ''امیر خسرؔو کی عوامی شاعری اور سیاسی اخلاقیات'' پر جو یہ مضمون قلم بند کیا ہے۔ اس کا ماخذ خسرو کی مثنوی ''نہہ سپہر'' مثنوی دول رانی خضر خان، خسرو سے منسوب غزل، دوہے، کہہ مکرنیاں اور قصیدے ہیں۔ جن سے مصنف نے مثالیں دے کر خسرو کو عوامی شاعر ثابت کیا ہے۔ یہ مضمون اس کتاب سے قبل سہ

ماہی ''نئی کتاب'' اپریل تا جون 2011ء میں شائع ہو چکا ہے۔

7۔ اردو کا ہندوستانی رجحان:

عبدالستار دلوی نے اس مضمون میں اردو کے پس منظر میں گفتگو کرتے ہوئے اردو کے تین رجحانوں کی نشاندہی کی ہے۔ جس میں پہلا رجحان مقفیٰ و مسجع اردو کا ہے، دوسرا رجحان اردو کا ہندوستانی رجحان ہے۔ جس کو مصنف نے قدیم شعراء (ولی اور سراج قدیم نثری داستانیں بالخصوص رانی کیتکی کی کہانی سے ثابت کیا ہے۔ اتنا ہی نہیں مصنف نے موجودہ دور میں بھی نظم و نثر میں بھی اردو کے اس ہندوستانی رجحان کو دکھایا ہے۔ جب کہ اردو کا تیسرا رجحان انگریزی کا ہے۔ یہ مذکورہ مضمون آپ کے مجموعے مضامین ''اردو زبان اور سماجی سیاق'' اور مرزا خلیل احمد بیگ کی کتاب ''اردو زبان کی تاریخ'' میں شامل ہے۔

8۔ اردو شاعری میں جذبۂ وطن دوستی:

عبدالستار دلوی نے مذکورہ مضمون کی ابتداء میں وطن اور قوم کے جغرافیائی و سیاسی تصور پر تفصیلی گفتگو کی ہے اور اسی پس منظر میں اردو کے متعدد قدیم و جدید شعراء کی نظموں کو مثالوں کے طور پر پیش کیا ہے۔ اور ان قدیم و جدید شعراء میں دکنی شعراء، عہد عالم گیر کے شعراء کے علاوہ حالؔی، آزاؔد، اقباؔل، جوشؔ، چکبستؔ، سیمابؔ، اختؔر، محروؔم، مخدوؔم، وغیرہ وغیرہ کا انتخاب کیا ہے۔

9۔ مراٹھی میں غالب کے مطالعہ اور ترجمے:

عبدالستار دلوی نے اپنے مضمون ''مراٹھی میں غالبؔ کے مطالعے اور ترجمے'' میں غالب کو انسان دوست اور عظمت خیال فنکار قرار دیا ہے۔ جس سے متاثر ہو کر مراٹھی ادیب و شعراء نے وقفے وقفے سے غالبؔ کو جو نثری و منظوم خراج عقیدت پیش کیا ہے اس کی مکمل تفصیل دی ہے۔ اور اس تفصیل میں ادب کی مختلف اصناف جیسے سوانح، ناول، ڈرامہ اور مضامین وغیرہ وغیرہ کا احاطہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ دیوان غالبؔ کا نثری ترجمہ از سیتو مادھو راؤ

پگڑی پر بھی گفتگو کی ہے۔

10۔ مورخ، محقق اور مترجم سیتو مادھوراؤ پگڑی:

عبدالستار دلوی نے اس مضمون میں پنڈت سیتو مادھوراؤ کو انہی کی مختلف کتابوں کے حوالے سے مورخ، محقق اور مترجم ثابت کیا ہے اور اس کے علاوہ مصنف نے ان سے اپنے شخصی تعلقات وواقعات کو بھی ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے۔

11۔ شیوا جی اور مذہبی رواداری:

عبدالستار دلوی نے مضمون ''شیوا جی اور مذہبی رواداری'' میں شیوا جی کی ہندوراشٹر کی خواہش، بہادری، تاج پوشی، مسلمان پڑوسی بادشاہوں سے خوشگوار تعلقات، فوج میں مسلمان فوجی افسر اور گیارہ گرو میں ہندو سنتو کے ساتھ ساتھ مسلمان صوفیوں کو بھی شامل کرنا وغیرہ وغیرہ زاویوں سے شیوا جی کی مذہبی رواداری کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

12۔ مہاراشٹر سے اردو کا لسانی وادبی رشتہ:

عبدالستار دلوی نے اس مذکورہ مضمون میں اردو کی ابتداء اور ارتقاء میں مراٹھی اور دیگر مقامی زبانوں سے اس کے رابطہ کو بتایا ہے اور قدیم اردو کے مختلف شعراء کے کلام میں مراٹھی الفاظ کی نشاندہی کی ہے۔ یہی نہیں انہوں نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ عہد خسرو اور عہد دکنی کے درمیان جو دوسو سال کا خلا ہے ہمیں اس کے ادب کو مراٹھی سنتوں جیسے یکنا تھ تکارام، نام دیو وغیرہ وغیرہ کے یہاں تلاش کرنا ہوگا۔

13۔ رام گنیش گڈکری: مراٹھی کا ایک ممتاز ڈرامہ نگار:

عبدالستار دلوی نے مراٹھی کے ممتاز ڈرامہ نگار، افسانہ نگار اور شاعر رام گنیش گڈکری کو موضوع بنا کر یہ مضمون قلم بند کیا ہے۔ انہوں نے اس مضمون میں گڈکری کے ڈرامے، افسانے اور شاعری پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔

لیکن مصنف نے بالخصوص گڈکری کے ڈرامے پریم سیاسی ،راج سیاسی ، پنیہ پر بھاؤ،اسٹیج پیالہ، بھاؤبندھن،خاموش ہیروکاخصوصی مطالعہ پیش کیاہے۔

14۔ محموداسرائیلی اوران کی شاعری:

''محموداسرائیلی اوران کی شاعری'' عبدالستاردلوی کا مضمون ہے۔جس میں انہوں نے محمود کے شعری مجموعے''خیاباں'' فردوس خیال اورانواردانش کے کلام پرناقدانہ رائے دی ہے۔دراصل محمود نے مختلف اصناف شاعری میں طبع آزمائی کی ہے جیسے نظمیں،رباعیاں،قصیدے،مرثیے نشطیریں وغیرہ وغیرہ۔لیکن مصنف نے محمود کی نظموں کوشبلی سے متاثر، مذہبی نظموں کوانیسؔ سے متاثر،مرثیے کوچکبستؔ سے متاثر اورمغرب سے متعلق خیالات کو اکبرؔ سے متاثر قراردیاہے۔مگرمحمود بنیادی طور پرنظم گوشاعر ہیں۔اوران کی نظموں میں امام الشعراءولی دکنی، میخانۂ اردوکاساقی،امام غزالی،محروم دید،سراپا،فلسفہ محبت،ہسپانیہ کااجڑاہواباغ،شکوہ شمع اورفلسفہ حیات محات وغیرہ وغیرہ پرگفتگوکی ہے۔

15۔ہندوستانی ادب میں تخلیقی لین دین اورسردارجعفری کی شاعری:

عبدالستاردلوی نے پیش نظرمضمون میں ہندوستان کے مقامی ادبیات میں ہونے والے ترمے(تخلیقی لین دین) کی روایت کومختصراًبیان کیاہے۔اوراس پس منظرمیں سردارجعفری کے دیوان غالب، دیوان میر،کبیراور پریم بانی کا جائزہ لیاہے۔اس کےعلاوہ مصنف نے سردارجعفری کی شاعری میں مشترکہ قومی ورثے کےعناصر کی بھی نشاندہی کی ہے۔بالخصوص نئی دنیاکوسلام ایشیاءجاگ اٹھاکےحوالے سے۔یہ مضمون آپ ہی کی مرتبہ کتاب''سردار جعفری:شخص،شاعراورادیب''میں بھی شامل ہے۔

16.مانک ٹالا،پریم چندپریمی:

عبدالستاردلوی نے مضمون''مالک ٹالا''پریم چندپریمی، کی ابتداء میں پریم چندکی اہمیت بیان کی ہے اور

انھیں اردوادیب قرار دیا ہے۔اورافسوس بھی ظاہر کیا ہے کہ پریم چند کے اردوادیب ہونے کے باوجودان پرتحقیق کووہ معیارنہیں ملا جو ہندی میں ملا۔لیکن مطالعہ پریم چند میں قمر رئیس اور مانک ٹالا دونوں کواہم بتاتے ہیں۔اوردونوں کا تقابلی مطالعہ کرکے یہ بھی باتے ہیں کہ قمر رئیس کے مطالعہ پریم چند میں تحقیق وتنقید دونوں نوعیتیں شامل ہیں جب کہ مانک ٹالا کے مطالعہ پریم چند کا اندازہ خالص تحقیقی ہے۔اسی لیے وہ پریم چند پریمیوں میں نمایاں مقام کے حق دار ہیں۔

17۔اردو میں رامائن کی روایت اوراس کا فکری پہلو:

عبدالستار دلوی نے مذکورہ مضمون کی ابتداء میں رامائن اوراس کی اہمیت بیان کی ہے۔اس کے بعد اردو میں رامائن کے مختلف تراجم کا تنقیدی جائزہ لیا ہےاوررامائن کے مختلف فکری پہلوؤں پر بھی گفتگو کی ہے۔

18۔ پریم چند: اردو یا ہندی ادیب:

عبدالستار دلوی نے اس مضمون میں پریم چند کی اردودانی، ہندی گیان،اردوتخلیقات،اردوتخلیقات کے ہندی تراجم (مالی منفعت کی خاطر)، ہندی مترجمین وغیرہ وغیرہ پر گفتگو کرتے ہوئے پریم چند کواردوادیب ثابت کیا ہے۔یہ مضمون اس مجموعے سے پہلے سہ ماہی نوائے ادب،اکٹوبر 2008 تا مارچ 2009ء میں شائع ہو چکا ہے۔

19۔ ترقی پسند تحریک،بمبئی کے تناظر میں:

عبدالستار دلوی نے اس پورے مضمون میں ترقی پسند تحریک اوراس سے متعلق مختلف علمی وادبی سرگرمیوں کو بمبئی کے تناظر میں دکھایا ہے۔اوراس میں اپنی یاداشتوں کا بھی سہارا لیا ہے۔دراصل عبدالستار دلوی کا یہ پیش نظر مضمون سجاد ظہیر کی ''روشنائی'' سے ماخوذ ہے۔یہ مضمون آپ کی مرتبہ کتاب ''علی سردار جعفری:شخص،شاعراورادیب'' کا بھی حصہ ہے۔

20۔ اردو شاعری اورمہاراشٹر کی چند ممتاز شخصیتیں:

عبدالستادلوی نے اس مضمون میں مہاراشٹر کی ممتاز شخصیتیں جیسے شیواجی، بال گنگادھر تلک، راناڈے اور گوپال

کرشن گو کھلے کو مختلف اردو شعراء کی طرف سے پیش کیے گئے منظوم خراج عقیدت کو مثالوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔

21۔ ڈاکٹر عصمت جاوید کی ترجمہ نگاری اور زبان دانی:

عبدالستار دلوی نے مضمون ''ڈاکٹر عصمت جاوید کی ترجمہ نگاری اور زبان دانی'' میں عصمت جاوید کے ترجمے، ثانوی زبانوں سے ترجمے اور ترجمہ در ترجمے سے متعلق اپنی ناقدانہ رائے دی ہے جو مثبت و منفی دونوں نوعیت کی ہے۔اس کے علاوہ عصمت جاوید کی شاعرانہ خصوصیات کا بھی بیان کیا ہے۔اور اسی ذیل میں علم عروض (اردو، فارسی، سنسکرت اور انگریزی) پر آپ کے عالمانہ مضامین پر بھی روشنی ڈالی ہے۔اتنا ہی نہیں مضمون نگار نے اپنے اور عصمت جاوید کے درمیان ذاتی لسانی مباحث پر گفتگو کرتے ہوئے عصمت جاوید کے لسانی مضامین پر بے باکانہ رائے دی ہے۔

مندرجہ بالا اکیس مضامین، مختلف موضوعات پر مختلف اوقات میں اور مختلف ضرورتوں کے پیش نظر ضبط تحریر میں لائے گئے ہیں اور بالخصوص مہاتما گاندھی، ہندوستانی زبان، قومی زبان کا مسئلہ اور اقبال آپ کے مطالعہ اور تحریروں کے خاص موضوعات ہیں۔جس کی دو وجوہات ہیں، ایک تو یہ کہ آپ کو لسانیات سے دلچسپی ہے، جس کے چلتے آپ نے زبانوں کے آپسی رشتوں اور اردو زبان و ادب کی تاریخ و ترقی پر مختلف نقطہ نظر سے مضامین لکھے ہیں وہیں دوسری جانب آپ تقریباً پندرہ سال مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ کے ڈائرکٹر رہے تو اس دوران مہاتما گاندھی کے قومی زبان کے نظریے ''ہندوستانی'' کو فروغ دینا بھی ڈائرکٹر اور سنٹر دونوں کا فرض تھا۔اور اس فرض کی ادائیگی کے لیے آپ نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا وہ قومی زبان کا مسئلہ اور نظریہ ہندوستانی ہے۔لہٰذا یہی دو وجوہات آپ کے ان مضامین اور موضوعات مضامین کا محرک ہیں۔

پیش نظر متنوع مضامین کے مطالعہ کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے' آپ کا مطالعہ وسیع اور گہری بصیرت رکھتا ہے جس کے نتیجے میں موضوع پر آپ کی گرفت کو بہ آسانی محسوس کیا جا سکتا ہے اسی لیے یہ مضامین حوالہ جاتی اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔

4.2.7۔ متفرق تحقیقی وتنقیدی مضامین:

مضامین دراصل مطالعے اور فکر کا نتیجہ ہوتے ہیں اور کبھی کبھی فرمائشی بھی ہوتے ہیں یا پھر کبھی سیمنار و سمپوزیم کی خاطر بھی ضبطِ تحریر میں لائے جاتے ہیں۔اور یہی مختلف وجوہات عبدالستار دلوی کے متعدد تحقیق وتنقیدی مضامین کے وجود میں آنے کی بھی ہیں۔جن میں سے کثیر تعداد آپ کے تحقیق وتنقیدی مضامین کے مجموعے ''نئی تحریریں''،''اقبال اور بمبئی'' اور'' گاندھی جی'' اردو اقبال اور دوسرے مضامین میں شامل ہوگئی ہے۔لہٰذا اب یہاں صرف ان مضامین کا جائزہ لیا جائے گا جو ان مجموعوں میں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں۔

1۔ مناجات بدرگاہ قاضی الحاجات درمدح حضرت شاہ عالمؒ:

''مناجات بدرگاہِ قاضی الحاجات درمدح حضرت شاہ عالمؒ'' دراصل 52 اشعار پر مشتمل مثنوی ہے جس کے خالق شیخ دین گجراتی ہیں۔عبدالستار دلوی نے اس مثنوی کو ترتیب دے کر سہ ماہی نوائے ادب میں جنوری 1965ء میں شائع کروایا تھا۔

2۔ ہندوستان کے لیے لسانی یکجہتی کا تصور:

عبدالستار دلوی نے اس مضمون میں ہندوستان جیسے کثیر لسانی ملک میں لسانی یکجہتی کا تصور واہمیت اور قومی زبان کے نظریے ''ہندوستانی'' کو اس کے حل کے طور پر تجویز کیا ہے۔یہ مضمون ماہنامہ ''شاعر'' کے قومی یکجہتی نمبر 1974ء میں شائع ہوا ہے۔

3۔ اردو شاعری میں شخصی مرثیوں کی روایت اور جگن ناتھ آزاد:

عبدالستار دلوی نے اس مضمون میں اردو شاعری کے شخصی مرثیوں کے پس منظر میں جگن ناتھ آزاد کے شخصی مرثیوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے جو ''جگن ناتھ آزاد: ایک مطالعہ'' مرتبہ محمد ایوب واقف (1993) میں شامل ہے۔

4۔ ڈاکٹر عالی جعفری۔۔۔۔۔ایک عالی مرتبت استاداور عالم:

عبدالستاردلوی کا یہ مضمون دراصل اپنے استاد ڈاکٹر عالی جعفری سے متعلق یاداشتوں پر مبنی ہے جس کو انہوں نے اپنی مادر علمی اسماعیل یوسف کالج کے پس منظر میں بیان کیا ہے۔ یہ مضمون ماہنامہ ''کتاب نما'' میں جولائی 1998ء میں شائع ہوا ہے۔

5۔ نوآبادیاتی ہندوستانی انگریزی ادب:

عبدالستاردلوی کا یہ مضمون دراصل انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے۔اورانگریزی مضمون اس مجموعہ مضامین کا پیش لفظ ہے جو ہندوستانی انگریزی کے شاعرنسیم ایزیکل کے اعزاز میں ترتیب دیا گیا تھا یہ اردو ترجمہ بعد میں ماہنامہ ''کتاب نما'' میں جولائی 1999ء میں شائع ہوا ہے۔

6۔ گاندھی جی کی تعلیمات اورعصری معنویت:

عبدالستاردلوی نے اپنے اس مضمون میں گاندھی جی کی مختلف تعلیمات کی معنویت کوعصر حاضر میں دکھایا ہے۔جوسہ ماہی ''ہندوستانی زبان'' میں اکتوبر۔دسمبر 2001ء میں شائع ہوا ہے۔

7۔ ہندومصر کے تعلقات اوراردو:

عبدالستاردلوی نے اس پورے مضمون میں عربی میں اردوقواعد' مصر میں اردو سے دلچسپی، مصر میں اردو تحقیق اورمصر میں اردوشاعری سے دلچسپی اوراقبال جیسے زاویوں سے مصر میں اردوکوپیش کیا ہے۔ یہ مضمون ماہنامہ ''آج کل'' میں اگست 2001ء میں شائع ہوا ہے۔

8۔ سردارجعفری اورقومی شعور:

عبدالستاردلوی نے مضمون ''سردارجعفری اورقومی شعور'' میں سردارجعفری کی شاعری میں قومی شعوراورمشترکہ

تہذیب وحب الوطنی کے عناصر کو پیش کیا ہے۔ یہ مضمون ماہنامہ ''کتاب نما'' میں جنوری 2003ء میں شائع ہوا ہے۔

9۔ یوسف ناظم کا سفر نامۂ امریکہ:

عبدالستار دلوی نے ''یوسف ناظم کے سفر نامۂ امریکہ'' پر تنقیدی و تفصیلی مضمون لکھا تھا جو ماہنامہ ''شگوفہ'' کے یوسف ناظم نمبر جون 2004ء میں منظر عام پر آیا۔

10۔ نظیر اکبر آبادی ایک روشن فکر عوامی شاعر:

عبدالستار دلوی نے اس مضمون میں نظیر کی شاعری سے مثالیں پیش کرتے ہوئے انھیں ایک عوامی شاعر ثابت کیا ہے جو ماہنامہ ''ایوان اردو'' میں نومبر 2012ء میں شائع ہوا ہے۔

11۔ نورانی باجی:

نورانی باجی دراصل ایک شخصی خاکہ ہے جس کی ممدوح محترمہ نورالعین علی صدیقی ہے۔ یہ خاکہ ماہنامہ ''سب رس'' میں مئی 2012ء میں شائع ہوا ہے۔

12۔ پروفیسر احتشام حسین: یادوں کے نگار:

عبدالستار دلوی کا یہ مضمون دراصل پروفیسر احتشام حسین سے وابستہ یادوں پر مبنی ہے جو ماہنامہ ''ایوان اردو'' میں جولائی 2012ء میں شائع ہوا ہے جو احتشام حسین نمبر ہے۔

13۔ میرؔ کی غزل: جلال و جمال کی شاعری:

عبدالستار دلوی کا یہ پورا مضمون میرؔ کی غزلیہ شاعری میں تصور عشق کا ترجمان ہے جو میرؔ کی مثنویوں کا بھی حصہ ہے۔ یہ مضمون ماہنامہ ''کتاب نما'' ستمبر 2012ء میں شائع ہوا ہے۔ یہ تنقیدی مضمون میر کی غزل گوئی اور

خاص کر میؔر کے عشق حقیقی وعشق مجازی کو سمجھنے میں مدد کرتا ہے اور حوالہ جاتی اہمیت رکھتا ہے۔

14۔ مہاتما گاندھی: سماجی ولسانی انصاف پسندی اور احمد شوقی:

عبدالستار دلوی نے اس مضمون میں گاندھی جی اور ان کی انصاف پسندی بالخصوص لسانی انصاف پسندی کا ترجمہ دیا ہے جو انہوں نے گاندھی جی کے مصر سے ہوتے ہوئے انگلستان جانے کے موقع پر کہی تھی۔ یہ مضمون ماہنامہ ''ایوان اردو'' میں مارچ 2013ء کے شمارے میں شامل ہے۔

15۔ مولانا عبدالماجد دریابادی:

عبدالستار دلوی نے اپنے اس مضمون میں مولانا عبدالماجد دریابادی کی شخصیت اور تصانیف کو بیان کرتے ہوئے آپ کی تنقید کو تاثراتی قرار دیا ہے۔ اور اکبؔر پر آپ کی تصنیف کا خصوصی ذکر کیا ہے۔ آپ کے مطابق مولانا عبدالماجد دریابادی دو شخصیات سے متاثر ہیں۔ اکبر الہ آبادی اور محمد علی جوہر۔ آپ کا یہ مضمون ماہنامہ ''اردو دنیا'' میں ستمبر 2013ء میں شائع ہوا ہے۔

16۔ پروفیسر سنیتی کمار چٹر جی:

عبدالستار دلوی نے اس مضمون میں پروفیسر چٹر جی سے اپنے ذاتی تعلقات اور ملاقاتوں کو تفصیلی طور پر بیان کیا ہے۔ اور اس بیان میں پروفیسر چٹر جی کی تصانیف، علمی تبحر، تقاریر اور نظریات وغیرہ کا احاطہ کیا ہے۔ دراصل یہ مضمون پروفیسر چٹر جی کی شخصیت کو قریب سے جاننے اور دیکھنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ جو سہ ماہی ''فکر ونظر'' میں ڈسمبر 2014ء کے شمارے کا حصہ ہے۔

17۔ طالب خوندمیری: اردو طنز ومزاح کا خوش فکر شاعر:

عبدالستار دلوی نے طنز ومزاح کی روایت کو غالبؔ، اکبؔر اور اقبالؔ کے یہاں پس منظر کے طور پر بیان کیا

ہے اور غالبؔ کے اشعار کی تضمین جو طالب نے لکھی ہیں ان کا سید محمد جعفر کی تضمین سے تقابل کر کے دکھایا ہے۔ اس کے علاوہ طالب کے پیروڈی اور مزاحیہ نظموں کا بھی جائزہ لیا ہے۔ یہ مضمون ماہنامہ ''سب رس'' کے مارچ 2015ء شمارے میں شامل ہے۔

18۔ معین احسن جذبی کی ایک غیر مطبوعہ نظم ''آج کی شام'':

جذبی نے اپنی ایک نظم ''آج کی شام'' اپنے ایک خط میں اپنے دوست حسن نعیم کو لکھی تھی جو جذبیؔ کے کسی بھی مجموعے کلام کا حصہ نہیں ہے۔ یہ مذکورہ نظم حسن نعیم نے عبدالستار دلوی کے حوالے کی تو انہوں نے اسے جذبی کے تعارف کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔ جو ماہنامہ ''سب رس'' اپریل 2015ء کے شمارے میں شامل ہے۔

19۔ جسٹس بدرالدین طیب جی ایک عہد آفریں شخصیت:

عبدالستار دلوی نے اپنے اس مضمون میں طیب جی، بدرالدین جی، قمرالدین طیب جی اور محمد علی دو گھے کی خدمات کا احاطہ کیا ہے۔ جس میں بالخصوص بدرالدین طیب جی کی ولادت، تعلیم، انگلستان کے قیام، انجمن اسلام کے قیام وفروغ، بال گنگادھر تلک اور بدرالدین طیب جی کے فیصلے کے ساتھ ساتھ اور مختلف علمی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔ یہ مضمون جہاں بدرالدین طیب جی سے متعلق معلومات فراہم کرتا ہے وہیں مسلمانانِ بمبئی کی تاریخ بھی بیان کرتا ہے۔ یہ مضمون ''سہ ماہی ''نوائے ادب'' میں اپریل تا ستمبر 2016ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔

20۔ ماہرِ تعلیم پرنسپل ڈاکٹر محمد بذل الرحمٰن:

عبدالستار دلوی کا یہ مضمون ڈاکٹر محمد بذل الرحمٰن کے ساتھ ساتھ ان کے والد مولوی خلیل الرحمٰن اور دیگر بھائیوں کی بھی علمی خدمات اور فتوحات بیان کرتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر محمد بذل الرحمٰن کے ذیل میں ان کی تعلیم، ملازمت بالخصوص پرنسپل اسماعیل یوسف کالج اور شخصیت پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ یہ مضمون ''نوائے ادب'' کے شمارے اکتوبر 2015ء تا مارچ 2016 میں شامل ہے۔

21۔ مولانا آزاد کی فکر کے چند تکثیری زاویے:

عبدالستار دلوی نے اپنے اس مضمون میں مولانا ابوالکلام آزاد کی فکر کے تکثیری زاویے جیسے اردو ادیب ہونے کے باوجود سرکاری زبان ہندی اور دوسری مقامی زبانوں سے متعلق، ان کی انفرادیت کے حق کو تسلیم کرنا، اسلامی کلچر سے قریب ہونے کے باوجود ہندوستان کے دوسرے مذاہب سے ہمدردانہ رویہ رکھنا اور بالخصوص ہندی کو سرکاری زبان کا درجہ دینے پر اسے قبول کر لینا مگر اپنی زبان اردو کو بھی سرکاری موقف دلانے کی حتی المقدور کوشش کرنا وغیرہ وغیرہ پہلوؤں کو مثالوں سے ثابت کیا ہے۔ آپ کا یہ مضمون ششماہی ''ادب وثقافت'' کے ستمبر 2016ء کے شمارے کا حصہ ہے۔

22۔ حمایت بھائی: حیدرآباد کی رونق:

عبدالستار دلوی کا مضمون ''حمایت بھائی: حیدرآباد کی رونق'' دراصل یادوں پر مبنی جو انہوں نے حمایت بھائی اور خاص حیدرآباد کے حوالے سے قلم بند کیں ہیں۔ اور اسی ذیل میں دکنی شاعری بالخصوص دہقانی شاعری پر اظہار خیال کیا ہے۔ یہ مضمون جون 2017ء کے ماہنامہ ''شگوفہ'' میں شائع ہوا ہے۔

23۔ بنگالی ادب کے اردو تراجم اور ٹیگور شناسی:

عبدالستار دلوی نے اپنے اس مضمون میں بنگال ادب کے جتنے اردو تراجم ہوئے ہیں ان کے پس منظر میں شمیم طارق اور ٹیگور شناسی کا مطالعہ اور شمیم طارق کو سارق اور ٹیگور شناسی کو سرقہ قرار دیا ہے۔ یہ مضمون پہلے روزنامہ منصف میں 17 مارچ 2016 میں ماہنامہ تحریر نو میں شائع ہوا ہے۔

24۔ تحقیق، تنگ نظری اور توصیف باہمی

(گیان چند جین اور کالی داس گپتا رضا کے حوالے سے)

عبدالستار دلوی نے اس مضمون میں گیان چند جین اور کالی داس گپتا رضا کی تحقیق میں تنگ نظری اور

توصیف کو مدلل انداز میں بیان کیا ہے۔ جس کے لیے آپ نے اندازِ بیان بھی سخت اختیار کیا ہے۔ یہ مضمون ''اثبات'' کے شمارے 4،5 میں شائع ہوا ہے۔

25۔ دکنی شاعری میں عشق رسول:

عبدالستار دلوی نے اپنے اس مضمون میں دکنی شعراء بالخصوص میراں جی شمس العشاق، ابراہیم عادل شاہ، عبدل، قلی قطب شاہ، وجہی، غواصی، ابن نشاطی اور نصرتی کے کلام میں عشقِ رسول یا نعتیہ کلام کو پیش کیا ہے۔ جو سہ ماہی ''ادب وثقافت'' میں مارچ 2018ء کے شمارے میں شامل ہے۔

موضوع ''تعلیم'' سے متعلق مضامین

26۔ اردو یونی ورسٹی کیوں اور کیسے؟

عبدالستار دلوی نے اپنے اس مضمون میں اردو یونی ورسٹی کیوں؟ کے تحت اردو کے ماضی اور صورت حال کو تفصیلی طور پر بیان کیا ہے اور کیسے کے تحت یونی ورسٹی کے لیے مختلف تجاویز پیش کی ہیں جن سے مسلمانوں بالخصوص اردو زبان کو فروغ حاصل ہو۔ آپ کا یہ مضمون ماہنامہ ''کتاب نما'' میں نومبر 1994ء میں شائع ہوا ہے۔

27۔ اردو میں اعلیٰ تعلیم مسائل اور حل:

عبدالستار دلوی نے اپنے اس مضمون میں اردو کے طلبہ اور اساتذہ دونوں کے مسائل اور حل تجویز کیے ہیں جن کو اگر مان لیا گیا تو اردو میڈیم سے تعلیم یافتہ طلبہ بھی آج کے مقابلہ جاتی دور میں بھی ملازمتیں حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے ان طلبہ کو کڑی محنت اور اساتذہ کو ان کی رہنمائی کرنا ضروری ہے۔ تب کہیں جا کے اردو طلبہ کا معیار بلند ہوگا۔ آپ کا یہ مضمون ماہنامہ ''اردو دنیا کے جنوری 2001 کے شمارے کا حصہ ہے۔

28۔ اردو یونی ورسٹی،فروغ اردواوراعلیٰ تعلیم:

عبدالستاردلوی نے یہ پورا مضمون مولانا آزادنیشنل اردو یونی ورسٹی کے حوالے سے لکھا ہے اور بتایا ہے کہ یونی ورسٹی کس طرح اردوکوفروغ دے سکتی ہےاورکس طرح اعلیٰ تعلیم یعنی Technical Courses چلا سکتی ہے۔تا کہ ہمارے طلبہ اردو ذریعہ تعلیم ہی سے ان کورسس کی تعلیم حاصل کر سکے اور مسابقتی دوڑ میں آگے بڑھ سکیں۔آپ کا یہ مضمون ماہنامہ ''کتاب نما'' نومبر 2001 کے شمارے میں شامل ہے۔

29۔ جدید تعلیم،عصری ضرورتیں اوراردو:

عبدالستاردلوی نے اس مضمون میں روایتی تعلیم،انگریزوں کی آمد کے بعد تبدیلیاں اورآزادی کے بعد کی تبدیلیاں کا جائزہ لیا ہےاور یہ بتایا ہے کہ ہمارے طلبہ اعلیٰ تعلیم میں ایک ہی شعبے سے مخصوص ہوکررہ گئے ہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے بلکہ طلبہ کواپنے شعبے کے علاوہ دوسرے شعبوں کا بھی بنیادی علم تو ہونا ہی چاہیے۔ورنہ وہ پیچھے رہ جائیں گے۔یہ مضمون ماہنامہ ''اردودنیا'' میں مارچ 2007ء میں شائع ہوا ہے۔

30۔ مہاراشٹر میں اردو کی اعلیٰ تعلیم:

عبدالستاردلوی نے پیش نظر مضمون میں مہاراشٹر میں اردو کی اعلیٰ تعلیم کو بتاتے ہوئے اسماعیل یوسف کالج کی مختصر تاریخ بیان کی ہے۔جس سے اس کالج کی خدمات کا اندازہ ہوتا ہے۔یہ مضمون ماہنامہ ''اخباراردو'' میں اگست 2007ء میں شائع ہوا ہے۔

4.3۔ عبدالستاردلوی کی ترجمہ کردہ کتب (بہ حیثیت مترجم):

لفظ ''ترجمہ'' کے لغوی معنی ''ایک زبان کودوسری زبان میں بیان کرنا'' ہے۔اوراگراصطلاحی معنی دیکھیں تو ترجمہ ایک ایسافن ہے جس میں ایک زبان کے متن کودوسری زبان میں منتقل کیا جاتا ہے۔جس میں اصل متن کے

جسم کے ساتھ ساتھ روح بھی منتقل ہونی چاہیے۔ ورنہ ترجمہ کامیاب نہیں کہلائے گا۔ اور عبدالستار دلوی ''اردو ترجمہ: آداب و مسائل، ایک مکالمہ'' میں محرک ''اشعر نجمی'' کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فن ترجمہ کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

> ''ترجمہ محض ایک زبان کے ادب پارے کا لفظوں/ لغت کی مدد سے دوسری زبان میں منتقل (Transfer) کرنے کا عمل نہیں ہے۔ ترجمہ لفظوں کو نہیں معنی کے تبادلے کا فن ہے۔''

(سہ ماہی ''اثبات''، ممبئی، شمارہ۔6، ص: 121-120)

محمد حسین پرکار فن ترجمہ پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے اس کی تعریف کرتے ہیں:

> ''فن ترجمہ نگاری بہ ظاہر آسان معلوم ہونے والا فن ہے۔ لیکن یہ اس قدر مشکل فن ہے کہ کوئی بھی انصاف پسند ترجمہ نگار اپنے ترجمے سے سو فیصد مطمئن نہیں ہوسکتا۔ ترجمے کی جس خوب صورتی کو قاری محاسن سمجھتا ہے وہ مترجم کی نگاہ میں معائب ہوتے ہیں۔ اس کا موازنہ مصوری سے کیا جائے تو بات واضح ہوجاتی ہے۔ مصور اپنے شیدائیوں سے خراج تحسین تو پاتا ہے لیکن دل کے کسی کونے میں اسے یہ بات کھٹکتی رہتی ہے کہ تصویر تو بن کر تیار ہوگئی لیکن فنکارانہ صلاحیتوں کی نشاندہی نہ ہوسکی۔ یعنی فنی اعتبار سے کچھ خامیاں ضرور رہ گئی ہیں۔ ایک بار ایک نمائش میں ایک مصور نے انگور کی بیل کی تصویر پیش کی۔ تصویر اس قدر خوب صورت تھی کہ انسان کی آنکھ تو کیا پرندے بھی دھوکا کھا گئے اور آکر اس پر چونچیں مارنے لگے اس منظر کو دیکھنے کے لیے تماشائیوں کا تانتا لگ گیا۔ نقادوں نے فنکار کا ردعمل جاننے کی کوشش کی تو اس نے کہا آپ جسے تصویر کی کامیابی تصور کررہے ہیں۔ وہی دراصل میرے فن کی ناکامی ہے۔ یہیں پر آکر میرے فن

> نے دم توڑ دیا ہے۔ یہی حال ترجمہ نگار کا بھی ہے قاری کو اگر ترجمے پر اصل ہونے کا یقین ہوجائے تو یقیناً وہ ناکام ترجمہ ہے اور اصل ہونے کا گمان ہوجائے تو صلاحیتوں سے مزین ہے۔''

(ماہنامہ ''کتاب نما'' پروفیسر عبدالستار دلوی نمبر، مضمون ''مراٹھی کے اردو ترجم اور پروفیسر عبدالستار دلوی کی خدمات''، فروری 2006ء، ص:60)

عبدالستار دلوی اور محمد حسین پرکار نے جو ''ترجمے'' کی تعریفیں کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مترجم کو ترجمے کے دوران الفاظ کے ساتھ ساتھ معنی و مفہوم کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ وہیں دوسری طرف قاری کو صرف گمان ہوجائے کہ ترجمہ اصل تخلیق ہے تو وہ ترجمہ کامیاب ہے لیکن اگر قاری کو یقین ہوجائے کہ ترجمہ اصل تخلیق ہے تو وہ مترجم کی ناکامی کی دلیل ہے۔

ترجمے کی تعریف کے بعد یہ بھی جان لینا ضروری ہے کہ آیا ترجمہ تخلیقی عمل ہے یا میکانکی؟ تو اس سے متعلق بعض نقادوں اور مترجمین کا خیال ہے کہ ترجمہ میکانکی عمل ہے کیوں کہ یہ نہ تو مترجم کی اختراع و ایجاد ہوتی ہے اور نہ ہی مترجم کے تخیل کی پرواز ہوتی ہے۔ مگر الفاظ کے انتخاب اور اسلوب سے متعلق جو کوششیں مترجم کرتا ہے اس کو صرف اسی کا کریڈٹ ملتا ہے۔ بقیہ تمام حقوق بہ حق مصنف محفوظ ہوتے ہیں لیکن بعض نقادوں اور مترجم کے نزدیک ترجمہ ایک تخلیقی عمل ہے کیوں کہ ہمارے اردو ادب کا بیشتر ابتدائی حصہ ہندوستانی دیومالائی اور عربی و فارسی قصے و کہانیوں سے ماخوذ ہیں مگر ہمارے ادیب و شاعروں نے اپنی فنکارانہ و تخلیقی صلاحیتوں سے اسے اس طرح پیش کیا ہے کہ ان پر ترجمے کا نہیں اصلی تخلیق کا گمان ہوتا ہے اور اس سلسلے میں اردو کی متعدد مثنویوں، داستانوں کے ساتھ ساتھ محمد حسین آزاد کے ''نیرنگ خیال'' کو بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔

ترجمے کے میکانکی یا تخلیقی عمل ہونے سے متعلق دونوں گروہوں کے خیالات جان لینے کے بعد یہی کہا جا سکتا ہے کہ ترجمہ میکانکی عمل ہے یا تخلیقی۔ اس کا پورا دارومدار مترجم پر ہے کیوں کہ اگر وہ صرف لغت کی مدد سے الفاظ کا ترجمہ کرے گا تو ایسا ترجمہ میکانکی عمل یا میکانکی ترجمہ کہلائے گا اور اگر مترجم الفاظ کے ساتھ ساتھ معنی و مفہوم

اوراسلوب وغیرہ کا بھی خیال رکھے گا تو ایسے ترجمے پر تخلیق کا بھی گمان ہوسکتا ہے۔ایسی صورت میں ترجمہ تخلیقی عمل یا تخلیق سے قریب ترجمہ کہلائے گا۔

ترجمے کی اہمیت اصل تخلیق سے کم سہی مگر اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بھی ہندوستان جیسے کثیر لسانی اور کثیر تہذیبی ملک میں یہاں اگر ہم اپنی مقامی زبانوں سے تراجم نہیں کریں گے تو ایک دوسرے کے ادبیات اور تہذیبوں سے کیسے واقف ہوں گے۔ کیوں کہ ترجمہ ہی وہ واحد ذریعہ ہے جو ایک زبان اور اس سے متعلق ادب کو دوسری زبان میں منتقل کر کے دوسروں کو اس مخصوص زبان وادب سے روشناس کرواتا ہے۔اور اسی لیے مترجم کو قومی یکجہتی کا سفیر کہا گیا ہے۔

4.3.1۔ مراٹھی ناولوں کا اردو ترجمہ:

ترجمے کے معنی، مفہوم اور اہمیت کے بعد اب آیئے یہ بھی دیکھتے چلیں کہ ترجمے کے دوران سب سے اہم مرحلہ کونسا ہوتا ہے؟ ترجمہ میں سب سے اہم مرحلہ، ترجمہ کے لیے کتاب یا فن پارے کا انتخاب ہوتا ہے۔اور اس مرحلے کو مراٹھی اور اردو تراجم کے پس منظر میں محمد حسین پرکار اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ’’ترجمے کے لیے سب سے اہم بات کتاب کا انتخاب ہے ترجمے کے لیے وہی کتاب قابل انتخاب سمجھی جاتی ہے۔جس کی حیثیت اس کی اصل زبان میں شاہکار کی ہو اور جس زبان میں ترجمہ کیا جارہا ہو۔ اس زبان کے لیے قابل قدر اضافے کا درجہ رکھتی ہو............یقین ہے میرے ترجمہ نگار ساتھی مجھ سے اس بات پر اتفاق کریں گے،ہمیں پہلے صرف مراٹھی کی نمائندہ ادبی تخلیقات کو اردو میں منتقل کرنا ہے اور اس ذمہ داری کی تکمیل کے بعد روایتی ادب کے چند نمونے بھی پیش کردیں تو ادبی ناانصافی نہ ہوگی۔‘‘

(ماہنامہ ’’کتاب نما‘‘ پروفیسر عبدالستار دلوی نمبر، مضمون ’’مراٹھی کے اردو تراجم اور پروفیسر عبدالستار دلوی کی خدمات‘‘ فروری 2006ء،ص:61)

محمد حسین پرکار کے بیان کی روشنی میں ناولٹ '' ساوتری'' کو دیکھیں تو مراٹھی ناولٹ ''ساوتری ''(1962ء) پروفیسر پرشوتم شیورام ریگے کی تخلیق ہے (جو 1939ء یعنی دوسری جنگ عظیم کے پس منظر میں لکھا گیا ہے) دراصل یہ ناولٹ مراٹھی ادب میں شاہکار کا درجہ رکھتا ہے اور جب عبدالستار دلوی بہ حیثیت صدر شعبہ اردو وکرشن چندر'' پروفیسر بمبئی یونی ورسٹی کے عہدے پر فائز ہوئے تو انہوں نے شعبے کے قیام کے چند مقاصد میں سے ایک مقصد'' مراٹھی اور اردو کو قریب لانا'' کے پیش نظر'' ناولٹ'' ساوتری'' کا اردو میں ترجمہ کیا اور شعبے کے'' اردو نامہ'' پروگرام کے تحت اسے 1986ء میں زیور طباعت سے آراستہ کیا ہے۔ ان سطور سے واضح ہوجاتا ہے کہ عبدالستار دلوی بھی محمد حسین پرکار کے متذکرہ بالا بیان میں پیش کیے گئے خیالات سے متفق ہیں۔ اتفاق رکھتے ہیں کہ اردو اور مراٹھی زبان وادب کو قریب لانے کا ایک اہم ذریعہ ترجمہ ہے اور اس ذریعے کو موثر بنانے کے لیے مترجمین کو پہلے صرف مراٹھی کی نمائندہ تخلیقات کو اردو کے قالب میں ڈھالنا ہوگا اور محمد ایوب واقف بھی مندرجہ ذیل اقتباس میں محمد حسین پرکار اور عبدالستار دلوی کے ہم نوا نظر آتے ہیں:

> ''پرشوتم شیورام ریگے مراٹھی ادب کا بہت جانا پہچانا نام ہے۔ مراٹھی ادب کے سربرآوردہ فنکار کی حیثیت سے لوگ باگ ان کا اعتراف کرتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی صاحب نے جب مراٹھی کے شاہکاروں کا اردو کا جامہ پہنانا شروع کیا تو ان کی نظر انتخاب پرشوتم ریگے پر بھی پڑی۔''

(ممبئی کے ساہتیہ اکاڈمی انعام یافتگان، شاعر، ادیب اور مترجم، ص:183)

مندرجہ بالا گفتگو سے ہم یہی نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ ترجمہ کرتے وقت مترجمین کے پیش نظر یہی خیال رہتا ہے کہ ہمیں پہلے اصل زبان میں موجود ادبی شہکاروں کو ترجمے کا جامہ پہنانا ہوگا۔ اسی نقطۂ نظر کے تحت عبدالستار دلوی نے بھی جب ترجمے کے لیے انتخاب کتاب کے مرحلے میں مراٹھی ناولوں کا مطالعہ کیا تو انہوں نے پایا کہ پرشوتم شیورام ریگے مراٹھی ناول نگاری میں ایک منفرد مقام کے حقدار ہیں اور ان کو یہ مقام دلانے والا ناول

''ساوتری'' ہے۔اب اس جگہ رک کر پرشوتم شیورام ریگے اورناول ''ساوتری'' کے متعلق جان لینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔

پروفیسر پرشوتم شیورام ریگے:

پروفیسر پرشوتم رام ریگے (2/اگسٹ 1910 سے 17/فروری1978) آپ نے الفنسٹن کالج بمبئ اورلندن اسکول آف اکنامکس سے اکنامکس (معاشیات) کی تعلیم پائی اورایک کے بعد دیگر اسماعیل یوسف کالج بمبئ اورالفنسٹن کالج بمبئ میں پرنسپل کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔مگر آپ کی تصانیف علم معاشیات کے علاوہ مراٹھی میں ناول، افسانہ، ڈرامااورشاعری یعنی ادبی تخلیقات ہیں۔جن کومراٹھی زبان وادب میں قدرومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

4.3.1.1.1۔ ناول:ساوتری:

ناول ''ساوتری'' ایک رومانی ناول ہے اس کا مرکزی کردار ''ساوتری'' ہے۔ جس کو دوسرے کردار ''ساؤ'' کہہ کر بلاتے ہیں۔اس کی والدہ اس کی پیدائش کے وقت ہی فوت ہوچکی تھی جس کے بعد اس کے آپا (جوایک ماہر تعلیم ہیں) اس کی پرورش کرتے ہیں۔ایک انگریز کردار ''ایجورتھ'' ہے جو آپا کا آکسفورڈ میں ساتھی تھا اب وہ یہی تروپیٹ،کورک، میں تمام مقامی افراد کے ساتھ مل جل کر رہتا ہے۔مگر اس نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے اور وہ ساؤ سے کہتا ہے کہ پچھلے جنم میں وہ کورکی تھا اسی لیے اس جنم میں کورک کے لوگوں میں گھل مل گیا ہے اورآنے والے جنم میں جاپانی لڑکی بن کر پیدا ہوگا۔ساؤ کا یونی ورسٹی میں ابھی ابھی داخلہ ہوا ہے۔اوراس کا محبوب پوسٹ گریجویٹ کا طالب علم ہے اوراب اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ جارہا ہوتا ہے۔اسی دوران ساؤ کے آپا کو جاپان میں آنند مشن میں لیکچرس دینے کا موقع ملتا ہے تو وہ اپنے آپا کے ساتھ جاپان چلی جاتی ہے۔اوراس کا محبوب انگلینڈ بعد کے کچھ دنوں میں دوسری عالمی جنگ شروع ہوجاتا ہے تو ملاقات تو دور کی بات خط وکتابت بھی مشکل ہوجاتی

ہے۔ دوسری طرف مسلسل کام کرنے کی وجہ سے ساوَ کے آپا کی طبیعت بگڑنے لگتی ہے اور آخر کار وہ فوت ہو جاتے ہیں تب ساوَ اکیلی پڑ جاتی ہے مگر وہ اس اکیلے پن کو ختم کرنے کے لیے ایک ملٹری ہاسپٹل میں نرس کی نوکری کر لیتی ہے۔ جہاں کے ڈاکٹر سین ایک جھٹکے میں لا پتہ ہو جاتے ہیں تو ان کی جاپانی نرس بیوی صدمے کی وجہ سے قبل از وقت زچگی ہوئی ہے۔ جس میں اس کی موت ہو جاتی ہے۔ مگر وہ اپنی بیٹی بینا کو ساوَ کے ہاتھ سونپ جاتی ہے۔ اب ناول کی کہانی 8 سال 9 ماہ کے بعد اپنے اختتام پر ہے جہاں ساوَ اپنی آپا کا غیر مطبوعہ کلام یکجا کر کے شائع کروانے میں جٹی ہوئی ہے۔ بینا آٹھ سال کی ہو گئی ہے اور ساوَ کورک میں راجماں اور بینا کے ساتھ خوشحال زندگی گزار رہی ہے۔ ہندوستان آزاد ہونے والا ہے۔ ایسے میں ساوَ کو آٹھ سال بعد اس کے محبوب کا خط ملتا ہے جس میں اس نے اظہار محبت کیا ہے تو ساوَ جوابی خط میں لکھتی ہے۔ کہ آپ کو مجھے اغواہ کر کے لے جانا چاہیے تھا کوئی بھی لڑکی اپنی پیدائش سے اپنے والدین کو چھوڑ جانے کے لیے تیار ہی رہتی ہے۔ ایسے میں وہ اپنے خط میں کورک آنے کی اطلاع دیتا ہے جس پر ساوَ کہتی ہے کہ وہ راجمان کی مور ناچ والی کہانی کو ڈرامے کی طرح پیش کرنے والی ہے جس میں خود راجمان کا کردار ادا کرے گی۔ بینا ننھی بنے گی اور آپ کو مور بن کر ناچنا ہوگا اور اس ڈرامے کی پیش کش کے لیے جو دن متعین ہے وہ 15 / اگست 1947ء ہے۔

مکمل ناول کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے ساوَ ایک خود اعتماد لڑکی ہے جو اپنے ہر خیال کو نہایت ہی خود اعتمادی کے ساتھ پیش کرتی ہے اتنا ہی نہیں وہ اپنی پیدائش سے ہی اپنے آپا کے سائے میں رہی ہے مگر جب وہ بھی چل بسی تب بھی ساوَ اپنی خود اعتمادی ہی کے سہارے اس صدمے سے بھی ابھر آتی ہے۔ اور اپنے محبوب کے اظہار محبت پر حامی بھی بڑے خود اعتماد لہجے میں بھری ہے۔

عبدالستار دلوی کو ترجمہ شدہ ناول ''ساوتری'' دورانِ مطالعہ کبھی گراں بار نہیں گزرتا کیوں کہ چھوٹے چھوٹے فقرے اور جملوں نے اس میں لطافت پیدا کر دی ہے جو اصل میں مراٹھی کی خصوصیت ہے۔ ناول کی مکمل کہانی آٹھ سال نو مہینے کے طویل عرصے پر محیط ہے۔ مگر کہیں بھی واقعات، طرز بیان اور الفاظ میں الجھاوَ نہیں ہے

اسی لیے محمد حسین پر کار ناول ''ساوتری'' کے اصل اور ترجمے دونوں کا تقابل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ساوتری کے مصنف پروفیسر پروشوتم شیورام اور اس کے مترجم ڈاکٹر عبدالستار دلوی سے میرا علمی، ادبی، ذہنی رشتہ ہے۔ میں نے اصل تصنیف اور ترجمہ دونوں کا بہ حیثیت قاری مطالعہ بعد کیا ہے تاکہ جب میں اپنی رائے لکھوں تو مصنف اور مترجم دونوں کے ساتھ انصاف کرسکوں۔ ساوتری کے مراٹھی ادب کی شاہکار تصنیف ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا اس کی ادبی حیثیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ لیکن اردو ادب کی خوش قسمتی ہے کہ اس نمائندہ تصنیف کو اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے ترجمے میں ادبی ایمانداری کا ثبوت دیا ہے۔ انہوں نے نہ صرف دونوں زبانوں کی ادبی روایتوں کو برقرار رکھا ہے بلکہ مراٹھی کے ان چھوٹے چھوٹے فقروں، لفظوں، ترکیبوں اور جملوں کو جن میں ایک حسن شعریت و نغمگی ہوتی ہے اور جس کا متبادل ڈھونڈنے میں ہوش اڑ جاتے ہیں۔ انتخابی خوب صورتی سے اردو کے قالب میں ڈھال کر اپنے ذولسانی ہونے اور اس میں مہارت رکھنے کا ثبوت دیا ہے۔ ان باریکیوں کو وہی سمجھ سکتا ہے جو مراٹھی زبان جانتا ہو اور جس نے اس ادب کا مطالعہ کیا ہے۔''

(ماہنامہ ''کتاب نما''، پروفیسر عبدالستار دلوی نمبر، مضمون: مراٹھی کے اردو تراجم اور پروفیسر عبدالستار دلوی کی خدمات، فروری 2006ء، ص: 60)

محمد حسین پر کار کے مصداق عبدالستار دلوی نے ترجمے میں مراٹھی زبان کی مختلف خوبیوں کو بھی نہایت خوب صورتی سے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے جو ایک مشقت طلب کام ہے اور جس کو عبدالستار دلوی جیسی دقت پسند شخصیت ہی سرانجام دے سکتی ہے۔

4.3.1.1.2۔ رن آنگن:

''رن آنگن''ایک مراٹھی ناول ہے جس کے خالق وشرام بیڈیکر ہیں۔دراصل ان کا پیدائشی نام وشواناتھ چنتامنی بیڈیکر ہے مگر اسکول میں اپنے دوست شری رام کھرے سے مثالی دوستی کی وجہ سے دونوں کے ناموں کو جوڑ کر وشرام کھرے سے مثالی دوستی کی وجہ سے دونوں کے ناموں کو جوڑ کر وشرام بیڈیکر اختیار کرلیا اور یہی ان کا ادبی وقلمی نام بن گیا۔

دراصل بیڈیکر 1939ء میں لندن سے سینمٹوگرافی کا کورسس کرکے دخانی جہاز سے ہندوستان واپس ہوئے۔اور یہی دخانی جہاز اور دوسری جنگ عظیم سے پیدا ہونے والے حالات کو ناول''رن آنگن'' کا پس منظر کہا جاسکتا ہے۔کیوں کہ اس سفر کے فوراًبعد انہی موضوعات پر مشتمل بیڈیکر کا شہکار ناول''رن آنگن'' شائع ہوا تو مراٹھی ادبی دنیا میں ایک انقلاب آ گیا کیوں کہ اس سے پہلے جو ناول تخلیق کیے جارہے تھے وہ روایتی انداز کے تھے اسی لیے اسے مراٹھی ناول نگاری میں سنگ میل کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا ہے۔

وشرام بیڈیکر(13 /آگسٹ 1906ء سے 30 /اکٹوبر 1998ء):

وشرام بیڈیکر کی بنیادی حیثیت ایک ڈرامہ نگار کی ہے اور انھوں نے چار اہم ڈرامے نہ صرف لکھے بلکہ اسٹیج بھی کیے جن کے نام یہ ہیں:

1۔ برہما کماری(Brahma Kumari)

2۔ نارووا کنجاروا(Naro wa Kunjaro Wa)

3۔ واجے پال اپولے(Waje Paul Apule)

4۔ تلک انی اگارکر(Tilak Ani Agarkar)

ان ڈراموں ہی کے ذریعے وہ فلموں تک آئے اور کئی مراٹھی فلموں کی ہدایت بھی دی ہے۔اتنا ہی نہیں

انہوں نے اپنی خودنوشت ''Ek Jhad ani Don Pakshi'' (ایک درخت اور دو پرندے) کے عنوان سے لکھی جس کو مراٹھی حلقوں میں خوب پسند کیا گیا۔مگر بیڈیکر کو مراٹھی ادب میں سب سے نمایاں مقام دلانے والا ان کا واحد ناول ''رن آنگن'' ہے جس کے خالق کی حیثیت بیڈیکر مراٹھی ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔اور عبدالستار دلوی نے اسے اردو میں ترجمہ کرنے کی کامیاب سعی کی ہے جو 1987 میں بمبئی یونی ورسٹی سے شائع بھی کیا ہے۔عبدالستار دلوی کی طرف سے ترجمہ کے لیے ''رن آنگن'' کے انتخاب سے متعلق محمد ایوب واقف لکھتے ہیں:

> ''وشرام بیڈیکر بھی مراٹھی ادب کا بہت محترم اور تسلیم شدہ نام ہے۔دلوی صاحب کی نظر انتخاب ان پر بھی پڑی اور ظاہر ہے جب ذہن میں بیڈیکر کا نام آئے اور ان کی بے پناہ تخلیق ''رن آنگن'' سر نہ اٹھائے یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے چنانچہ وہی ہوا۔''

(ممبئی ساہتیہ اکادمی انعام یافتگان: شاعر،ادیب اور مترجم،ص:183)

کہانی:

''رن آنگن'' کی کہانی دخانی جہاز کے جینوا سے ممبئی تک کے سفر پر مشتمل گیارہ دنوں کی کہانی ہے جو چکر دھر عرف باب (ہندوستانی مراٹھی نوجوان) اور ہرٹا (جرمن یہودی لڑکی) کے ارد گرد گھومتی ہے۔باب اُما سے ملی محبت میں ناکامی کے بعد بدگمان ہوکر جینوا چلا جاتا ہے اور اب ایک سال بعد دخانی جہاز سے ممبئی لوٹ رہا ہے اور اسی جہاز پر اس کی ملاقات ہرٹا سے ہوتی ہے جو نازیوں کے ظلم وستم سے تنگ ہوکر ترک وطن پر مجبور ہوجاتی ہے۔اس کے علاوہ اس کا محبوب کارل فرائز ایک فوجی ہے مگر وہ ہرٹا کو ترک وطن کر دینے پر اس کی کوئی مدد نہیں کر پاتا اور کچھ دن بعد ہرٹا کو خبر ملتی ہے کہ کارل فرائز کی لاش جنگل میں برآمد ہوتی ہے۔جس کی وجہ سے وہ دل برداشتہ ہوچکی ہے۔ لیکن باب اور ہرٹا کی ملاقات جلد ہی دوستی میں بدل جاتی ہے اور پھر محبت کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔مگر ممبئی بندرگاہ پر ہرٹا کو انگریز دشمن تصور کرتے ہوئے یہاں رہنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ایسے میں باب بھی مایوس ہونے کے

علاوہ کچھ نہیں کر پاتا۔اور ہرٹا محبت میں ملی اس دوسری ناکامی کے بعد دخانی جہاز سے ہانگ کانگ کے سمندر میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لیتی ہے تو اب یہاں قاری کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہرٹا اپنے پہلے محبوب کی بے وفائی تو برداشت کر لیتی ہے مگر باب سے ملی محبت میں ناکامی برداشت نہیں کر پاتی۔کیوں؟ کیوں کہ دوسری بار باب سے ملی بے وفائی کے ساتھ ساتھ اسے ہندوستان میں داخلہ نہ ملنے پر بنیادی انسانی حقوق بھی چھن جانے کا صدمہ ہوتا ہے جو وہ برداشت نہیں کر پاتی۔دراصل یہ پوری کہانی دو تہذیبوں کی کہانی ہے جو اپنی اپنی شناخت کے ساتھ محبت کی تلاش میں ہے۔

مکمل ناول کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مترجم عبدالستار دلوی نے اپنے اس ترجمے میں کہانی کے ساتھ ساتھ فقروں، جملوں، محاوروں اور ضرب الامثال پر خصوصی توجہ دی ہے۔جس کے باعث قاری کو پڑھتے وقت یہ ناول میکانکی نہیں بلکہ تخلیقی ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔رن آنگن کے اردو ترجمے پر تبصرہ کرتے ہوئے سلام بن رزاق یوں اپنی رائے دیتے ہیں:

> ''پروفیسر عبدالستار دلوی نے اس شاہکار ناولٹ کو اردو کا لباس پہنانے میں کافی جانفشانی سے کام لیا ہے۔ترجمے میں نہ صرف زبان کا اعلیٰ معیار اور اسلوب کی انفرادیت برقرار ہے بلکہ داستان کی اصل روح بھی ترجمے کے قالب میں پوری طرح ڈھل گئی ہے۔اردو میں گاہے گاہے چند معیاری ناولوں کے تراجم ہوتے رہے ہیں۔رن آنگن بھی اردو ترجمہ کی روایت کی ایک اہم کڑی ہے۔''

(ماہنامہ ''سب رس'' حیدرآباد، اپریل 1989ء، ص:69)

مختصراً یہ کہ سلام بن رزاق کی رائے سے اتفاق کیا جاسکتا ہے کیوں کہ انہوں نے وہی کیا ہے جو ایک عمدہ ترجمے کو پڑھ کر ایک باشعور قاری محسوس کرتا ہے اور اس ترجمے کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ 1990ء میں ساہتیہ اکادمی دہلی نے اس پر عبدالستار دلوی کو ''ترجمہ'' ایوارڈ سے نوازا۔

4.3.1.1.3۔ اولوکتا:

پروفیسر پرشوتم رام ریگے کا دوسرا اہم ناول اولوکتا ہے۔ جس کو انہوں نے 1964ء میں مراٹھی ادب میں پیش کیا تو مراٹھی ادبی حلقوں میں اس کی خوب پذیرائی ہوئی۔ یہ ناول بتیس 32 ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کا موضوع ''تہذیب'' ہے اسی لیے اس ناول کے کردار الگ الگ ممالک کے باشندے ہونے کے باوجود اپنی اپنی تہذیبی شناخت قائم رکھتے ہوئے ایک ساتھ رہتے ہیں۔ جس کی خاص وجہ ان کا ایک ہی موضوع کا طالب علم ہوتا ہے۔ دراصل ریگے کے دو ناول ''ساوتری'' اور ''اولوکتا'' کا شمار جدید تخلیقات میں ہوتا ہے، مگر ناول ''ساوتری'' ایک عام قاری کو مطالعہ کے بعد آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے وہی ناول ''اولوکتا'' جدید تخلیقات کی طرح معما ہی بنا رہا ہے اسی لیے ایسے جدید یا جدیدیت کا نمائندہ ناول قرار دیا جاتا ہے اور یہی وجہ عبدالستار دلوی کے ترجمے کی محرک بنی۔ یہ ترجمہ 1988ء میں پہلی بار ''اردونامہ'' پروگرام کے تحت شعبہ اردو، بمبئی یونی ورسٹی سے شائع ہوا ہے۔

کہانی:

ناول ''اولوکتا''، بتیس ابواب پر مشتمل ہے، جو کرداروں کی دو سالہ تعلیمی زندگی کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس ناول کے کردار رائے (مصنف) مسز کائرز، مسز آسٹر فیلڈ، مسز سانڈرس، گرٹ روڈ، مسز پسنڈرس، مولا، مسٹر سٹین ہیں۔ ان کرداروں میں سے اکثر کردار طالب علم ہے جو مختلف ممالک کے باشندے ہیں۔ اپنی اپنی تہذیب کے نمائندے ہیں۔ مگر ان کو متحدہ رکھنے والی ایک وجد ان تمام کو موضوع ''تاریخ'' کے طالب علم ہونا ہے۔ اور ناول کی ابتدا و اختتام دونوں اسمتھ کی کتاب ''ارلی ہسٹری آف انڈیا'' (Early History of India) کے ذکر سے ہوتی ہے۔ جیسے ناول کے پہلے باب میں سکندر کے حملے کا نقشہ کھینچا گیا ہے وہ کتاب اور آخری باب میں (مصنف) رائے اور دوسرے کردار تعلیم کی تکمیل کے بعد اپنے اپنے وطن لوٹنے کی تیاری میں اپنے اپنے سامان سمیٹ رہے ہیں لیکن بہت کوشش کے باوجود ایک کتاب بوکس میں نہیں آئی اور یہ دونوں جگہ ذکر ایک ہی کتاب کا ہے۔ اور وہ ہے ''ارلی ہسٹری آف انڈیا''۔

ناول کے مطالعے کے بعد انکشاف ہوتا ہے کہ یہ ناول عام قارئین کے لیے نہیں ہے بلکہ ایک مخصوص طبقے کے لیے اور ادب کے مخصوص رجحانات سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ جس کے چلتے اس کے موضوع اور اسلوب نے بھی ایک مخصوص انداز اختیار کر لیا ہے۔ مگر اسلوب کی خاص بات یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے جملوں اور فقروں میں بات مکمل کر دی گئی ہے جو دراصل مراٹھی زبان کی خصوصیت ہے لیکن عبدالستار دلوی نے اپنے ترجمے میں اسلوب کی ان خصوصیات کا بطور خاص اہتمام کیا ہے۔ جس کی وجہ سے اس ناول پر ترجمہ ہوتے ہوئے بھی اصل تخلیق کا گمان ہوتا ہے۔ اولوکتا کی انہی خوبیوں سے متعلق محمد حسین پرکار کے خیالات ملاحظہ کیجیے:

> ''پروفیسر ریگے نے واقعات کو جس خوب صورت انداز سے چھوٹے چھوٹے جملوں میں بلکہ بعض اوقات چند لفظوں میں سب کچھ بیان کیا ہے وہ یقیناً ادب کا انمول حصہ ہے۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے بھی ترجمہ نگاری کے فرائض انجام دیتے ہوئے ساری ادبی ولسانی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے جس نفاست سے اسے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے وہ قابل ستائش ہے۔۔۔۔۔ ''اولوکتا'' موضوع اسلوب بیان اور کرداروں کے تعارف کے اعتبار سے کافی مشکل اور دانشورانہ صلاحیتوں کی عکاسی کرنے والی اور انھیں آزمانے والی تصنیف ہے۔ جو شاید عام قاری کو زبان و بیان کے مزے تو دے سکے گی لیکن ماڈرن آرٹ کی طرح معما ہی رہے گی۔ ایسی تصنیف کا ترجمہ یقیناً جان کنی سے کم نہیں۔''

(ماہنامہ ''کتاب نما''، دہلی مضمون، مراٹھی کے اردو تراجم اور پروفیسر عبدالستار دلوی کی خدمات، فروری 2006، ص:64-63)

محمد حسین پرکار کے اس خیال سے متفق ہونا پڑتا ہے کہ عبدالستار دلوی نے اولوکتا کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کے لیے خاص کر اسلوب سے متعلق لوازمات پر خصوصی توجہ دی ہے۔ جس کی وجہ سے ہی یہ ترجمہ ہوتے ہوئے بھی اصل تخلیق کا گمان ہوتا ہے۔

4.3.1.2۔ مراٹھی کہانیاں:

4.3.1.2.1۔ سات روپے دس آنے:

''سات روپے دس آنے'' پروفیسر این۔ایس پھڑ کے کی تخلیق ہے۔جس کو عبدالستار دلوی نے اردو کا جامعہ پہنا کر فروری 1985ء میں ماہنامہ ''کتاب نما'' دہلی سے شائع کروایا تھا۔اس کہانی کا مرکزی کردار جگل بابو ہیں۔جن کو ایک سو بیس روپے کی تنخواہ کے ساتھ سات روپے دس آنے کی زائد رقم اوور ٹائم کے باعث ملتی ہے تو ان سات روپے دس آنے کو کس طرح خرچ کیا جائے،خود اپنے لیے خرچ کیا جائے یا پھر بیوی بچوں پر خرچ کیا جائے۔ ایسے ہی کئی خیالات سے گزرنے کے بعد وہ ان روپیوں سے بیوی بچوں کے لیے مٹھائی لے آتے ہیں۔ جہاں کہانی اختتام پذیر ہو جاتی ہے۔دراصل یہ کہانی ہمیں منٹو کے افسانے ''گرم کوٹ'' کی یاد دلاتی ہے۔

4.3.1.2.2۔ انتہا:

''انتہا'' مراٹھی کہانی کا ترجمہ ہے جس کے تخلیق کار وینکٹیش ماڈگولکر ہیں۔ یہ کہانی ''سالے''قلم'' کی خصوصی اشاعت 8-7-6 میں شائع ہوئی تھی۔اس کا موضوع ''غربت'' ہے جس کو ذات پات کے فرق نے اور بھی متاثر کیا ہے۔ یہ پوری کہانی افسر اور راما چمار کے کرداروں ہی کے اردگرد گھومتی ہے۔

یہ دونوں کہانیاں ''غربت'' ہی کے موضوع پر لکھی گئی ہیں۔مگر اول الذکر میں ذات پات کا عنصر نہیں ہے جب کہ آخر الذکر کہانی اس عنصر کے باعث المیہ معلوم ہوتی ہے۔مگر یہ کہانیاں فرضی نہیں ہیں بلکہ ہمارے سماج کی حقیقت ہے جس کو مراٹھی کے دو مختلف کہانی کاروں نے کہانی کی شکل میں بیان کر دیا ہے۔حسین سے متاثر ہو کر عبدالستار دلوی نے ان کہانیوں کو ترجمے کے لیے انتخاب کیا اور بہ حسن خوبی انھیں عملی جامہ پہنایا۔اور ان ترجموں کے مطالعے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے ان ترجموں میں فن ترجمہ کے مختلف تقاضوں کو پورا کیا ہے۔

4.3.1.3۔ مراٹھی شاعری:

4.3.1.3.1۔ پسائدان:

مشہور مراٹھی سنت شاعر گیانیشور نے اپنی مایہ ناز کتاب گیانیشوری (گیتا کی تفسیر) کے اختتام پر دعائیہ کلمات ''پسائدان'' کے عنوان سے لکھے ہیں جو دراصل گیانیشوری کی جملہ خصوصیات اور تعلیمات کا مجموعہ ہے۔عبدالستار دلوی نے ''پسائدان'' کی انہی خصوصیات و اہمیت سے متاثر ہو کر ان کا اردو ترجمہ کیا ہے جو ماہنامہ ''آج کل'' دہلی میں اگست 1985ء میں پہلی بار شائع ہوا تو مختلف اخباروں اور رسائل نے اسے بار بار شائع کیا جس سے اس ترجمے کی کامیابی کا پتہ چلتا ہے۔نظم ''پسائدان کا ابتدائی شعر ملاحظہ کیجیے، جو مصنف نے خالق دو عالم سے مخاطب ہو کر کیا ہے:

لفظوں کا یہ نذرانہ،
اے خالقِ دو عالم
بے مایہ سہی پھر بھی
شاید کسی قابل ہو

شاعر اس شعر میں خالق دو عالم کو مخاطب کر کے پوری نظم میں کائنات کی تمام مخلوقات کے لیے دعائے خیر مانگتا ہے جسے قبول کر کے خالق کل یوں فرماتا ہے:

''بندے! ترے خوابوں کی تکمیل کروں گا میں''

خالق کل کے الفاظ سے گیانیشور خوش ہو جاتا ہے کہ اس کی دعا مقبول ہو گی اور یہی پر نظم اختتام پذیر ہو جاتی ہے۔

پسائدان کے مطالعہ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ مترجم عبدالستار دلوی نے اس کے ترجمے میں بڑی چابکدستی

اور ہنرمندی سے کام لیا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ ترجمہ علمی وادبی حلقوں میں کافی مقبول ہوا اور اس کی اہمیت وافادیت کا اندازہ ڈاکٹر شرف النہار بیگم کے اس اقتباس سے ہوجاتا ہے:

''دلوی صاحب نے 1985ء کے رسالے آج کل میں قدیم مراٹھی شاعر، سنت گیانیشور کی مشہور شہرآفاق نظم ''گیانیشوری'' کے آخری دعائیہ حصے کا یہ عنوان ''پسائدان'' اردو ترجمہ کیا ہے اس دعائیہ حصے میں انہوں نے تخلیق کی شان کو برقرار رکھار کھتے ہوئے اس ترجمے میں منتقل کیا ہے اور مصنف کے التجائیہ انداز کو ازابتداء تاانتہاء برقرار رکھا ہے۔''

(ماہنامہ ''کتاب نما'' دہلی، پروفیسر عبدالستار دلوی نمبر، مضمون: پروفیسر عبدالستار دلوی بہ حیثیت مترجم، فروری 2006، ص:45)

مختصراً کہا جائے تو عبدالستار دلوی کا اردو ترجمہ ''پسائدان'' ایک کامیاب ترجمہ کہا جاسکتا ہے کیوں کہ اس میں انہوں نے تخلیقی شان کو باقی رکھا ہے جس کا ذاکر ڈاکٹر شرف النہار بیگم نے بھی کیا ہے۔

4.3.1.3.2۔ تشنگی:

''تشنگی'' دراصل مراٹھی شاعر انیؔل کی نظم کا اردو ترجمہ ہے جس کے مترجم عبدالستار دلوی ہیں اور یہ ترجمہ پہلی بار ماہنامہ ''کتاب نما'' دہلی میں ستمبر 1985ء میں شائع ہوا ہے۔ یہ پوری نظم ''پیاس'' کے موضوع پر لکھی گئی ہے جس میں شاعر نے انسان کے اندر موجود مختلف طرح کی پیاس کا بیان کیا ہے۔ یہ بھی عبدالستار دلوی کا ایک کامیاب ترجمہ ہے۔ جسے اردو و مراٹھی دونوں حلقوں میں خوب سراہا گیا۔

4.3.1.3.3۔ ٹھہری نہیں یہ رات ذرا بھی:

''ٹھہری نہیں یہ رات ذرا بھی'' یہ مراٹھی نظم کا اردو ترجمہ ہے۔ مراٹھی میں اس کے تخلیق کار منگیش پاڈگانوکر ہیں اور اردو مترجم عبدالستار دلوی ہیں۔ یہ ترجمہ ماہنامہ ''کتاب نما'' اپریل 1989ء میں شائع ہوا ہے۔

اس نظم کا موضوع محبت میں ہجر و فراق ہے۔ اور پوری نظم آزاد نظم کے فارم میں لکھی گئی ہے جو پڑھنے والوں کو متاثر کرتی ہے۔ نظم کے مطالعے سے انکشاف ہوتا ہے کہ مترجم عبدالستار دلوی نے مراٹھی کی اس آزاد نظم کا اردو میں آزاد ترجمہ کیا ہے، جو آپ کے دوسرے تراجم کی طرح شاندار ہے۔

4.3.1.3.4۔ مراٹھی نظمیں:

پروشوتم شیورام ریگے ایک مختلف الجہات شخصیت ہیں۔ وہ ناول نگار، ڈرامہ نگار، افسانہ نگار اور شاعر ہیں۔ شاعری میں ان کے نو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جس بنا پر یہ مراٹھی شاعری میں اپنا ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ اسی لیے عبدالستار دلوی نے ان کے ناولوں کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کے بعد اب ان کی شاعری کو ترجمے کے لیے منتخب کیا ہے۔

عبدالستار دلوی نے ''مراٹھی نظمیں'' کے عنوان سے پرشوتم شیورام ریگے کی چار نظمیں (سحر، حسن، خواب اور مفہوم) کو اردو زبان میں منتقل کر کے ماہنامہ ''آج کل'' جون 1999ء میں شائع کروایا ہے۔ یہ آزاد نظمیں مختلف موضوعات اور مختلف لہجوں کا احاطہ کر لیتی ہیں اور آپ کے دوسرے تراجم کی طرح یہ ترجمہ بھی لائق ستائش ہے۔

4.3.1.4۔ مراٹھی ڈرامے:

4.3.1.4.1۔ جیونت دلوی:

جیونت دلوی نے مراٹھی کی مختلف افسانوی اصناف جیسے ناول، افسانہ اور ڈرامہ وغیرہ میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں مگر اپنی زندگی کے آخری بیس سال میں انہوں نے صرف ڈراموں پر ہی توجہ دی ہے۔ اور ان کا شمار آزادی کے بعد ابھرنے والی نئی نسل کے ڈرامہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ سندھیا چھایہ، سوریہ الست، پرش، مہاساگر، مہانند اور بیرسٹر ان کے یادگار ڈرامے ہیں۔ لیکن اس میں ''بیرسٹر'' کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ کیوں کہ پورے مراٹھی ادب میں ایسا المیہ ڈرامہ تخلیق نہ ہو پایا۔

''بیرسٹر'':

جیونت دلوی کے ڈرامے ''بیرسٹر'' کو عبدالستار دلوی نے اردو میں ترجمہ کیا ہے اور یہ ترجمہ رسالے ''امکان'' کے مراٹھی سہ بابی ڈراموں کا انتخاب والے خصوصی شمارے نمبر 20، 2002-2003ء میں شائع ہوا۔ اس شمارے میں تین اور بھی ترجمہ شدہ ڈرامے شامل ہیں جو اس طرح ہیں:

1۔ ''بجلی نے کہا دھرتی سے''

ڈرامہ نگار: وی۔ واشر واڈ کر۔ مترجم: محمد حسین پرکار

2۔ ''کھلا''

ڈرامہ نگار: وجے ٹنڈولکر، مترجم: اسلم پرویز

3۔ ''لوک کتھا78''

ڈرامہ نگار: رتنا کر مشکری۔ مترجم: ڈاکٹر میمونہ دلوی۔

ڈرامہ ''بیرسٹر میں بیرسٹر، نانا صاحب، موسیٰ نھا، رادھا اور بھاؤراؤ وغیرہ وغیرہ کردار ہیں۔ مگر ڈرامے میں پیش آنے والے تمام واقعات دراصل بیرسٹر ہی کے کردار سے متعلق ہیں۔ بیرسٹر کا کردار دیپک ہے۔ جنسی طور پر مضطرب ہے اور اس کی پوری شخصیت میں دہرا پن ہے کیوں کہ وہ دنیا کے سامنے کچھ اور ہے اور اپنے گھر کے اندر کچھ اور ہے۔ یہ کردار پرکشش ہے قارئین کو اپنی جانب متوجہ کرتا ہے لیکن اس کے عمل سے اعتراض کیا جاسکتا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ ایک تعلیم یافتہ، حسن پرست اور مغربی اندازفکر رکھنے والا کردار ہے۔ جس کو آپ نے ترجمے میں بھی دلکشی اور چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ڈرامہ پڑھتے وقت اپنی 80 (اسّی) صفحے کی طوالت کے باوجود کبھی گراں بار نہیں گزرتا۔ یہی اس کی کامیابی ہے۔

4.3.1.4.2۔ خاموش! عدالت جاری ہے:

وجئے تنڈولکر مراٹھی ڈرامہ نگاری میں اپنے آپ کو منوا چکے ہیں۔ ان کے ڈراموں میں ''کملا'' اور شانتہ! کوکورت چالو آہے'' قابل یادگار ہیں اسی لیے عبدالستار دلوی نے آخرالذکر کو ''خاموش! عدالت جاری ہے'' کے عنوان سے اردو میں ترجمہ کیا ہے، جو 2018 میں ہی کوکن اردو رائٹرز گلڈ سے شائع ہوا ہے۔

عبدالستار دلوی کو بچپن ہی سے اردو، مراٹھی اور کوکنی زبانوں سے واقفیت رہی ہے اور یہ واقفیت بڑھتے بڑھتے آپ کو کثیر لسانی (Multi Lingual) کے درجے تک پہنچا گئی ہے جس کے چلتے آپ نے مختلف ملکی و غیر ملکی زبانوں کے ادبیات کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے جن میں سے ایک مراٹھی زبان و ادب بھی ہے جس سے دلچسپی ہی نے آپ کو مراٹھی سے اردو تراجم کی طرف متوجہ کیا تو آپ نے بہ حیثیت مراٹھی سے اردو مترجم، مراٹھی ناولوں کے اردو ترجمے، مراٹھی ڈراموں کے اردو ترجمے، مراٹھی کہانیوں کے اردو ترجمے اور مراٹھی نظموں کے بھی اردو ترجمے کیے ہیں جو مختلف اصناف اور مختلف رجحانات سے متعلق ہونے کے باوجود آپ کو ایک کامیاب مترجم ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ آپ کی مراٹھی سے دلچسپی اور تراجم سے متعلق مشہور مورخ، ادیب و ماہر لسانیات ''پنڈت سیتو مادھوراؤ پگڑی اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"Normally Urdu writers in Bombay show singular lack of interest in Marathi, the main language in Maharashtra- Hailing from kokan Dr. Dalvi Knows Marathi well and has excellent relations with the marathi writers, It has been his effort to Bring marathi and Urdu near each other, he has translated a number of marathi stories and essays into Urdu and has also encauraged Urdu writers to do the same."(Testimonial, Date-27 July 1981, P-1 and 2)

پنڈت سیتو مادھو راؤ پگڑی کے بیان کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ عبدالستار دلوی کو اردو اور مراٹھی زبانوں پر یکساں قدرت حاصل ہے اوراس ذولسانی قدرت وخصوصیات نے نہ صرف آپ سے ترجمے کروائے ہیں بلکہ ان ترجموں میں جسم کے ساتھ ساتھ روح اردو کے قالب ڈھل کر آ گئی ہے جس کی وجہ سے آپ کو ایک کامیاب مترجم ثابت کیا جاسکتا ہے اور آپ نے دوسرے ادیب وشعراء کو بھی مراٹھی سے اردو ترجمے کی طرف راغب کیا ہے۔

4.3.2۔ انگریزی سے اردو تراجم:

4.3.2.1۔ اقبال شاعر اور سیاست داں:

ڈاکٹر رفیق ذکریا کی انگریزی کتاب ''Iqbal: The Poet and the Politician'' اور خشونت سنگھ کے تعارف کے ساتھ 1994ء میں انجمن ترقی اردو ہند اور Penguin Books کے اشتراک سے شائع ہوئی تو اسے ادبی وسیاسی دونوں حلقوں میں خوب سراہا گیا۔ جس سے تحریک پا کر عبدالستار دلوی نے اس انگریزی تصنیف کو اردو کا جامہ پہنانے کا فیصلہ کیا اور یہ ترجمہ خشونت سنگھ کے تعارف، ڈاکٹر رفیق زکریا کے پیش لفظ ''جگن ناتھ آزاد کے حرف چند اور ڈاکٹر عبدالستار دلوی کے حرف آغاز کے ساتھ 1995ء میں انجمن ترقی اردو ہند، نئ دہلی سے شائع ہوا۔ جس کی ضخامت 274 صفحات اور قیمت سو روپے ہے۔

ڈاکٹر رفیق ذکریا کا شمار انگریزی ادیب، محقق اور جدید سیاست دانوں میں ہوتا ہے۔ جونہرو سنٹر میں منعقدہ ایک نیشنل سمینار بتاریخ 19/نومبر 1990 کو بہ عنوان ''فرقہ وارانہ ہم آہنگی'' میں صدارت کررہے تھے تو اس دوران بھارتیہ جنتا پارٹی کے سابق سیکریٹری پرمور مہاجننے اپنی تقریر میں اقبآل پر الزام عائد کیا کہ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا'' کے شاعر علامہ اقبآل جن کی ہم سب پرستش کرتے ہیں وہی اصل میں تقسیم ہند کا باعث ہے۔'' ڈاکٹر رفیق ذکریا نے اس الزام کو رد کردیا مگر انہوں نے محسوس کیا کہ اس الزام کا جواب دینے کے لیے انھیں اس موضوع پر مفصل کتاب لکھنی ہوگی کیوں کہ یہ بحث کافی طویل ہوگی۔ یہی واقعہ'' : Iqbal

The Poet and the Politician'' کا سبب تالیف بنا۔اورڈاکٹر رفیق ذکریا نے دوران بحث یہ ثابت کیا ہے کہ اقبال بنیادی طور پر شاعر ہیں مگر وہ فلسفی، مذہبی مفکراور سیاست خاص کرملی سیاست سے دلچسپی رکھتے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ مسلم لیگ سے وابستہ ہوگئے اور 1931ء میں مسلم لیگ کے جلسے بمقام الہ آباد میں خطبہ صدارت میں ہندوستان میں اسلامی ریاست کی تجویز پیش کی تھی۔جس کے بعد اقبالؔ کو عام ہندوستانیوں میں پاکستان کا خالق مانا جانے لگااور فرقہ پرستی کے الزامات بھی لگائے گئے۔دراصل یہ تمام الزامات اقبالؔ کے سیاسی افکارکو نہ سمجھ پانے کا نتیجہ ہے کیوں کہ اقبال کا نظریہ''پاکستان'' تو صرف ہندوستانی وفاق میں ایک آزادمسلم مملکت کا نظریہ تھا نہ کہ علاحدہ ملک پاکستان کا نظریہ تھا۔جس کی اقبال نے متعدد بار اپنے خطبات میں اپنے خطوط اپنے انٹرویوز اوراپنی شاعری میں وضاحت کی ہے۔جس کوکتاب میں دلائل کے ساتھ سائنٹفک انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

جب'' Iqbal : The Poet and The Politician'' منظر عام پر آئی تو اقبال کوفرقہ پرست اور پاکستان کا خالق ماننے والے فرقوں طبقوں میں ہلچل مچ گئی۔یہی سب تھا کہ عبدالستار دلوی نے اسے اردو میں ترجمہ کرکے اقبالیات کے خزانے میں اضافہ کرنا ضروری سمجھا جس کے لیے آپ نے فاضل مصنف سے اجازت طلب کی تو وہ آپ کوانکار نہ کرسکے۔بس اور کیا تھا۔آپ نے برق رفتاری سے کتاب کا ترجمہ تو کرلیامگر مصنف نے اقبال کے جن اردواور فارسی اشعار کا انگریزی میں ترجمہ کرکے شامل کیا تھاان کے اصل اردواور فارسی اشعار تلاش کر کے شامل کرنا تھامگراسی دوران عبدالستار دلوی کوعین شمس یونی ورسٹی، قاہرہ، مصر میں اردوسکشن قائم کرنے کے لیےمصر جانا پڑرہاتھاتوایسے میں انہوں نے یہ کام ڈاکٹر خلیق انجم کے سپرد کیا۔لیکن ڈاکٹر خلیق انجم نے ماہراقبالیات جگن ناتھ آزاد سے فرمائش کی کہ یہ کام وہ زیادہ بہتر کر سکتے ہیں تو جگن ناتھ آزدنے حامی بھرلی اور کافی محنت وتلاش کے بعداردواور فارسی کے اصل اشعارجمع کرلیےاوران کی شمولیت کے ساتھ''اقبال شاعراورسیاست'' 1995ء میں منظرنامے پرآئی تو اردوحلقوں میں بالخصوص اقبالیات کے دلدادہ حضرات نے اسے خوب پسند کیا۔ اس ترجمےاورمترجم سے متعلق اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر رفیق ذکریا یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

> ''ڈاکٹر دلوی نے میری کتاب'' Iqbal : The Poet and The Politician'' کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ ترجمہ اعلیٰ ادب کا بہترین نمونہ ہیں۔ ڈاکٹر دلوی بلاشبہ بے حد محنتی محقق ہیں جنہوں نے ترجمہ کے میدان میں بہترین ادب پیش کیا ہے۔ ان کے علم کی گہرائی حیرت انگیز ہے اوران کا اسلوب نگارش علم اور سادگی کا خوش کن امتزاج پیش کرنا ہے۔ انہوں نے میری کتاب کے ترجمے کو اس طرح سے پیش کیا کہ وہ ترجمہ نہ ہوکر تخلیق معلوم ہوتی ہے۔''

(اقبالؔ کا ایک ممدوح: بھرتری ہری، ص:12-11)

کتاب'' اقبال، شاعر اور سیاست'' کے مطالعے اور ڈاکٹر رفیق زکریا کے اظہار خیال دونوں سے یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ عبدالستار دلوی نے اس مذکورہ ترجمے میں اپنی دقت پسندی، وسیع مطالعہ اور سادہ وسلیس اسلوب سے تخلیقی شان پیدا کردی ہے جو آپ کے ایک کامیاب مترجم ہونے کی دلالت کرتی ہے۔

4.3.2.2۔ ذکر ایڈنبرا:

نسیم ایزیکل ہندانگریزی شاعری میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں اور آپ کو یہ مقام دلانے والے آپ کے شعری مجموعے الترتیب'' A Time to Change (1952), Sixty Poems (1953), The Third (1959), The Unfinished (1960), The extract Ediuburgh interlude اور Name (1965), Hymes in Darkness (1976) (1998) ہیں۔

نسیم ایزیکل کی شاعرانہ خصوصیات پرنظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا شمار ہندانگریزی شاعری کے ان شاعروں میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے آزادی کے بعد اپنی شاعری میں اظہار کے نئے پیرائے اور اس وقت

کے عصری موضوعات کو پیش کیا ہے۔

واضح رہے کہ نسیم ایزیکل صدر شعبہ انگریزی، بمبئی یونی ورسٹی رہے ہیں۔ جہاں آپ اور عبدالستار دلوی دونوں رفیق کار تھے۔ نسیم ایزیکل نے ان دنوں ایڈنبرا کے Poetry Festival میں شرکت کی تھی جس کے لیے آپ نے انگلستان کا سفر کیا اور اس سفر کے دوران آپ نے تیس مسلسل نظمیں کہی ہیں جو انگریزی رسالے Illustrated Weekly of India میں شائع ہو کر داد حاصل کر چکی تھیں۔ اور ان میں سے چند کے مراٹھی تراجم بھی ہوئے۔ اور جب 1983ء میں نسیم ایزیکل کو ساہتیہ اکادمی انعام سے نوازا گیا تو اس موقع پر صدر شعبہ اردو پروفیسر عبدالستار دلوی نے ایک تہنیتی جلسہ منعقد کیا۔ اس جلسے میں نسیم ایزیکل نے ان نظموں کا ایک نسخہ عبدالستار دلوی کو بطور تحفہ پیش کیا۔ عبدالستار دلوی نے اپنی انگریزی زبان وادب سے دلچسپی کے پیش نظر ان نظموں کا خصوصی مطالعہ کیا۔ اور اس مطالعہ کے بعد عبدالستار دلوی ان نظموں کی مختلف خصوصیات یوں بیان کرتے ہیں:

> ''نسیم کی ان نظموں میں ان کی سادہ فکر، تہذیبی تقابل نفسیات کی باریکیوں کے علاوہ بمبئی اور ایڈنبرا کی زندگی کی تقابلی جھلکیاں اور ان جھلکیوں میں عوامی شاعری کے عناصر اور ان کا متصوفیانہ Mystic مزاج مجھے بہت پسند آیا۔''

(ذکرِ ایڈنبرا،ص:12)

انہی خصوصیات سے متاثر ہو کر آپ نے ان نظموں کو اردو میں ترجمے کے ذریعے منتقل کیا۔ اتنا ہی نہیں آپ نے بمبئی یونی ورسٹی کی ایک نشست میں، نسیم ایزیکل کی موجودگی میں یہ تراجم پڑھ کر سنائے تو نسیم ایزیکل نے انتہائی مسرت کا اظہار کیا اور خواہش کی کہ یہ تراجم کتابی صورت میں شائع ہوں۔ لہٰذا کچھ تاخیر کے ساتھ ہی صحیح یہ اردو تراجم دائیں جانب اور اصل انگریزی نظمیں بائیں جانب مجلد 1998 میں قلم پبلیکیشن سے شائع ہوئیں تو ان نظموں نے عبدالستار دلوی کو مترجم کے ساتھ ساتھ بہ حیثیت ایک باکمال شاعر کے بھی پیش کیا ہے۔ لیکن وہ اس کے برعکس یوں اظہار خیال کرتے ہیں؛

''مجھے نہ انگریزی داں ہونے کا دعویٰ ہے نہ شاعر ہونے کا، یہ ترجمے محض میری ادبی دلچسپی کا نتیجہ ہیں جو بغیر کسی اعتذار کے پیش کر رہا ہوں۔ اگر ان میں ترجمے کا کوئی حسن ہے یا اگر میں اصلی شاعری کا تاثر پیش کرنے میں کامیاب ہوں تو یہی میرا صلہ ہے۔''

(ذکرِ ایڈنبرا،ص:12)

عبدالستار دلوی کی عاجزی و انکساری ایسی صفات میں جوان کو اپنے آپ کو انگریزی داں اور شاعر ہونے کا دعویٰ کرنے سے روکتی ہیں۔ مگر سچ یہی ہے کہ آپ انگریزی زبان پر بلا کا عبور رکھتے ہیں اور اقبال سے متاثر ہوکر آپ نے شاعری بھی کی ہے۔ ایسے میں ذکرِ ایڈنبرا کی نظموں میں شاعرانہ حسن اور تاثر پیدا کرنا آپ کے لیے کوئی مشکل امر نہیں تھا۔ بہر حال ان تراجم میں شاعرانہ تخلیقی حسن بھی موجود ہے اور یہ قاری کو متاثر بھی کرتی ہیں۔

4.3.2.3۔ اقبالؔ کا ایک ممدوح۔ عظیم سنسکرت شاعر اور مفکر، بھرتری ہری:

پیش نظر کتاب ''اقبالؔ کا ایک ممدوح: بھرتری ہری'' (تحقیق اور ترجمہ) اگست 2004ء میں دائرۃ الادب''، ممبئی سے شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب تحقیق و ترجمہ ہے مگر ہم یہاں صرف ترجمہ کے ذیل میں ہی گفتگو کریں گے کیوں کہ اس کے تحقیقی زمرے (مقدمے) پر ہم ''تحقیق و تنقید'' کے تحت بحث کر چکے ہیں اور یہاں دوبارہ اس کو دوہرانا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

دراصل بھرتری ہری سنسکرت کا ایک عظیم شاعر گزرا ہے لیکن اس کی حیات و شخصیت ابھی ہنوز پردۂ خفا میں ہیں۔ مگر اس کا کلام تین سوشتک پر مبنی ہے جس کا اصل موضوع ''عورت'' ہے۔ بھرتری ہری کے کلام سے استفادہ کرنے والے شعراء میں بہت سے نام گنوائے جا سکتے ہیں۔ اور وہ بھی مختلف زبانوں کے ایسے میں اگر ہم اردو شعراء پر بھرتری ہری کا اثر ڈھونڈنے نکلیں تو اس فہرست میں سب سے نمایاں نام علامہ اقبالؔ کا ہوگا۔ جنہوں نے ''جاوید نامہ'' میں مولانا رومی کے ہمراہ بھرتری ہری سے تصوراتی گفتگو کی ہے۔ اس کے علاوہ بالِ جبریل کی متعدد نظمیں اس

سیاق وسباق میں پیش کی جاسکتی ہیں۔مثال کے طور پر بھرتری ہری کے چار مصرعوں کے شتک کو اقبال نے دومصرعوں میں کیا خوب ادا کردیا ہے:

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر

مرد ناداں پر کلام نرم ونازک بے اثر

(بال جبریل)

بہرحال اقبالؔ کے کلام پر بھرتری ہری کے اثرات ہی نے عبدالستار دلوی کو تحریک دی کہ وہ بھرتری ہری کے سنسکرت کلام کا اردو ترجمہ کریں اور اردو والوں کو بھرتری ہری سے واقف کرائیں۔ویسے تو اردو میں بھرتری ہری کے کلام کے کئی ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔جن میں بابو گوری شنکر لال اخترؔ کے ''جوہر تثلیث'' 1913ء کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔عبدالستار دلوی، بھرتری ہری کے کلام کے اردو ترجمے سے متعلق ملی اس تحریک کا ذکر اپنے ایک انٹرویو میں اس طرح کرتے ہیں:

''علامہ اقبال پر بھرتری ہری کا اثر تھا۔اور میرے لیے یہی وجہ کافی تھی بھرتری ہری کو سمجھنے اور ان کے کلام کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے۔''

(ماہنامہ''اردو دنیا'' دہلی، انٹرویو، عبدالستار دلوی سے ایک ملاقات مراٹھی، نندنی آتم سدھا، اردو مترجم: ڈاکٹر مزمل سرکھوٹ، نومبر: 2017، ص:9)

عبدالستار دلوی نے بھرتری ہری کے تین سوشتکوں میں سے دوسوشتکوں کا انتخاب کر کے انہی کا اردو ترجمہ کیا ہے۔اور ان کو تین مختلف حصوں میں تقسیم کردیا ہے جیسے اخلاقیات کے تحت 75 شتک، جمالیات کے تحت 73 شتک اور رہبانیات کے تحت 52 شتک وغیرہ وغیرہ۔مگر ہم یہاں پر ہر باب سے ایک ایک شتک ہی کا احاطہ کرنے کی کوشش کریں گے:

1۔ اخلاقیات:

مردِ ناداں ہے اپنے حال میں مست

ہے یہی حال اہلِ دانش کا

ہاں! مگر ہیں جو درمیان کے لوگ

وہ کبھی مطمئن نہیں ہوتے

(باب، اخلاقیات، نظم نمبر:8، ص:12)

بھرتری ہری اس نظم میں کہتا ہے کہ ادنیٰ و اعلیٰ طبقے کے لوگ تو ہر حال میں خوش رہتے ہیں کیوں کہ اعلیٰ طبقے کا تصور ہوتا ہے کہ وہ طبقہ اعلیٰ سے وابستہ ہے تو وہ ہر شئے کو خرید سکتا ہے اور ادنیٰ طبقہ چوں کہ غریب ہوتا ہے، مجبور ہوتا ہے اسی لیے اس کو نہ عزت کی فکر لاحق ہوتی ہے اور نہ پیسے کی مگر متوسط طبقہ ہی ایک ایسا طبقہ ہے جو پوری زندگی محنت مشقت کے باوجود کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔ جس کی سب سے بڑی وجہ ''عزت کو کھونے کا ڈر'' ہے۔ غرض یہ کہ موضوع بھرتری ہری کے دور میں جتنا اہم تھا صدیوں بعد آج بھی اتنا ہی اہم ہے۔ کیوں کہ یہ ہمارے طبقات نظامِ سماج کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ اسی لیے ہم اسے آفاقی نظم قرار دے سکتے ہیں:

2۔ جمالیات:

بھرتری ہری کی شاعری میں ''عورت'' ایک خاص مقام رکھتی ہے اور خاص کر جمالیات والے باب میں تو ''عورت'' اپنے پورے شباب، ناز نخرے ادائیں اور جسمانی خد و خال کے ساتھ نظر آتی ہے۔ اسی سلسلے کی ایک نظم ملاحظہ ہو:

چاہے بازو بند ہو

یا گلے میں چاند جیسا ہار ہو

غسل کرنا، جسم کی مالش کرانا

پھول بالوں میں لگانا، کوئی آرائش نہیں

صرف انداز تکلم جس میں ہوشائستگی

آدمی کی اصل زیبائش ہے یہ

ختم ہو جاتے ہیں دیگر زیورات

باقی رہتا ہے فقط

اک ہی حسن تکلم

مرد کی عزت بڑھانے کے لیے

(باب، جمالیات، نظم نمبر:76،ص:149)

اس نظم میں بھرتری ہری عورت کی ظاہری آرائش وزیبائش یعنی اس کے بال، زیورات وغیرہ وغیرہ پر اس کی باطنی خوب صورتی یعنی ''حسن اخلاق'' کو ترجیح دیتا ہے۔

3۔ رہبانیات:

بھرتری ہری بادشاہت چھوڑ کر رہبانیت کی طرف راغب ہوئے تھے اسی لیے اس باب میں انسان کے انجام، دنیوی خواہشات سے دوری، نفس سے دوری وغیرہ وغیرہ موضوعات بیان کیے گئے ہیں۔اسی طرح کی ایک نظم دیکھیے:

تمہیں خواہشات سے زیادہ

دولت دنیا بھی مل جائے

اگر تم اپنے سارے دشمنوں کو زیر بھی کرلو

اگر تم جیت لو دانشوروں کو اپنی دولت سے

تمہاری ہستی فانی کو استحکام مل جائے

کبھی سوچا ہے تم نے پھر

کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟

(باب:''رہبانیات''،نظم نمبر:186،ص:205)

اس نظم میں بھرتری ہری سوال کرتا ہے کہ انسان کیوں نہیں سوچتا کہ اسے اپنی تمام خواہشات کی تکمیل کے بعد، دولت دنیا حاصل کر لینے کے بعد اور اس دولت سے سب کچھ خرید لینے کے بعد بھی آخر ایک دن اسے مرنا ہی ہے تو پھر ان سب کا کیا فائدہ؟

بھرتری ہری کے موضوعات شعری آفاقی و دائمی حیثیت کے حامل ہیں۔جس کی مثالوں میں ان نظموں کو پیش کیا جا سکتا ہے جن کا پچھلے صفحات میں احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے

عبدالستار دلوی کے ان اردو تراجم کو پڑھنا اور سمجھنا آسان ہے کیوں کہ یہ آزاد نظم کی ہیئت میں ہیں جتنا خیال ضروری ہے۔اتنا ہی کہا گیا ہے اور شاید غیر ضروری الفاظ سے بچنے کے لیے ہی ان نظموں کی پابند ہیئت سے پرہیز کیا گیا ہے۔لیکن عبدالستار دلوی کے یہ منظوم تراجم ہمیں بار بار احساس دلاتے ہیں کہ یہ کئی صدیوں قبل کہی گئی نظموں کے تراجم نہیں ہیں بلکہ یہ دور حاضر میں کہی گئی خود مترجم کی نظمیں ہیں۔جن میں شاعرانہ اخلاق بھی ہے اور معنی و مفہوم کی افہام و تفہیم بھی ہے۔لہٰذا آپ کے ان تراجم سے متعلق محمد ایوب واقف یوں رقم طراز ہیں:

> بھرتری ہری کی شاعری کے ترجمے میں شاعر کے شاعرانہ ذہن اور اس کے پس منظر کو فنکارانہ سرور و انبساط کے ساتھ اس کی اصل روح کو بھی پیش کرنے کا مسئلہ بڑا جانکاہ مسئلہ تھا لیکن دلوی صاحب نے اس مسئلے کو دانش مندانہ طریقے

سے حل کیا۔ بھرتری ہری کے شاعری کے ترجمے نے دلوی صاحب کے شاعرانہ
مزاج کو بھی مترشح کر دیا ہے۔''

(ممبئی کے ساہتیہ اکادمی انعام یافتگان، شاعر، ادیب اور مترجم، ص:186)

الغرض عبدالستار دلوی کے ان منظوم اردو ترجموں میں تخلیقی شان ہے جس کی وضاحت محمد ایوب واقف کے متذکرہ بالا اقتباس سے بھی ہو جاتی ہے اور رفعت سروش کے مندرجہ ذیل اقتباس سے بھی ہو جاتی ہے:

''پروفیسر عبدالستار دلوی نے اس کے کل مستند کلام کو اردو میں پیش کر کے اردو
ادب میں اضافہ کیا ہے اور نئی نسلوں کے لیے ایک راہ ہموار کی ہے۔ ان کے
منظوم ترجمے بیشتر مقامات پر تخلیقات کی شان لیے ہوئے ہیں۔''

(ادب شناس، ص:23)

مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ عبدالستار دلوی اقبال سے متاثر ہیں۔ جس کے چلتے آپ نے اقبال کی شاعری کا خصوصی مطالعہ کیا تو پایا کہ ماہرین اقبالیات نے اب تک اقبال کی شاعری پر اسلامی اثر تو بتائے ہیں مگر اقبال کی شاعری پر ہندو مذہب اور ہندو تہذیب کا بھی اثر ہے۔ جس کا ایک سبب بھرتری ہری بھی ہے۔ لہٰذا آپ اقبال ہی کے توسط سے بھرتری ہری تک پہنچے تو متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پائے اور سنسکرت سے راست ناواقفیت کی وجہ سے بھرتری ہری کے انگریزی تراجم سے استفادہ کر کے اسکے دو سو شلوکوں کو اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ کتاب کے دیباچے میں سردار جعفری نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے اور خود عبدالستار دلوی ایک انٹرویو میں مراٹھی محرک، نندنی آتم سدھ اور اردو مترجم ڈاکٹر مزمل سرکھوت کے اس پس منظر میں پوچھے گئے ایک سوالکے جواب میں کہتے ہیں:

''میں سنسکرت نہیں جانتا۔ مگر بھرتری ہری سے واقف تھا۔ میں نے انگریزی
زبان میں بھرتری ہری کا ترجمہ پڑھا تھا۔ یہ ترجمہ باربرا ملر اسٹرولر نے کیا تھا۔
میرے اردو ترجمے میں مجھے ڈاکٹر کمل ویلنکر اور معروف پروفیسر ڈاکٹر بھٹ نے

کافی مدد کی۔ ان کی مدد سے میں نے اصل سنسکرت متن بھی پڑھا اور پیش نظر یہ
انگریزی ترجمہ میں ہوتا۔ اسی طرح میرا کام آسان گیا۔''

(ماہنامہ ''اردو دنیا'' دہلی، نومبر 2017)

کتاب کے دیباچے میں سردار جعفری نے لکھا ہے کہ یہ ترجمے اصل زبان سنسکرت سے نہ ہوکر انگریزی سے ترجمے ہیں مگر عبدالستار دلوی کے اس وضاحت کے بعد ان کے پیش نظر اصل زبان سنسکرت اور انگریزی ترجمہ دونوں رہے ہیں۔ انہوں نے دونوں سے استفادہ کر کے یہ اردو ترجمہ کیا ہے۔ اسی لیے اس کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ اور اسی اہمیت کے پیش نظر مشفق خواجہ اس کا ایک پاکستانی ایڈیشن نکالنا چاہتے تھے۔ جس سے متعلق وہ اپنے ایک خط مورخہ 15/ جنوری 2005ء کو عبدالستار دلوی کو لکھتے ہیں:

''بھرتری ہری والی کتاب انشاء اللہ بہت جلد ادارہ یادگارِ غالبؔ کی طرف سے
شائع کردی جائے گی۔ آپ نے سی ڈی بھیج کر طباعت کا کام آسان کردیا۔''

لیکن جنوری 2005ء ہی میں مشفق خواجہ کے پر ملال انتقال کی وجہ سے یہ امر حقیقت نہ بن سکا مگر، اقبال کا ایک ممدوح: بھرتری ہری'' کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

4.3.2.4۔ انگریزی انٹرویو کا اردو ترجمہ:

عبدالستار دلوی ایک ماہر لسانیات ہیں اسی لیے آپ کو علم لسانیات سے متعلق کچھ بھی مل جائے، وہ آپ کی خصوصی دلچسپی کا باعث بن جاتا ہے۔ دراصل عبدالستار دلوی نے انگریزی روزنامے ''Times of India'' میں ایک مغربی ماہر لسانیات، پروفیسر ڈیوڈ دلبی کا انٹرویو پڑھا تھا جس کے محرک اٹھے ویدیہ تھے۔ اور اس انٹرویو نے آپ کو اتنا متاثر کیا کہ آپ نے اس کا اردو ترجمہ ''ایک لسانی مرکز کا حصول'' کے عنوان سے کیا۔ جس میں اٹھے ویدیہ کے مختلف سوالات کے جوابات میں پروفیسر ڈیوڈ ربی نے بتایا کہ وہ ایک تصنیف پر کام کر رہے ہیں، جس میں

بیسوی صدی میں استعمال ہونے والی بیس ہزار زبانوں کی تفصیلات درج ہوں گی۔ اسکے علاوہ پروفیسر ڈیوڈ ربی نے پونا میں ایک کانفرنس میں خطاب کیا تھا۔ چند تجاویز پیش کی تھیں جن سے ہندوستان کو 2020ء تک انگریزی کا مرکز نقل بنایا جاسکتا ہے۔ان سے متعلق سوالات ہیں۔ آپ نے اس انٹرویو کا اردو میں ترجمہ کیا اور وہ اپریل 2000ء کے ''اردو دنیا'' میں شائع بھی ہوا۔ یہ ترجمہ ادب کے ایک عام قاری کے لیے نہیں ہے مگر لسانی ذوق رکھنے والوں کے لیے یہ دلچسپی کا سامان مہیا کرتا ہے۔

یوں تو عبدالستار دلوی بہ حیثیت مترجم کے موضوع پر متعدد ماہرین نے مضامین قلم بند کیے ہیں مگر ''مکالمہ پرفیسر عبدالستار دلوی سے'' میں عبدالستار دلوی، مکالمہ نگار، ڈاکٹر راشد عزیز کے ایک سوال کے جواب میں اپنے ترجموں سے متعلق یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

> ''مجھے اپنے کسی ترجمے پر فخر نہیں ہے میں نے اپنی بساط بھر کوشش کی ہے ترجمہ کرنے کی۔ مراٹھی کے دو مختصر ناولوں ''ساوتری'' اور ''رن آنگن'' اسی طرح اقبالؔ کا ایک ممدوح: بھرتری ہری (تحقیق اور ترجمہ) اور نسیم ایزیکل کی انگریزی نظمیں، ذکر ایڈنبرا کو علمی اور ادبی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا۔ عالموں اور ادیبوں کی قدر افزائی میرے لیے باعث افتخار ہے۔ اس ضمن میں بطور خاص میں محترم پروفیسر مسعود حسین خان اور مشفق خواجہ صاحب کا نام لینا چاہوں گا۔''

(ماہنامہ ''ایوان اردو'' دہلی، جون 2011ء ص:55)

عبدالستار دلوی جہاں متعدد زبانوں پر عبور رکھتے ہیں وہیں انھیں فن ترجمہ سے بھی خصوصی دلچسپی ہے۔ ان دونوں کے اشتراک ہی کا نتیجہ ہے کہ آپ نے مختلف زبانوں سے اردو میں تراجم کیے جو کتابی صورت میں شائع ہوئے تو ایک طرف اردو والے مراٹھی زبان و ادب سے واقف ہوئے اور دوسری طرف اردو زبان و ادب کے ذخیرے میں اضافہ ہوا ہے۔

4.3.2.5۔ فن ترجمے سے متعلق متفرق مضامین:

عبدالستار دلوی نے فن ترجمہ سے دلچسپی کے چلتے مراٹھی اور انگریزی زبانوں کے نظم ونثر کو اردو میں منتقل کیا ہے اور اسی کے ساتھ فن ترجمہ پر کئی مضامین بھی سپرد قلم کیے ہیں جن کا ہم یہاں سرسری مطالعہ کرنے کی کوشش کریں گے۔

4.3.2.5.1۔ دلت ادب: اردو تراجم:

عبدالستار دلوی نے اس مضمون میں دلت ادب کیا ہے؟ مراٹھی میں اس رجحان کی اہمیت کیا ہے؟ مراٹھی کے دلت ادب سے کون کون سے اردو تراجم ہوئے ہیں اور ان کی اردو ادب میں کیا اہمیت ہے۔ آپ کا یہ مضمون دسمبر 2000ء میں ماہنامہ ''آج کل'' میں شائع ہوا تھا۔

4.3.2.5.2۔ ترجمے کی لسانی وتہذیبی معنویت (مراٹھی کے حوالے سے):

عبدالستار دلوی نے اس مضمون میں کثیر لسانی ملک میں فن ترجمہ کی اہمیت بتاتے ہوئے اصطلاح ترجمہ در ترجمہ کا ذکر کرتے ہیں۔ وراس کے علاوہ مراٹھی سے اردو تراجم کی مختصر مگر مکمل تاریخ بیان کرتے ہیں۔ یہ مضمون ماہنامہ ''سب رس'' حیدرآباد میں ستمبر 2017 میں شائع ہوا ہے۔

☆☆☆

4.4۔ شاعری (عبدالستار دلوی بہ حیثیت شاعر):

شاعری دراصل تخیل کی بلند پرواز ہے۔ جس شاعر کا تخیل جتنا بلند ہوگا اس کی شاعری بھی اتنی ہی اعلیٰ ہوگی۔ تخیل کے علاوہ شاعر کے یہاں رموز سخن اور ذخیرہ الفاظ کا بھی ہونا ضروری ہے۔ کیوں کہ ان کے بغیر وہ اپنے تخیل کو شعری پیکر میں کیسے ڈھالے گا؟ اسی لیے شاعر کے یہاں رموز وسخن کی مشق اور ذخیرہ الفاظ کا خزانہ ہونا لازمی

ہے۔ اتنا ہی نہیں ایک اچھے شاعر کے یہاں تخیل کی بلند پرواز، رموزِ سخن کی مشق اور ذخیرہ الفاظ کے ساتھ ساتھ پیش کش کا سلیقہ بھی ہو۔ ورنہ شعر میں وہ تاثر پیدا نہیں ہوگا جو وہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔

یا تو شاعری الہامی ہوتی ہے یا پھر ماحول اور مشق کا نتیجہ ہوتی ہے۔ عبدالستار دلوی کی شاعری بھی مشق اور ماحول کا نتیجہ ہے۔ دراصل آپ کے استاد عبداللطیف چور گھے با کمال شاعر تھے۔ ''لطیف'' تخلص کرتے تھے اور مولوی محمد یونس ہینڈادے کے تلامذے میں سے تھے۔ استاد کی صحبت اور شاعرانہ ماحول نے آپ کو شعری ذوق دیا۔ اس شعری ذوق کی تسکین کے لیے آپ نے میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ جیسے شعراء کا مطالعہ کیا مگر ان میں سے آپ اقبالؔ سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ جذباتی سطح پر بھی اور شعری سطح پر بھی۔ لہٰذا آپ نے بھی شاعری کی ابتداء کی اور ''جاوید'' تخلص اختیار کیا۔ آپ نے اپنے شعری سفر کی ابتدأ میں دو ایک غزلیں بھی کہی ہیں۔ لیکن وہ محفوظ نہیں رہیں۔ پھر آپ نظم کی طرف مائل ہوئے اور جب طبیعت موزوں ہوئی آپ نے نظمیں تخلیق کیں۔ مگر ان کی تعداد بہت مختصر ہے۔

عبدالستار دلوی کی ایک نظم ''ممبئی یونی ورسٹی کی نذر'' ہے، جو آپ نے صدر شعبہ اردو کرشن چند پروفیسر کے عہدے سے سبکدوش (30 / اگست 1997ء) کے موقع پر کہی ہے۔ دراصل ممبئی یونی ورسٹی کا شمار ہندوستان کے قدیم تعلیمی مراکز اور یونی ورسٹیوں میں ہوتا ہے اور جہاں تک اس کی ظاہری ساخت کا تعلق ہے اس کی عمارت ایک مینار سے مزین ہے۔ اسے جہالت میں مینارہ نور سے یوں تعبیر کرتے ہیں:

الوداع اے درس گاہ علم و دانش الوداع
الوداع اے مرکز ارباب بینش الوداع

تو کہ اک بستان حکمت، علم کی کان مبین
تجھ سے بڑھ کر میری دنیا میں نہیں، کوئی نہیں

تیرے دامن میں جو یہ ایستادہ اک مینار ہے

جہل کی تاریکیوں میں مطلع انوار ہے

لہٰذ کا سب سے پرانا مرکز دانش ہے تو

اس عروسِ ممبئی کی اصل زیبائش ہے تو

آپ نے صدر شعبہ اردو و کرشن چندر پروفیسر کی حیثیت سے شعبے میں لکچرس، توسیعی خطبات اور سمینارس کیے تھے اور ان میں ملک کے مختلف علاقوں سے ماہرین علم و ادب کو دعوتِ فیض دی تھی تا کہ شعبے کے طالب علموں کے ساتھ ساتھ شہر ممبئی کا پورا ادبی حلقہ فیض یاب ہو سکے۔ ان سب کا ذکر انہوں نے اپنی مذکورہ نظم میں یوں کیا ہے:

میری دانش گاہ! تجھ کو یاد تو ہوگی ضرور

وہ ادب کی محفلیں وہ علم و حکمت کا سرور

خوش قلم وہ، خوش نوا وہ اور خوش گفتار وہ

ہاں وہ عصمت اور بیدی اور علی سردار وہ

ملک کے دانشوروں اور عالموں کو بارہا

تیری محفل میں بلا کر میں نے یکجا کر دیا

یہ پوری نظم دراصل آپ کے دورِ صدارت کی روداد ہے وہ بھی خود آپ ہی کے قلم سے۔ جس سے مادر علمی ممبئی یونی ورسٹی سے وابستہ آپ کے جذبات و تجربات کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ یہ نظم سب سے پہلے روزنامہ ''انقلاب''، ممبئی میں 11 /نومبر 1997ء کو شائع ہوئی۔ ماہنامہ ''کتاب نما'' دہلی سے دسمبر 1997ء میں شامل رہی اور ماہنامہ ''سب رس'' حیدر آباد کے گوشہ عبدالستار دلوی (1998) کا بھی حصہ رہی ہے۔

عبدالستار دلوی کی ایک اور مادر علمی اسماعیل یوسف کالج بمبئی ہے جہاں سے آپ نے انٹرمیڈیٹ اور بی اے کی تعلیم حاصل کی ہے۔اس عرصے میں جو علم و ہنر اور دانش اور ہستیاں اس کالج سے کسی نہ کسی طرح وابستہ تھیں۔ ان سب کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے یہ نظم ''اسماعیل یوسف کالج کی نذر'' تخلیق کی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

ترمذی، باقر علی، عالی نسب مختار بھی
مولوی عبدالصمد بھی اور نجیب وڈار بھی

ایک دکھلاتا رہا جادوگری تصوری کی
ایک کے حصے میں آئی ساحری تحریر کی

کیسی کیسی ہستیاں تھیں پاسبانی کے لیے
حضرت داؤد بھی تھے لن ترانی کے لیے

زیب و زینت تھے بینر جی جیسے تابندہ نجوم
اورظہیر الدین مدنی تھے جو اک بحر العلوم

دراصل ڈاکٹر باقر علی ترمذی، ڈاکٹر عالی جعفری، مولوی عبدالصمد پروفیسر نجیب اشرف ندوی، پروفیسر محمد ابراہیم ڈار، پروفیسر داؤد پوتا، پروفیسر بینر جی اور ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی کا شمار اسماعیل یوسف کالج کی کہکشاں میں ہوتا ہے جس کے سپہ سالار ڈاکٹر بذل الرحمٰن تھے۔ آپ نے جب کالج کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے نظم کہی تو اس میں اپنے تمام اساتذہ کو ان کی مخصوص صفات کے حوالے سے یاد کیا ہے اور اس نظم کی ایک اور خاص بات یہ ہے

کہ اس میں جن ہستیوں کے نام آئے ہیں ان کا فٹ نوٹ میں حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ جس سے ان ہستیوں سے واقف ہونے میں مدد ملتی ہے۔ یہ نظم آپ کے کالج کی Reunion میں پڑھی گئی تھی جسے خوب پسند کیا گیا۔

آپ کی یہ دونوں نظمیں (ممبئ یونی ورسٹی کے نام اور ''اسماعیل یوسف کالج کی نذر) پابند نظم کی ہیئت میں ہے اور زبان و بیان کا دلکش نمونہ بھی ہے اور ان نظموں سے جہاں اپنی درگاہوں سے آپ کے ذاتی جذبات کا پتہ چلتا ہے وہیں ان درس گاہوں کی عظمت و شان کا بھی بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

آپ کی ایک اور شاندار نظم ''روز و شب گزر گئے'' ہے۔ جو ماہنامہ ''کتاب نما'' دہلی میں فروری 2001ء میں شائع ہوئی ہے۔ یہ پوری نظم طنزیہ پیرائے میں ہے۔ جس میں مولویوں اور درسگاہوں کے حالِ زار کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ مولویوں سے متعلق بند دیکھیے:

جو سوچیے تو سوچیے بھی کیا بھلا

بشکل مولوی ملے

.دروغ کے امام بھی

جو مستقل کیا کیے

وفا کے نام پر دغا کے کام

نہیں مکر و فن کے تار سے بنی ہوئی

بدن پہ جن کے سازشوں کی چادریں

درس گاہوں میں ہو رہی مفاد پرستی اور گروہ بندی سے متعلق لکھتے ہیں:

علوم و فن کے نام پر

شرارتیں رذالتیں

کہ ارتھ کا انرتھ سب

محاورے کہاوتیں

مفاد کی حسین میز پر

سجی ہوئی

روغنی وہ دعوتیں

وہ ذائقوں کی دلنشین نمائش

چھلکتے دل کے جام میں

مگر خلوص تھا کہاں

موجودہ دور ہماری تعلیمی درس گاہوں اور مدرسوں کی پستی کا دور ہے۔ جہاں مولوی ہو کہ پروفیسر سب کے سب اپنے ذاتی مفاد تک ہی محدود ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے ہمارے معاشرے بالخصوص تعلیمی نظام میں بگاڑ پیدا ہو گیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم تعلیم سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔

عبدالستار دلوی کی ایک اور شاہکار نظم ''زبان کا فلسفہ'' ہے جس میں آپ نے زبان کی ابتداء سے ارتقا تک کے فلسفے کو نظم کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ آپ کی اس نظم کو بھی اردو حلقوں میں خوب سراہا گیا ہے۔

مختصراً یہ کہ آپ نے وقفے وقفے سے مختلف موقعوں پر یہ چند نظمیں کہی ہیں۔ ان نظموں کی کمیت کم ہی سہی مگر معیار اعلیٰ ہے اور ان نظموں کی وساطت سے آپ کو اعلیٰ پائے کا شاعر تو نہیں کہا جا سکتا مگر آپ کے شعری ذوق اور فنی رموز سے گہری دلچسپی کی داد دینی پڑتی ہے۔

4.5۔ عبدالستار دلوی: بہ حیثیت مدیر یا بہ حیثیت ادبی صحافی

لفظ ''صحافت'' عربی لفظ ''صحف'' سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی صفحہ کتاب یا رسالے کے نکلتے ہیں۔ اسی

طرح لفظ ''صحیفہ'' کے لغوی معنی کتاب ' رسالہ' ورق اور صفحہ وغیرہ کے دیے جاتے ہیں۔ اگر ہم لفظ ''صحافت'' اور ''صحیفہ'' دونوں کے معنی پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے معنی مشترک ہیں۔ جیسے کتاب رسالہ اور صفحہ۔ عبدالسلام خورشید اس کی تعریف یوں کرتے ہیں:

> ''صحیفے سے مراد ایسا مطبوعہ مواد ہے جو مقررہ وقفے کے بعد شائع ہوتا ہے چنانچہ اخبار و رسائل صحیفے ہیں اور جو لوگ اس کی ترتیب و تحسین اور تحریر سے وابستہ ہیں انھیں صحافی کہا جاتا ہے۔ اور ان کے پیشے کو صحافت کا نام دیا گیا ہے۔''

(فن صحافت، ص:136)

عبدالسلام خورشید کی اس تعریف سے واضح ہو جاتا ہے کہ صحافی فاعل ہے، صحافت فعل ہے اور صحیفہ یعنی اخبار و رسائل مفعول ہیں۔ لفظ ''صحافت'' کے معنی و تعریف کے دوران کتاب، اخبار اور رسائل جیسے الفاظ بار بار دہرائے گئے ہیں تو آیئے اب ان کا بھی احاطہ کرتے چلیں۔ ''اخبار'' وقت نوعیت کا ہوتا ہے اور سیاست کا نقیب ہوتا ہے یہ ادبی صحافت میں کوئی اعلیٰ مقام نہیں رکھتا جبکہ ''کتاب'' ایک مصنف مستقل موضوع پر قلم بند کرتا ہے۔ یا پھر مختلف اوقات میں، مختلف موضوعات پر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ بھی ہو سکتی ہیں۔ اور اعلیٰ مقام کی حق دار بھی ہوتی ہیں مگر ان کا دائرہ، اخبار اور رسائل کے مقابلے میں محدود ہوتا ہے اور جہاں تک رسائل کا تعلق ہے۔ اس کی نوعیت آفاقی ہوتی ہے۔ ان سے برسوں بعد بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اور Quote کیا جا سکتا ہے۔ جس بنا پر یہ ادب میں اپنا ایک معیار رکھتے ہیں۔ اسی طرح یہ ایک ہی موضوع پر مختلف مصنفین کی تحریروں کا مجموعہ ہوتا ہے یا مختلف موضوعات پر مختلف مصنفین کی تحریروں کا بھی مجموعہ ہو سکتا ہے۔ بہر حال ادب میں رسائل سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

کسی بھی رسالے کے حلقۂ قارئین کس طرح کے ہیں وہ کس طرح کے مواد کو پسند یا ناپسند کرتے ہیں۔ اور ایسا کیا کیا جائے کہ رسائل کے وقار میں بھی اضافہ ہو، قارئین کا حلقہ بھی وسیع تر ہوتا جائے ایسے ہی اور بہت سارے فیصلے رسالے کے مدیر یعنی ایڈیٹر کو کرنے پڑتے ہیں۔ اور ایسے ہی چند مشورے عبدالستار دلوی نے ماہنامہ

''نقش کوکن'' کے مدیر فقیر محمد مشتری کو دیے تھے۔ جن کے پیش نظر مدیر فقیر محمد مشتری نے آپ کو ماہنامہ ''نقش کوکن'' کے مدیر کی حیثیت سے منتخب کر دیا تو آپ نے بھی بہ خوشی ادارت سنبھالی۔

1۔ رسالہ ''ہندوستانی زبان'' (1969-1981):

عبدالستار دلوی بانی ڈائرکٹر، مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر اور لائبریری تقریباً پندرہ سال (1967-1982ء) رہے اور سنٹر کے قیام کے دو سال بعد یعنی 1969ء میں گاندھی جی کی صد سالہ یوم پیدائش کے موقع پر سنٹر ہی سے رسالے ''ہندوستانی زبان'' کا اجرا عمل میں لایا۔ کیوں کہ سینٹر کے قیام کا اصل مقصد گاندھی جی کے نظریے ''ہندوستانی زبان'' کو فروغ دینا تھا تو اسی مناسبت سے رسالے کا نام بھی ''ہندوستانی زبان'' ہی رکھا گیا۔ یہ پہلے سالانہ تھا پھر ششماہی ہوا اور اب سہ ماہی ہے۔ اور آپ اس میں شائع ہونے والے مضامین بالخصوص اداریے زبان ''ہندستانی'' میں لکھا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ رسالے کی دائیں جانب سے اردو مواد اور بائیں جانب سے ہندی (دیوناگری) مواد شائع ہوتا ہے۔ مگر اب یہ علاحدہ علاحدہ شائع ہوتا ہے۔ ''ہندوستانی زبان'' میں شائع ہونے ولاے مضامین کا ایک معیار ہوتا تھا اور اس نے مختلف موقعوں پر مختلف نامور شخصیات پر نمبرس بھی شائع کیے ہیں۔ جن میں امیر خسرو نمبر اور سورداس نمبر نے اردو کے علاوہ ہندی و مراٹھی حلقوں سے بھی داد و تحسین وصول کیا ہے۔

2۔ ماہنامہ ''نقش کوکن''۔(1972-1976):

ماہنامہ ''نقش کوکن'' ایک علاقائی یا مقامی رسالہ تھا جو نقش کوکن پبلی کیشن ٹرسٹ کا ترجمان رسالہ تھا مگر اس کا حلقہ قارئین صرف ''کوکن'' ہی تک محدود تھا۔ اس لیے اس میں شائع ہونے والا مواد بھی پیدائش، وفات ڈگریوں کے حصول اور اعلیٰ منصب کے حصول وغیرہ سے ہی متعلق ہوتا تھا اور اس رسالے کے اجراء کا مقصد اہل کوکن کو کوکن کے حوالے سے معلومات فراہم کرنا تھا۔ مگر عبدالستار دلوی نے جب رسالے کے مدیر فقیر محمد مشتری کو مشورے دیے

کہ وہ کیسے ماہنامہ ''نقش کوکن'' کے شائع ہونے والے مواد میں تبدیلی کر کے اس میں ادبیت پیدا کر سکتے ہین۔اس کا حلقہ قارئین وسیع کر سکتے ہیں تو فقیر محمد مشتری نے جواب میں کہا ''جو کرنا ہے آپ ہی کیجیے'' اوراس وقت سے آپ چار سال تک ماہنامہ ''نقش کوکن'' کے مدیر رہے۔ان چار سالوں میں آپ نے رسالے میں ادبیت پیدا کی، قارئین کو ادبی ذوق دیا۔جس کے لیے آپ نے رسالے میں شائع ہونے ولاے مواد میں تبدیلیاں کیں جیسے اب اس میں پیدائش اور وفات کی خبروں کے ساتھ ساتھ مختلف موضوعات پر مضامین بھی شائع ہوتے تھے بالخصوص یکم مئی کو مہاراشٹر دیوس Maharashtra Diwas منایا جاتا ہے تو آپ اسی مناسبت سے ہر سال مئی میں مراٹھی نمبر شائع کرتے تھے۔جس میں کبھی سنت گیا نیشور نمبر شائع ہوا،کبھی مراٹھی کہانیوں کے تراجم شائع ہوئے تو کبھی مراٹھی شاعری کے اردو تراجم شائع ہوئے جس کو موضوع بنا کر مراٹھی کے سب سے بڑے اخبار (The marathi Times) میں پروفیسر را۔ بھی جوشی نے ایک طویل آرٹیکل لکھا اور اردو میں مراٹھی سے متعلق ہو رہی ان سرگرمیوں کو سراہا۔مختصرا کہا جاسکتا ہے کہ آپ نے چار سال میں رسالے کے نہ صرف معیار میں اضافہ کیا بلکہ علاقہ ''کوکن'' کے باہر بھی حلقہ قارئین تیار کر دیا۔

3۔ رسالہ ''امکان'' (1975-1987ء):

رسالہ ''امکان'' مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی کا ترجمان رسالہ ہے۔اس رسالے کے مدیر حسن کمال (مشہور شاعر وصحافی) تھے مگر حسن کمال اپنی مختلف سرگرمیوں (شاعری،صحافت اور سیاست) کے چلتے سفر میں زیادہ وقت گزارتے تھے۔اسی لیے اس رسالے کے مدیر کے فرائض عبدالستار دلوی ہی انجام دیتے تھے کیوں کہ آپ اکادمی کے بانی جوائنٹ سکریٹری خواجہ عبدالغفور (IAS Office) کی موجودگی میں تمام سرگرمیاں انجام دیتے تھے۔جس میں رسالے ''امکان'' کی ادارت بھی شامل ہے۔دراصل اس خصوص میں اکادمی کا ایک اڈیٹوریل بورڈ بھی تھا۔جس کے اراکین میں خواجہ عبدالغفور،عبدالستار دلوی،سلمہ صدیقی ودیگر شامل تھے۔آپ نے اپنی جوائنٹ سکریٹری شب میں ''امکان کے تعداد میں کم مگر ضخیم چار شمارے منظر عام پر لائے اور اردو حلقوں میں انھیں پسند بھی کیا گیا۔

4۔ سہ ماہی ''نوائے ادب'':

سہ ماہی ''نوائے ادب''، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی سے 1950ء سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے سب سے پہلے مدیر ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی تھے۔ تب سے لے کر آج تک یہ سہ ماہی رسالہ اپنی مندرجہ ذیل خصوصیات کو شعوری طور پر اپنائے ہوئے ہیں۔

1۔ اردو زبان وادب سے متعلق مختلف پہلوؤں پر بحث وتنقید۔

2۔ گجرات ودکن کی غیر مطبوعہ اردو تصانیف کی بالخصوص اشاعت

3۔ اردو سے متعلق تحقیقاتی کاموں کی اطلاع۔

4۔ اردو کے علمی وادبی رسائل کے مضامین کی تلخیص واشاعت

5۔ اردو ودیگر کتب پر تبصرے

سہ ماہی ''نوائے ادب'' ان خصوصیات کے ساتھ ساتھ اپنے بے باکانہ اداریوں کی وجہ سے ادب کے سنجیدہ قارئین میں مقبول عام کا درجہ رکھتا ہے۔ اوا گراس کے مشمولات پر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ماضی میں خصوصی نمبر اور گوشے شائع کرنے کی روایت نہیں رہی ہے مگر عبدالستار دلوی 2007ء سے یعنی ایک دہائی سے اسی رسالے کی ادارت سنبھالے ہوئے ہیں تو انہوں نے مخصوص موقعوں پر مخصوص نمبر و گوشے شائع کیے ہیں جیسے علامہ اقبال نمبر، علی سردار جعفری نمبر، علامہ شبلی نعمانی نمبر، سرسید نمبر اور گوشوں میں گوشہ رالف رسل اور اردو ذریعہ تعلیم اور اس کی عصری معنویت اور ممبئی کے اساتذہ وغیرہ وغیرہ۔ چوں کہ یہ اردو کے سنجیدہ قارئین کے لیے کیا جاتا ہے اسی لیے اس میں لکھنے والوں میں یونی ورسٹیوں کے پروفیسر حضرات اور استفادہ کرنے والوں میں ریسرچ اسکالرس ہی دکھائی دیتے ہیں۔

مختصراً یہ کہ عبدالستار دلوی نے بہ حیثیت مدیر ماہنامہ ''ہندوستانی زبان''، ''نقش کوکن''، ''امکان'' اور ''سہ

ماہی نوائے ادب'' کی ترتیب وتزئین کی ہے جن میں ''نقش کوکن'' کا معیار نیم ادبی ہی سہی رسالے، امکان کے شماروں کی تعداد کم ہی سہی رسالے ''ہندوستانی زبان'' میں زبان ہندوستانی کے پیش نظر مکمل معیار و خالص اردو سے پرہیز کے باوجود، ان تینوں رسالوں میں عبدالستار دلوی نے بہ حیثیت مدیر ادبیت قائم رکھنے کی کامیاب کوشش کی، رسالوں کے معیار کو بلند کیا۔ علاوہ ازیں ان رسالوں کے اجرأ میں جو مقاصد پیش نظر تھے۔ ان کی بھی تکمیل کی جہاں تک سہ ماہی ''نوائے ادب'' کا تعلق ہے۔ آپ نے پچھلے دس سالوں میں بہ حیثیت مدیر جہاں اس کے کھوئے ہوئے معیار کو حاصل کر لیا وہیں دوسری طرف نئی روایات کا اہتمام کر کے اسی رسالے کو اردو رسالوں کی فہرست میں ایک نمایاں مقام دلایا ہے۔ جس بنا پر عبدالستار دلوی کو کامیاب مدیر و ادبی صحافی کہا جا سکتا ہے۔

4.6۔ عبدالستار دلوی کے پڑھے گئے سمینارس، لکچرز و توسیعی خطبات

کالجس یونی ورسٹیوں اور مختلف ادبی اداروں میں آئے دن سمینار و خطبات منعقد ہوتے رہتے ہس۔ کیوں کہ یہ ہماری ادبی سرگرمیوں کا ایک بڑا اہم ذریعہ ہیں۔ علاوہ ازیں موجودہ دور میں صدی سمینارس اور صدی تقاریب کا چلن عام ہو گیا ہے۔ ایسے میں مختلف شاعروں وادیبوں کے صد سالہ یوم پیدائش یا صد سالہ یوم وفات پر بھی سمینارس و خطبات کا اہتمام کیا جانے لگا ہے اور تو اور اداروں و یونی ورسٹیوں کی صد سالہ تقاریب کے موقعوں پر بھی سمینارس و خطبات کا انعقاد عمل میں لایا جا رہا ہے۔

عبدالستار دلوی نے متعدد اداروں و یونی ورسٹیوں کے صدر ڈائرکٹر و پروفیسر کی حیثیت سے اپنے شعبے و اداروں میں جو سمینارس و خطبات منعقد کیے ہیں۔ ان کی تفصیل آپ کی، علمی خدمات کے ذیل میں تحریر کی جا چکی ہے۔ اور آپ کے بیرون ملک پڑھے گئے سمینارس و خطبات کا احاطہ آپ کے ''اسفار'' کے تحت رقم کیا جا چکا ہے۔ اور اب یہاں دوبارہ ان کا جائزہ لینا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اسی لیے یہاں صرف آپ کے اندرون ملک دیے گئے چند لکچرز و خطبات گنوائے جا رہے ہیں۔

1۔ عبدالستار دلوی نے 21 / دسمبر 1995ء کو سلیمان خطیب میموریل کلچرل اینڈ ایجوکیشنل ٹرسٹ گلبرگہ کے زیر اہتمام خطبہ پڑھا۔

2۔ عبدالستار دلوی نے 12 / جنوری 2002ء کو ''اسماعیل یوسف کالج''، ممبئی اور ہندوستان میں مشرقی علوم کے مطالعے کی عصری معنویت'' کے موضوع پر خطبہ پڑھا۔

3۔ عبدالستار دلوی نے 30 / مارچ 2004 کوکن انٹرنیشنل ممبئی کی دعوت پر'' کوکن: کوکنی مسلمان اور اردو'' کے موضوع پر خطبہ دیا۔

4۔ عبدالستار دلوی نے 2005 میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں ''اقبال کا تصور زبان'' کے موضوع پر خطبہ دیا۔

5۔ عبدالستار دلوی نے 2016ء میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں ''ہندوستان میں مشرقی علوم کے مطالعے کی عصری معنویت'' کے موضوع پر خطبہ پڑھا۔

6۔ عبدالستار دلوی نے 29 / جنوری 2014 کو یونی ورسٹی آف حیدرآباد میں علی سردار جعفری کی صد سالہ یوم پیدائش کے موقع پر ''یادیں''، باتیں، ملاقاتیں کے عنوان سے خطبہ دیا۔

7۔ عبدالستار دلوی نے 2017ء میں شعبہ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں ''ہندوستان میں فارسی کی لسانی اور تہذیبی معنویت کے موضوع پر خطبہ دیا۔

8۔ عبدالستار دلوی نے 27 / فروری 2018ء کو شعبہ فارسی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی کے ترجمہ سیمینار میں ''ترجمے کی تہذیب معنویت، مراٹھی اور تلگو کے حوالے سے'' کے موضوع پر کلیدی خطبہ پڑھا۔

عبدالستار دلوی نے اپنے ادبی سفر میں متعدد سیمناروں، لکچروں و توسیعی خطبات دیے ہیں جو اپنے مختلف شعبوں سے متعلق ہونے کے باوجود کامیابی سے ہم کنار ہو کر مثال و حوالہ جاتی بن گئے ہیں۔ آپ کے دیے گئے سیمنارس و خطبات سے متعلق پروفیسر محمد انوار الدین لکھتے ہیں:

''دلوی صاحب نے بے شمار ملک گیر نوعیت کے سیمناروں اور سمپوزیموں میں

شرکتا کی ہے اور اپنے بلند پایہ تحقیقی تنقیدی مقالوں کے ذریعے ان علمی مجالس کے موضوعات کونئی جہت اور نئے امکانات سے روشناس کرایا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اکثر سمیناروں میں ان کے مقالات کو حاصل سمینار تسلیم کیا گیا۔ سمیناروں کے علاوہ انہوں نے ہندوستانی کی مختلف جامعت میں نہایت اہم موضوعات پر توسیعی خطبات بھی دیے ہیں۔ان کے خطبات سے نہ صرف طلبہ ریسرچ اسکالرس کو بصیرت اور روشنی حاصل ہوئی ہے بلکہ اساتذہ نے بھی ان سے مستفید ہونے کا اعتراف کیا ہے۔''

(ماہنامہ''کتاب نما''پروفیسر عبدالستار دلوی نمبر، پیش گفتار، فروری 2006،ص:7)

پروفیسر محمد انورالدین کے اس اقتباس سے جہاں عبدالستار دلوی کے پڑھے گئے سمینارس وخطبات کی اہمیت وکامیابی کا پتہ چل رہا ہے وہیں آپ سے طلبہ کے ساتھ ساتھ قابل اساتذہ کے بھی استفادے کا علم ہورہا ہے۔ اسی لیے ہم اس اقتباس کی روشنی میں عبدالستار دلوی کو ایک عمدہ مقرر اور اعلیٰ پائے کا خطیب قرار دے سکتے ہیں۔

4.7۔ عبدالستار دلوی کے قلم بند''پیش لفظ'':

پیش لفظ وہ تحریر ہوتی ہے جو کسی بھی کتاب کی اہمیت بڑھا سکتی ہے کیوں کہ پیش لفظ مصنف اپنے کسی کرم فرما و استاد وغیرہ سے فرمائش کر کے لکھواتا ہے تو وہ اس میں صرف مصنف کی تعریف اور اس کے کام کی خوبیوں کو بیان کرتے ہیں۔غرض کہ رواداری سے کام لیا جاتا ہے جب کہ پیش لفظ کا اصل مقصد ہے کہ کوئی بھی ادیب، شاعر یا کرم فرما پیش لفظ لکھنے سے پہلے کتاب کے سودے کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد اس کی روشنی میں صاحب کتاب اور کتاب کی خوبیوں ور خامیوں دونوں پر اپنی ناقدانہ رائے دے۔جس سے کتاب اور صاحب کتاب (مصنف) دونوں کی قدر و قیمت متعین ہو سکے۔فن پیش لفظ سے متعلق ان چند نکات کی روشنی میں اب ہم عبدالستار دلوی کے مختلف کتابوں پر، مختلف اوقات میں اور مختلف موضوع سے متعلق سپردقلم کیے گئے پیش لفظوں کا

مطالعہ کرنے کی کوشش کریں گے۔

1۔ وقت کی صدیاں:

''وقت کی صدیاں'' داؤد غازی کا مجموعہ کلام ہے۔جس کو ان کے انتقال کے بعد بدیع الزماں خاؔور اور یعقوب راہی نے مرتب کر کے کوکن اردو رائٹرز گلڈ سے 1970 میں شائع کروایا تھا۔جس پر عبدالستار دلوی نے ''پیش لفظ'' کے عنوان سے تقریباً تین صفحے قلم بند کیے ہیں جس میں انہوں نے شاعر کے کلام کا گہرائی سے مطالعہ کے بعد اپنی ناقدانہ رائے بھی دی ہے جو داؤد غازی کی شاعری کو پڑھنے اور سمجھنے میں مدد کرتی ہے۔اب دوبارہ داؤد غازی کی شاعری کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر وقار قادری نے اس مجموعے کو حسامی کرروی پبلی کیشنز رتنا گری سے شائع کیا ہے تو اس میں داؤد کی شاعری سے متلق پروفیسر یونس اگاسکر، ڈاکٹر محمد حسن کے مضامین کا اضافہ بھی کیا ہے مگر عبدالستار دلوی کا پیش لفظ جوں کا توں رکھا گیا ہے۔جس سے اس پیش لفظ کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔

2۔ خوشبو (مراٹھی نظموں کے اردو تراجم):

''خوشبو'' دراصل مراٹھی سے اردو منظوم تراجم کا گلدستہ ہے جس کے مترجم بدیع الزماں خاؔور ہیں۔ جو بنیادی طور پر اردو زبان کے باکمال شاعر ہیں۔مگر انہوں نے اپنی مراٹھی سے واقفیت کی بنا پر مسلم الثبوت مراٹھی شعراء کی نظموں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے جو ''خوشبو'' کے عنوان سے 1974ء میں نقش کوکن پبلی کیشن ٹرسٹ سے شائع ہوا۔تو ان منظوم تراجم کو اپنے پیش لفظ سے اردو دنیا میں متعارف کرانے والے عبدالستار دلوی ہیں جنھوں نے اپنے پیش لفظ میں فن ترجمہ کی اہمیت، مترجم کی ذمہ داری، مراٹھی سے اردو تراجم کی روایت اور اس خصوص میں خاؔور اور ''خوشبو'' دونوں کا تعارف کرایا ہے۔اور امید ظاہر کی ہے کہ خاؔور کی اس کوشش کو اردو دنیا میں سراہا جائے گا۔

3۔ اردو اور ہندی کا لسانیاتی رشتہ:

ڈاکٹر رام آسرا رازؔ کی تصنیف ''اردو اور ہندی کا لسانیاتی رشتہ'' 1975ء میں راز اینڈ سنز، دہلی سے شائع

ہوئی ہے۔ یہ موضوع عبدالستار دلوی کے خصوصی موضوعات میں سے ایک ہے۔شاید یہی وجہ رہی ہوگی کہ ڈاکٹر راز نے اس کتاب پر پیش لفظ لکھنے کے لیے آپ ہی کا انتخاب کیا تو آپ نے بھی مصنف کی توقعات پوری کرتے ہوئے ہندوستانی زبان، اردو ہندی کا جھگڑا، آزادی کے بعد اردو کی صورت حال جدید ہندی کی ترقی وفروغ سے بحث کرتے ہوئے ایک جامع پیش لفظ قلم بند کیا ہے۔

4۔ تلسی داس اور رام چرت مانس:

''تلسی داس اور رام چرت مانس'' ڈاکٹر صفدر آہ کی تحقیقی وتنقیدی تصنیف ہے جو دراصل اردو میں تلسی داس کی حیات، شاعری اور انکی رامائن پر پہلی تصنیف ہے جس کے لیے ڈاکٹر صفدر آہ تمام اردو والوں کے شکریے کے مستحق ہیں۔مگر عبدالستار دلوی نے اس کتاب پر جو جامع پیش لفظ لکھا ہے۔اس سے ان کی ہندوستان کے مقامی ادبیات (دیسی ادبیات) سے دلچسپی کا پتہ چلتا ہے کیوں کہ آپ نے اس پیش لفط میں اودھی ادب تلسی داس اور ملک محمد جائسی پر گفتگو کی ہے۔اس کے علاوہ تلسی داس اور ان کی رامائن پر جو تفصیلی انداز اختیار کیا ہے وہ آپ ہی کا خلاصہ ہے۔ یہ کتاب 1977ء میں مہاتما گاندھی ریسرچ سنٹر اور لائبریری سے شائع ہوئی ہے۔

5۔ تصحیح اور تحقیق متن:

''تصحیح اور تحقیق متن'' پروفیسر نذیر احمد کے شعبہ اردو، بمبئی یونی ورسٹی میں دیے گئے سلسلہ وار لکچرز کا مجموعہ ہے جو 22 تا 24 مارچ 1987ء میں دیے گئے تھے جس کو 1988ء میں صدر شعبہ اردو پروفیسر عبدالستار دلوی نے اپنے پیش لفظ کے ساتھ ممبئی یونی ورسٹی سے ہی شائع کیا ہے۔جس میں انہوں نے متنی تنقید کی تعریف اور تاریخ بتاتے ہوئے اس سلسلے میں پروفیسر نذیر احمد کی خدمات اور ان مخصوص لکچرز کی اہمیت بتائی ہے۔

6۔ کوسے:

''کوسے'' ڈاکٹر رشید موسوی کی تصنیف ہے جو جولائی 2005ء میں حیدر آباد سے شائع ہوئی ہے جس

میں عبدالستار دلوی کا پیش لفظ ہے۔ آپ نے اس پیش لفظ میں روزمرہ کی زبان اور اس کی مختلف سطحیں بتاتے ہوئے، ان کے استعمال کیے جانے والے کوسوں کا تفصیلی مطالعہ کیا ہے اور خصوصی طور پر مردوں کی گالیاں، عورتوں کی گالیاں اور عورتوں کے کوسے مثالوں کے ساتھ قلم بند کیے ہیں۔

7۔ اٹھارہ منتخب افسانے:

''اٹھارہ منتخب افسانے'' دراصل پنڈت سدرشن کے افسانوں کا انتخاب ہے۔ جس کو ڈاکٹر شرف النہار نے مرتب کر کے 2011ء میں موڈرن پبلی شنگ ہاؤس سے شائع کیا ہے اور اس کا پیش لفظ عبدالستار دلوی کے قلم کا نتیجہ ہے جس میں انہوں نے افسوس ظاہر کیا کہ ہمارے ناقدین نے پنڈت سدرشن اور ان کے فن کو سرے سے نظر انداز کیا ہے اور ڈاکٹر شرف النہار کے اس موضوع کو منتخب کیے جانے پر اظہار مسرت کیا ہے۔ اتنا ہی نہیں انہوں نے پنڈت سدرشن سے اپنے شخصی مراسم اور چند دلچسپ واقعات بھی پیش لفظ میں بیان کیے ہیں۔

8۔ رسول اکرم ﷺ کی سیرت اور تعلیمات کی عصری معنویت:

معین الدین حارث ایک صحافی، مجاہد آزادی، سیاست داں اور سماجی مصلح کے حیثیت سے جانے اور مانے جاتے ہیں۔ وہ سابق صدر انجمن اسلام رہے ہیں۔ اور انہوں نے اپنے دور صدارت میں اپنے عطیہ سے سالانہ سیرت لکچر کا آغاز کیا تھا جو آپ کی وفات کے بعد سے معین الدین حارث میموریل سیرت لکچر کے نام سے موسوم کیے گئے ہیں۔

پیش نظر کتابچہ پروفیسر عبدالرحمٰن مومن کا دیا ہوا معین الدین حارث میموریل سیرت لکچر: 2011ء ہے جس میں عبدالستار دلوی کا ابتدائیہ ہے جس میں انہوں نے معین الدین حارث اور پروفیسر عبدالرحمٰن مومن دونوں کا تعارف پیش کیا ہے یہ کتابچہ 2011 میں انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے شائع ہوئی ہے۔

9۔ شاہ وجیہ الدین علوی گجراتیؒ: احوال و آثار:

پیش نظر کتاب مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی کی تصنیف ہے جو 2015ء میں انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے شائع ہوئی ہے۔عبدالستار دلوی نے اس کتاب کا پیش لفظ لکھا ہے۔جس میں آپ تصوف کے متعدد اسکولس،صوفیائے کرام اور ان کے ملفوظات کا ذکر کرتے کرتے حضرت شاہ وجیہ الدین علوی گجراتیؒ تک پہنچتے ہیں اور ان کی بحر الحقائق کا خصوصی ذکر کرتے ہیں۔اس کے علاوہ مولانا پرواز اصلاحی کی ایک اور کتاب ''حضرت مخدوم علی مہائمیؒ: احوال و آثار'' پر بھی گفتگو کی ہے کیوں کہ مولانا کو حضرت مہائمیؒ کے ماخذات کی تلاش کے دوران ہی بحر الحقائق کا نسخہ حیدر آباد میں دستیاب ہوا تھا۔

10۔ آغا حشر کاشمیری اور ممبئی کا پارسی اردو تھیٹر:

''آغا حشر کاشمیری اور ممبئی کا پارسی اردو تھیٹر'' ڈاکٹر مزمل سرکھوت کی تصنیف ہے جو دراصل ان کا ایم فل کا مقالہ ہے۔جس کو انہوں نے ترمیم اضافہ کر کے 2015ء میں شاہد حسین پبلی کیشنز سے شائع کروایا ہے اس کتاب میں بھی عبدالستار دلوی نے پیش لفظ لکھا ہے جو آغا حشر کاشمیری اور بمبئی کا پارسی اردو تھیٹر سے متعلق معلومات فراہم کرتا ہے انہوں نے مزمل سرکھوت کی جانب سے اس موضوع کو تحقیق بنائے جانے پر اظہار مسرت کیا ہے اور آخر میں امید ظاہر کی ہے کہ مزمل سرکھوت اسی طرح عمدہ تحقیقی کارناموں سے اردو کا دامن وسیع کریں گے۔

11۔ قطب مشتری:

''قطب مشتری۔تحسین وتخمین'' پروفیسر م ن سعید کی مرتبہ تصنیف ہے جو 2015ء میں سنٹر فار اسٹڈیز ریسرچ ان دکنی سے شائع ہوئی ہے۔عبدالستادلوی نے اس کے پیش لفظ میں دکنی ادب کی اہمیت،دکنی محققین اور ان محققین میں پروفیسر م ن سعید اور ان کی پیش کردہ تصنیف قطب مشتری پر گفتگو کی ہے۔

12۔ سرودرفتہ:

''سرودِ رفتہ'' شاہد عمادی کے شخصی خاکوں کا دوسرا مجموعہ ہے، جو 2017ء میں نعمانی آفسیٹ پریس، ''گولہ گنج،'' لکھنؤ سے شائع ہوا ہے۔ مذکورہ کتاب کا بھی پیش لفظ عبدالستار دلوی نے قلم بند کیا ہے جس میں انہوں نے شخصی خاکوں کا تعارف، مختصر تاریخ، مولانا ابراہیم عمادی، شاہد عمادی اور نقوش رفتہ وغیرہ وغیرہ سے کلام کیا ہے اور شاہد عمادی کے ممدوحین کا مختصر تعارف بھی پیش کر دیا ہے۔ جن کی خاص بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر و بیشتر کا تعلق شہر بمبئی ہی سے ہے اور آخر میں شاہد عمادی کے طرز اسلوب پر بات کی ہے۔

عبدالستار دلوی نے اردو تصانیف کے ساتھ ساتھ کچھ انگریزی تصانیف کے بھی دیباچے یا پیش لفظ تحریر کیے ہیں ان تصانیف کے نام اس طرح ہیں:

1. INDIA : A Polyglot Nation and its Linguistic Problems

(By Suniti Kumar chaterji)

2. Many Languages and one Nation : Problem of Intergration

(By Dr. V.K.R.Rao)

3. A Third Look at our Language Problem

(By Bodruddin Tayyabji)

4. The Place and Position of a Link Language in the Multi Lingual Set up of India.

(By Dr.M.Satyanarayan)

عبدالستار دلوی کے قلم سے نکلے ان مختلف پیش لفظوں کا جائزہ لینے پر معلوم ہوتا ہے کہ ان پیش لفظوں کی سب سے بڑی خصوصیت اختصار و جامعیت ہے۔ کیوں کہ انہوں نے اکثر دو سے تین صفحات میں اس موضوع کے متعلقہ تمام پہلوؤں کا احاطہ کر دیا ہے اسی لیے کوئی بھی پہلو تشت محسوس نہیں ہوتا۔

ان پیش لفظوں کی دوسری خصوصیت متنوع موضوعات ہیں۔ دراصل یہ موضوعات مذہب، زبان اور ادب وغیرہ وغیرہ مختلف میدانوں سے متعلق ہونے کے باوجود آپ نے ان پر لکھتے وقت جس ایمانداری اور ہنر مندی کا مظاہرہ کیا ہے وہ آپ کے وسیع مطالعہ اور بالغ نظری کا ثبوت ہے۔

ان پیش لفظوں کی تیسری اور اہم خصوصیت غیر رواداراور غیر جانبدار ہے۔ کیوں کہ اگر آپ غیر رواداراور غیر جانبدنہ ہوتے اپنے کم وبیش ساٹھ سالہ علمی، ادبی و لسانی سفر میں آپ کے قلم زد پیش لفظوں کی فہرست طویل ہوتی۔

4.8۔ عبدالستار دلوی بہ حیثیت محرک یا تحریک کار

عبدالستار دلوی نے بہ حیثیت مرتب، بہ حیثیت محقق، بہ حیثیت ناقد، بہ حیثیت ماہر لسانیات اور بہ حیثیت مترجم جہاں مختلف موضوعات پر مختلف اوقات میں، مختلف کتابیں اردو زبان و ادب کو دیں ہیں۔ وہیں آپ نے تحریک دے کر، موضوع کے ماہرین سے کتابیں تصنیف و ترجمہ بھی کروائیں ہیں۔ جس کے لیے وہ مصنفین اور مترجمین ہمیشہ آپ کی کرم فرمائیوں اور مدد کا بار بار اعتراف کرتے نہیں تھکتے۔ لہٰذا ان تصنیف و ترجمہ کردہ کتب کا کچھ تفصیلی مطالعہ کر کے معلوم کرتے ہیں کہ عبدالستار دلوی کب، کیسے، کیوں اور کس طرح ان کے لیے محرک بنے۔

تصانیف:

ایسی تصانیف کے ذیل میں دو تصانیف ہیں جن کے مصنف مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی ہیں۔ ان تصانیف کے نام یہ ہیں:

1۔ حضرت مخدوم علی مہائمیؒ : احوال و آثار

1۔ حضرت مخدوم علی مہائمیؒ : احوال وآثار

واقعہ یہ ہے کہ عبدالستار دلوی کو قطب کوکن حضرت مخدوم علی مہائمیؒ پر ایک تحقیقی کتاب کی کمی ہمیشہ سے محسوس ہوتی رہی مگر انھیں اس بات کا بھی شدید احساس تھا کہ وہ خود ایسی تحقیق نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ وہ عربی، فارسی، حدیث، فقہ اور اسلامی علوم کے ماہر نہیں ہیں۔اسی لیے وہ کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھے اسی سلسلے میں آپ کی ملاقات مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی سے ہوئی تو انہوں نے پہلے تو انکار کیا مگر بعد میں رضامند ہوگئے اور مولانا نے مواد کی تلاش میں مختلف مقامات بالخصوص حیدرآباد، گجرات اور اعظم گڑھ کے کئی اسفار کیے اور ایک اعلیٰ پائے کی تحقیقی کتاب لکھ کر مسودہ عبدالستار دلوی کے حوالے کر دیا۔جس کو آپ نے اپنے ایک دوست کریم الدین نائک کے مالی تعاون سے 1976ء میں شائع کیا تو یہ کتاب حضرت مخدوم علی مہائمیؒ پر دستاویز کی حیثیت حاصل کر گئی۔اب اس کا دوسرا ایڈیشن بھی منظر عام پر آچکا ہے۔مگر پھر بھی یہ کتاب کمیاب و نایاب ہے۔

2۔ شاہ وجیہ الدین علوی گجراتیؒ : احوال وآثار

شاہ وجیہ الدین علوی گجراتیؒ: احوال وآثار کے مصنف مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی جب اپنی مشہور کتاب ''حضرت مخدوم علی مہائمیؒ: احوال وآثار کے دوران تصنیف حضرت کے ماخذات کی تلاش میں حیدرآباد کے کتب خانوں کا دورہ کیا تو انھیں ''بحرالحقائق'' کا مخطوطہ کسی اور مخطوطے کے ساتھ مجلد دستیاب ہوا تو انہوں نے اس مخطوطے کو بنیاد بنا کر ''شاہ وجیہ الدین علوی گجراتیؒ: احوال وآثار'' تصنیف کی مگر وہ اس کی طباعت سے قاصر تھے اسی لیے اس کتاب کا مسودہ عبدالستار دلوی کے پاس تقریباً 38 سال امانت کے طور پر رکھا رہا۔اس دوران انہوں نے متعدد اشخاص و اداروں سے اس کتاب کی طباعت میں مالی اشتراک کے لیے کوشش کیں مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔مگر 2015ء میں انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے اسے ڈائرکٹر عبدالستار دلوی کے پیش لفظ کے ساتھ شائع کیا

ہے۔

یہ دونوں ہی کتابیں ہمارے صوفی بزرگوں کے احوال بیان کرتی ہیں جن پر اب تک کوئی تحقیق نہیں تھی۔ مولانا پرواز اصلاحی ان دونوں ہی کتابوں کے مصنف کی حیثیت سے اعلیٰ پائے کے محقق قرار دیے جاسکتے ہیں اور ان دونوں ہی کتابوں کی تحریک دے کر، مواد کی فراہمی میں مددگار بن کر اور طباعت کی دشواریوں کو آسان بنانے کے لیے مصنف کے ساتھ ساتھ تمام اردو حلقوں کو عبدالستار دلوی کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

تراجم:

ایسے تراجم کے ذیل میں بھی دو منظوم ترجمے ملتے ہیں، جن کے ترجمے کرنے کی تحریک مترجم کو عبدالستار دلوی نے ہی دی تھی۔ وہ دو منظوم تراجم اس طرح ہیں:

1۔ مثنوی نہ سپہر (فارسی سے اردو)

2۔ بدیع الزماں خاورؔ کے منظوم تراجم (مراٹھی سے اردو)

1۔ مثنوی نہ سپہر:

''مثنوی نہ سپہر'' حضرت امیر خسرو کی فارسی رزمیہ مثنوی ہے جو ہمارے لیے نہ صرف ادبی بلکہ تہذیبی ورثہ بھی ہے۔ اسی لیے عبدالستار دلوی کی خواہش تھی کہ اس مثنوی کو اردو کے قالب میں ڈھالا جانا چاہیے مگر انھیں اس بات کا بھی اندازہ تھا کہ وہ خود امر سر نہیں کر پائیں گے۔ اسی لیے وہ کسی فارسی، اردو داں کی تلاش میں تھے۔ آپ کی تلاش محمد رفیق عابد (زاہدی) پر آ خر ختم ہوگئی کیوں کہ محمد رفیق عابد (زاہدی) اردو، عربی اور فارسی پر غیر معمولی دسترس رکھتے تھے تو آپ نے ان سے خواہش کی کہ وہ مثنوی ''نہ سپہر'' کو اردو میں منتقل کریں وہ رضا مند ہوگئے۔ مگر انھیں اس ترجمے کے لیے مواد کی فراہمی کا مسئلہ تھا جس میں آسانی کا سبب بھی عبدالستار دلوی بنے۔ اس سے متعلق محمد رفیق عابد نے پیش لفظ میں یوں عبدالستار دلوی کا شکریہ ادا کرتے ہیں:

''ہم اپنے محترم کرم فرما جناب ڈاکٹر عبدالستار دلوی صاحب کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے نہ صرف ''نہہ سپہر'' کے ترجمے کی تحریک کی بلکہ کتاب بھی فراہم کی اور خسرؔو سے متعلق معلوماتی مضامین سے مدد فرمائی۔''

(مثنوی نہہ سپہر، ص:16)

محمد رفیق عابؔد (زاہدی) نے پیش لفظ میں اپنے اس اعتراف کے علاوہ انتساب کتاب بھی عبدالستار دلوی ہی کے نام معنون کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

''جناب ڈاکٹر عبدالستار دلوی کے نام جن کی کرم فرمائیاں اور نوازش بے پایاں اس ترجمے کی محرک ہیں۔''

فارسی مثنوی ''نہہ سپہر'' کا یہ اردو ترجمہ 1979ء میں مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہوا ہے اور اب اس کا دوسرا ایڈیشن مکتبہ جامعہ دہلی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی سے شائع ہوا ہے۔

2۔ بدیع الزماں خاوؔر کے منظوم تراجم (مراٹھی سے اردو):

جیسے بدیع الزماں خاوؔر اردو کے باکمال شاعر ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ ویسے ہی خاوؔر اور عبدالستار دلوی کے دیرینہ مراسم پر بھی کوئی حرف نہیں آسکتا۔ اور انہی دیرینہ و پرخلوص مراسم ہی کا نتیجہ تھا کہ عبدالستار دلوی نے خاوؔر کو مشورہ دیا کہ وہ اردو میں طبع آزمائی کے ساتھ ساتھ مراٹھی سے اردو منظوم ترجمہ کر کے اپنے کو دوسروں سے ممیّز کریں۔ تو خاوؔر نے بلا تامل آپ کے اس مشورے پر عمل کرتے ہوئے منتخب مراٹھی نظموں کے تراجم ''خوشبو'' (1974)، سبیل (1978) اور مراٹھی رنگ (1985) وغیرہ وغیرہ اردو دنیا کو دیے۔ ان منظوم تراجم کے محرک عبدالستار دلوی ہیں۔ اسی لیے خاوؔر نے ''خوشبو'' کا پیش لفظ آپ ہی سے لکھوایا ہے۔ سبیل کا انتساب آپ ہی کے نام کیا ہے اور ''مراٹھی رنگ'' کے پیش لفظ میں آپ سے متعلق یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

''میں اپنے اردو دوستوں میں اگر کسی کا سب سے زیادہ شرمندۂ احساس ہوں تو وہ

میرے محبّ محترم ڈاکٹر عبدالستار دلوی کی ذات گرامی ہے جو میری ادبی زندگی کے اوائل ہی سے مجھ جیسے ایک معمولی ذرے کو چمکا کر آفتاب بنانے میں اس محویت کے ساتھ لگے ہوئے ہیں جیسے اپنا کوئی مذہبی فرض ادا کر رہے ہوں۔ ان کی محبتوں، نوازشوں اور شفقتوں کے بارے میں زندگی بھر سبکدوش نہیں ہوسکتا۔'' (مراٹھی رنگ، ص:15)

غرض خاورؔ نے عبدالستار دلوی کے مشورے پر مراٹھی سے اردو تراجم کیے اور اس میں وہ مقام پیدا کیا کہ مراٹھی سے اردو منظوم مترجم ہی آپ کی پہچان بن گئی ہے۔

مختصراً یہ کہ عبدالستار دلوی کے میدان اور موضوعات میں تنوع ہے مگر پھر بھی بعض موضوعات ایسے تھے جن پر قلم اٹھانے کے لیے آپ اپنے آپ کو نامناسب سمجھتے، ایسے میں آپ نے مناسب شخصیتوں کا انتخاب کر کے ان سے ان موضوعات پر تصنیف، تالیف اور تراجم کروائیں تو یہ مصنفین و مترجمین اپنے ان ہی کارناموں کے لیے مقبول ہو گئے ہیں۔

oOo

﴾باب پنجم﴿

عبدالستار دلوی کی لسانی خدمات

عبدالستار دلوی کی لسانی خدمات

5۔ عبدالستار دلوی کی لسانی خدمات

5.1۔ اردو میں لسانیاتی تحقیق

5.1.1۔ اردو میں تلفظ کا مسئلہ

5.2۔ ادبی ولسانی تحقیق اصول وطریق کار

5.3۔ فرہنگ اصطلاحات

5.4۔ دکنی اردو

5.4.1۔ دکنی اردو سماجی لسانیات کی روشنی میں

5.4.2۔ دکنی اردو میں پر مراٹھی کا اثر

5.5۔ اروزبان اور سماجی سیاق

5.6۔ دوزبانیں، دوادب (اردو ہندی کے تناظر میں)

5.7۔ متفرق مطبوعہ لسانی مضامین

5.7.1۔ کربل کتھا کا لسانی مطالعہ (تبصرہ)

5.7.2۔ لسانی ترسیل اور قومی یکجہتی

5.7.3۔ مہاراشٹر میں اردو لسانی منصوبہ بندی

5.7.4۔ بمبئی میں اردو کو مادری زبان کی حیثیت سے پڑھانے کا مسئلہ

5.7.5۔ جنوب ایشائی اتحاد اور اردو زبان

5.7.6۔ جدید تعلیم ،عصری ضرورتیں اور اردو

5.7.7۔ دکنی قدیم اردو یا بول

5.7.8۔ مہاتما گاندھی اردو اور اقبالؔ

5.7.9۔ قومی زبان اور مشترکہ تہذیب

5.7.10۔ اردو کی عامیانہ زبان

5.7.11۔ جدید قومی تہذیب میں اردو کی اہمیت

5.7.12۔ سر تیج بہادر سپرو، اردو اور قومی زبان کا مسئلہ

5۔ عبدالستار دلوی کی لسانی خدمات

لسانیات لفظ لسان سے مشتق ہے اور لسان کے لغوی معنی زبان یا جیب کے ہیں۔ وہیں اصطلاحی معنی میں لسانیات ''زبان کا سائنٹفک مطالعہ'' ہے۔ اسی لیے ڈیوڈ کرسٹل لسانیات کی تعریف کچھ اس طرح کرتا ہے:

> ''لسانیات کا علم سائنٹفک طریقے سے زبان کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس علم کا موضوع زبان ہے۔ اعلا العموم ایک زبان اور بالخصوص کئی زبانیں۔''
>
> (لسانیات کیا ہے؟، ص:59)

انگریزی اور اردو کے مختلف ماہرین نے لسانیات کی تعریفیں مختلف انداز سے کیں ہیں تو آیئے مختصراً انہیں بھی دیکھتے چلیں:

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کی رو سے لسانیات ''زبان کی سائنس'' ہے اور انگریزی ماہر لسانیات فرینک گینور کے مطابق لسانیات ''لفظوں اور قواعد'' کا سائنسی مطالعہ ہے وہیں ایک اور ماہر لسانیات باکٹ کا خیال ہے کہ ''زبان سے متعلق منظّم علم'' لسانیات ہے۔ اسی طرح معروف اردو محقق رشید حسن خان کہتے ہیں کہ لسانیات ''زبان کی ساخت کا سائنسی مطالعہ ہے، اور ایک محقق پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں کہ لسانیات ایک ''سماجی سائنس'' ہے۔

پیش نظر مختلف تعریفوں کو دیکھنے کے بعد با آسانی کہا جا سکتا ہے کہ لسانیات زبان کا سائنسی یا سائنٹفک مطالعہ ہے لیکن یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ سائنسی مطالعہ کس طرح کیا جاتا ہے؟ تو واضح کرتی چلوں کہ سائنسی مطالعہ کے چار مرحلے مشاہدہ تجزیہ مفروضہ اور دلائل ہوتے ہین جن کو ایک کے بعد دیگر پر عمل کرتے ہوئے سائنسی مطالعہ مکمل ہوتا ہے۔

لسانیات کو انگریزی میں ''Linguistics'' کہا جاتا ہے۔ جو لفظ ''Lingua'' سے بنا ہے۔ جس کو

فرانسیسی زبان میں(Linguisticque) کہتے ہیں۔ اور جہاں Daywhich اسے "glossology" کہتا ہے۔ وہیں Prechard اسے "glottology" کا نام دیتا ہے۔

لسانیات میں بول چال کی زبان کی اہمیت بہ مقابلہ تحریری زبان کے زیادہ ہوتی ہے کیوں کہ تحریری زبان کے لیے ایک معیار قائم کر دیا جاتا ہے اور سب اس کی پابندی کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف بول چال کی زبان میں ہر چالیس میل کے فاصلے پر تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ تحریر سے آوازوں کے ردوبدل، لہجے اور جملوں کی نوعیت کا پتہ نہیں چلتا۔ اسی تعلق سے ڈاکٹر اقتدار حسین یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔:

> ''تحریر میں بہت سی ایسی چیزیں جو زبانی گفتگو میں شامل ہوتی ہیں۔ ظاہر نہیں کی جاتیں جب کہ زبانی گفتگو میں یہ بہ خوبی عیاں ہوتی ہیں۔ مثلاً آوازوں کا ردوبدل، لہجے کی اونچ نیچ، جملوں کی نوعیت (سوالیہ، استفہامیہ یا خوف یا حیرت) کا اظہار وغیرہ۔''
>
> (لسانیات کے بنیادی اصول، ص:12)

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ جہاں بول چال کی زبان کا مطالعہ لسانیات ''Linguistics'' کہلاتا ہے وہیں تحریر زبان کے مطالعہ کو علم السنہ ''Philology'' کہتے ہیں۔ اور ان دونوں علوم میں فرق کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔

آیئے اب علم لسانیات کی اہمیت، افادیت اور ماہیت بھی دیکھتے چلیں:

1۔ اگر آپ علم لسانیات سے واقف ہیں تو یہ مطالعہ کر سکتے ہیں کہ ہماری زبان جو ہم بولتے یں وہ دوسروں سے کتنی مشابہ اور کتنی مختلف ہے۔

2۔ آپ علم لسانیات کے ذریعے یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ اپنی زبان کو ہم کتنا صحیح اور کتنا غلط استعمال کرتے ہیں۔

3۔ علم لسانیات سے دوسرے علوم جیسے علم نفسیات، علم سماجیات اور علم بشریات وغیرہ کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

4۔ اگر آپ پیشہ درس وتدریس سے وابستہ ہیں تو آپ کے لیے علم لسانیات کو جاننا نہایت ہی ضروری ہے۔

5۔ اگر آپ ایک مترجم ہیں اور اپنی Source Language اور Target Language پر عبور رکھتے ہیں تب بھی آپ کو علم لسانیات کا جاننا ضروری ہے تا کہ آپ اپنے ترجمے میں زبان سے متعلق غلط فہمیوں سے دور رہ سکے۔

6۔ اگر آپ ایک فکشن نگار ہیں تب بھی آپ کو علم لسانیات سے واقف ہونا چاہیے تا کہ آپ اپنے کرداروں کی زبان کے تعین میں محتاط رہیں۔

7۔ اگر آپ ایک شاعر ہیں تب بھی علم لسانیات الفاظ کے انتخاب میں آپ کی مدد کرے گا۔

8۔ اگر آپ ایک سماجی کارکن ہیں تب بھی علم لسانیات سے واقفیت آپ کے لیے ضروری ہے تا کہ آپ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی مدد کر سکیں۔

9۔ سرکاری سطح پر بھی علم لسانیات سے واقفیت مفید ہوگی کیوں کہ سرکاری زبان، مقامی زبانیں، بڑی زبانیں، چھوٹی زبانیں اور بولیوں وغیرہ کا تعین بھی علم لسانیات ہی کی مدد سے کیا جاتا ہے۔

علم لسانیات کی اہمیت بتانے کے لیے لسانیات کے اور بھی کئی فوائد گنوائے جا سکتے ہیں۔ مگر یہاں صرف چند ہی بیان کیے گئے ہیں۔ جن سے بھی علم لسانیات کی اہمیت کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

لسانیات ایک مشکل اور خشک علم ہے جس کے لیے زبان سے دلچسپی، قواعد، صرف ونحو اور زبان کے دیگر لوازمات سے واقفیت ضروری ہے۔ ان کے علاوہ دوسری معاون زبانیں جیسے اردو کو بہ حیثیت مادری زبان رکھنے والوں کو فارسی اور عربی سے بھی شناسائی ضروری ہے ورنہ علم لسانیات کو سمجھنا دشوار ہے۔ دراصل ابتدائی ادوار میں عربی فارسی کا چلن عام تھا تو ماہرین اردو، عربی اور فارسی پر یکساں دسترس رکھتے تھے۔ لیکن اب عربی فارسی کا چلن نہیں رہا جس کی وجہ سے زبان کا طالب علم اور ماہرین صرف اردو زبان تک محدود ہو گئے ہیں۔ اسی لیے اردو لسانیات کے سرمایہ میں اتنا اضافہ نہیں ہوا جتنا دوسری زبانوں کا ہے۔ ایسے میں ہمارے ماہرین لسانیات پر بڑی سنجیدہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ نہ صرف ہمارے لسانی سرمایے میں اضافہ کریں بلکہ ہمارے طلبہ وطالبات میں ابھی سے لسانی

ذوق وشوق پیدا کرے تا کہ وہ مستقبل میں ماہرلسانیات بن کرلسانی سرمائے میں اضافہ کا باعث بنے اور یہ روایت ایسے ہی آگے بڑھتی رہے اور کچھ ایسا ہی ہمارے ماہرین لسانیات نے کیا بھی ہے جیسے پروفیسر مسعود حسین خان اور پروفیسر احتشام حسین خان نے جب عبدالستار دلوی کا لسانی ذوق وشوق دیکھا تو انھیں نہ صرف ہمت وحوصلہ دیا بلکہ وقتاً فوقتاً اپنے مفید مشوروں سے نوازتے رہے جس کا لازمی نتیجہ آج کے پروفیسر عبدالستار دلوی کے روپ میں نمودار ہوا۔ اب آیئے اس پس منظر میں عبدالستار دلوی کی لسانی خدمات کا احاطہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

5.1۔اردو میں لسانیاتی تحقیق:

عبدالستار دلوی کی پہلی لسانی کاوش ''اردو میں لسانیاتی تحقیق'' کی شکل میں وجود میں آئی، جو درحقیقت لسانیات پر پہلے سے موجود حوالہ جاتی مضامین کا مجموعہ ہے۔جن کو مرتب کتاب نے چھ الگ الگ ابواب میں تقسیم کر دیا ہے اور اس کتاب میں ماہرلسانیات پروفیسر مسعود حسین خان کا لکھا ہوا پیش لفظ ہے۔جس میں انہوں نے اس کتاب کی اہمیت یوں بتائی ہے:

> ''ڈاکٹر دلوی نے لسانیات سے متعلق منتشر مضامین کا یہ انتخاب کر کے وقت کے اہم تقاضے کو پورا کیا ہے۔حرف وصوت، رسم خط، زبان اور بولی، لفظ و معنی اور صوت وشعر کے ابواب کے تحت انہوں نے اردو لسانیات سے متعلق وہ سب کچھ یکجا کر دیا ہے جو علمی لحاظ سے لائق اعتنا ہے اور لسانیات کا یہ سرمایہ تحقیقی اعتبار سے ایسا نہیں کہ ہم اس پر فخر کر سکیں۔تاہم اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ لسانیات کے بارے میں یہ پہلی کاوشیں ہیں۔''

(اردو میں لسانیاتی تحقیق،ص:ب)

عبدالستار دلوی اپنے مقدمے میں اردو زبان کے ابتدائی لسانی مطالعوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ محمد حسین آزاد وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنی قابلیت کے مطابق اردو کی ابتدا اور ترقی سے متعلق سائنٹفک انداز

سے آب حیات کا مقدمہ لکھا ہے اسی لیے یہ مقدمہ ہمارے پورے لسانی سرمایے کے لیے مقدمے کی حیثیت رکھتا ہے۔ دراصل آزاد سے پہلے انشا جدید لسانی اصولوں کے ذریعے اردو کی بولیوں کا جائزہ لے چکے تھے۔ مگر ان کے بعد اس میدان میں سائنٹفک طور پر کافی عرصے تک کوئی کام نہیں ہوا لیکن بعد کے زمانے میں پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، وحید الدین سلیم، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر مسعود حسین خان، پروفیسر گیان چند جین اور پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اس سلسلے کو آگے بڑھایا۔ اور اب وہ موجودہ دور کے ماہرین لسانیات کے لیے سمت اور رفتار متعین کرتے ہوئے ان مندرجہ ذیل سات موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں:

1۔ اردو کا صوتی تجزیہ

2۔ اردو کا صرفی ونحوی مطالعہ

3۔ اردو کی مختلف بولیوں کے جائزے

4۔ اردو زبان کی تدریس کا مسئلہ

5۔ اردو کے سماجی وثقافتی پہلو

6۔ ذولسانیات اور اردو

7۔ اردو لغت کی تدوین

انہوں نے متذکرہ بالا موضوعات میں سے دو، تین موضوعات جیسے اردو کا صوتی تجزیہ، اردو لغت کی تدوین اور اردو کا صرفی ونحوی مطالعہ کیسے اور کس طرح کیا جائے۔ اس پر تفصیلی گفتگو کی ہے جو ان سمتوں میں تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے مفید ہے۔

فاضل مقدمہ نگار، مقدمے میں آگے یہ بھی لکھتے ہیں کہ ہمیں سب سے پہلے لسانیات کو جدید علم کی حیثیت سے مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح ہند آریائی خاندان کی تاریخی اہمیت پر تحقیقی کام ہونا ابھی باقی ہے۔ اسی سلسلے

میں وہ دو تجاویز بھی پیش کرتے ہیں جن میں پہلی تجویز تو یہ ہے کہ ہمیں اپنے تحقیقی اداروں اور یونی ورسٹیوں میں پچاس فیصد کا ششم تو زبان سے متعلق کرنا ہوگا۔جس کی ذمہ داری طلبہ اور اساتذہ دونوں کو لینی ہوگی تاکہ لسانیات پر خاطر خواہ مواد جمع ہو سکے۔اور دوسری تجویز یہ ہے کہ اردو نصاب میں جدید لسانیات کی تعلیم کے کم از کم دو پرچے ضرور ہوں اور عام طور پر ہمارے لسانیات کورسس میں جو زبان کی تاریخ،مختلف نظریات وغیرہ پڑھائے جاتے ہیں ہم ان کو با آسانی تاریخ ادب اردو کے پرچے میں شامل کر سکتے ہیں۔اگر ان کی دونوں تجاویز پر ہماری یونی ورسٹیاں عمل کرتی ہیں تو طلبہ میں ایم اے کے سطح پر لسانیات کے نصاب میں شامل ہونے سے انکا ذوق وشوق بڑھے گا اور وہی طلبہ جب ایم فل اور پی ایچ ڈی میں پہنچ گئے تو اس ذوق وشوق کے پیش نظر وہ لسانی موضوعات پر تحقیقی کام کریں گے۔جس سے لسانیات کے سرمائے میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا۔

عبدالستار دلوی مقدمے میں اس کتاب کو مرتب کرنے سے متعلق لکھتے ہیں:

> ''میں نے مختلف رسائل اور کتابوں میں محفوظ اردو لسانیات سے متعلق بکھرے ہوئے مضامین کا یہ مجموعہ اردو زبان کے ماہر اساتذہ اور اس کی خدمت کا ذوق رکھنے والے طلبہ میں دیگر لسانی موضوعات پر کام کرنے کے لیے شوق کی آگ کو تیز کر دے گا۔'' (اردو میں لسانی تحقیق،دوسرا ایڈیشن،ص:xxv)

عبدالستار دلوی کے اس بیان سے اس کتاب کو مرتب کرنے کے پیچھے ان کا خیال ظاہر ہو رہا ہے جو اس دور میں ایک اہم پہل تھی اور لازمی ہے کہ بعد میں اس کی وجہ سے ماہر اساتذہ اور لسانی ذوق رکھنے والے طلبہ کے لسانی موضوعات پر کام منظر عام پر آئے ہوں گے اور ان کی وجہ سے اردو کے لسانی سرمایے میں اضافہ بھی ہوا ہوگا۔

اردو میں لسانیاتی تحقیق کا پہلا باب ''حرف وصوت'' کے عنوان سے ہے،جس میں سب سے پہلے مرتب کا ابتدائیہ ہے،جس میں وہ صوتیات کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

> ''صوتیات لسانیات کی اس شاخ کو کہتے ہیں جس میں اعضائے نطق سے پیدا

ہونے والی اصوات کا مطالعہ کیا جائے ۔۔۔۔۔صوتیات میں تمام زبانوں کی آوازوں کا مطالعہ ہوتا ہے۔اس کی مدد سے کسی بھی زبان میں استعمال ہونے والی آوازوں کی شناخت اور ان کا تعین ہوسکتا ہے۔صوتیات میں آوازوں کی ادائیگی کے وقت اعضائے نطق کی مختلف حالتیں، آوازوں کی مختلف اقسام مثلاً بندشی، ہکاری، حنکی ،صفیری، تالوی، انفی وغیرہ میں تقسیم کر دیتی ہے۔''

(اردو میں لسانی تحقیق،ص3)

عبدالستار دلوی نے اپنے پہلے باب کا عنوان ''حرف وصوت'' قائم کر کے ابتدائیہ لکھا ہے تو اس ابتدائیہ میں علم صوتیات کی ایک جامع تعریف کر دی ہے جو اس باب کے جملہ مضامین کے لیے پس منظر کا کام کرتا ہے۔اس باب کے مضامین اس طرح ہیں:

1۔ اردو صوتیات کا خاکہ : ڈاکٹر مسعود حسین خان

2۔ ہمزہ کیوں؟ : ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

3۔ اردو میں دخیل آوازیں : ڈاکٹر عبدالستار دلوی

4۔ اردو حروف تہجی کی صوتیاتی ترتیب : ڈاکٹر مسعود حسین خان

5۔ صوتی تغیر وتبدل : ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ

6۔ اردو املا : ڈاکٹر عبدالستار صدیقی

کتاب کا دوسرا باب ''زبان اور بولی'' کے عنوان سے ہے۔جس میں بھی سب سے پہلے مرتبِ کتاب کا ابتدائیہ ہے جس میں وہ زبان اور بولی سے متعلق یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

''زبان انسانی جذبات واحساسات کے ابلاغ وترسیل کا نام ہے جسے مخصوص لسانی گروہ استعمال کرتے ہیں۔زبان ابلاغ وترسیل کی مختلف سطحوں پر مختلف

رنگ اختیار کرلیتی ہے۔ اور یہی مختلف رنگ شخصی بولیوں (Idiolets)،
جغرافیائی بولیاں(Local Dialecs)میں تقسیم ہوجاتے ہیں۔''

(اردو میں لسانی تحقیق،ص:73)

آپ کے اس خیال سے زبان اور بولی کے درمیان کا فرق بخوبی ظاہر ہوجاتا ہے اوراس فرق کو جان لینے کے بعداس باب میں شامل مضامین کو پڑھنے اور سمجھنے میں مدد ملتی ہے اس باب کے مضامین یہ ہیں:

1۔ زبان: ماہیت: آغاز اور تشکیل : ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ

2۔ آغاز نطق سے اردو تک : ڈاکٹر گیان چند

3۔ دکنی اردو : پروفیسر عبدالقادر سروری

4۔ عورتوں کی زبان : ڈاکٹر مولوی عبدالحق

5۔ میسور کی دکنی اردو : ڈاکٹر عبدالغفار شکیل

6۔ زبان اور بولی : ڈاکٹر گیان چند

اس کتاب کا تیسرا باب ''لفظ و معنی'' کی سرخی کے ساتھ ہے جس میں سب سے پہلے آپ کا ابتدائیہ ملتا ہے جس میں انہوں نے لفظ و معنی سے متعلق یوں لکھا ہے کہ لسانیات میں فونیم (Phoneme) کی اصطلاح سے مراد ہے معنی صوتی اکائی ہے۔

☆Phoneme is a minimal distinctive sound segment with bring about meaning change.

Ex: Pin - win, Ring - sing, bat - cat,

فونیم کے برخلاف لفظیہ (Morpheme) بامعنی صوتی اکائی ہے۔

☆Meaning Full Form is a Morph.

☆A set of Morphs of smillar forms like meaning and complementry distribution make up morpheme.

Ex : A boy is running.

A man is running.

ان دونوں اصطلاحوں میں سے ''فونیم'' کا تعلق 'صوتیات' (Phonetics) سے ہے اور لفظیہ، کا تعلق صرف (Morphology) سے ہے اور لفظیہ (مارفیم) کو تین حصوں میں منقسم کیا جاتا ہے۔

1۔ آزاد مارفیم Free Morpheme

2۔ پابند مارفیم Bound Morpheme

3۔ Complex morpheme

آپ نے اپنے ابتدائیہ میں لفظ و معنی کے توسط سے فونیم، صوتیات، لفظیہ، صرف آزاد مافیم اور پابند مارفیم کو اس قدر با آسانی سمجھایا ہے کہ اس پس منظر میں اس باب کے مضامین کو سمجھنا آسان ہوگا۔ اس باب کے مضامین اس طرح ہیں:

1۔ اردو صرف و نحو کا خاکہ : خواجہ عبدالرؤف عشرت

2۔ لفظ و معنی : پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی

3۔ اردو کے مراکب افعال : ڈاکٹر شوکت سبزواری

4۔ بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق : علامہ سید سلیمان ندوی

5۔ ''نے'' کی سرگزشت : ڈاکٹر سبزواری

کتاب ہذا کا چوتھا باب ''اردو زبان: افکار و مسائل'' کے عنوان سے ہے جس میں دوسرے ابواب کی

طرح سب سے پہلے مرتبِ کتاب کا ابتدائیہ ہے جس میں وہ اردو کی وسعت و ہمہ گیری اوراس کے مسائل سے متعلق لکھتے ہیں:

''ہندوستان کی دیگر زبانوں کے مقابلے میں اردو کا حلقہ اثر زیادہ وسیع ہے۔ یہ ہند آریائی علاقے سے باہر دراوڑی زبانوں کے علاقہ میں بھی یکساں طور پر بول چال کی زبان ہے اردو کی اسی ہندوستان گیر حیثیت کی وجہ سے اس کے مسائل بھی بے شمار ہیں۔ صحت زبان اور معیار کے مسائل کی بنیادی وجہ اس کی وسعت اور پھیلاؤ ہے۔ اردو اس لحاظ سے بہت بدقسمت زبان ہے کہ اس قدر وسعت، پھیلاؤ اور علمیت رکھنے کے باوجود اس پر علمی اعتبار سے تسلی بخش کام ابھی نہیں ہو پایا ہے اردو کا توضیحی مطالعہ، اردو کی مختلف بولیوں کے جائزے اور اس قسم کے دیگر لسانی موضوعات پر لسانی تحقیق چند مضامین سے آگے نہ بڑھ سکی۔''

(اردو میں لسانی تحقیق،ص:251)

آپ نے یہ اظہار خیال آج سے تقریباً پینتالیس (45) سال قبل کیا تھا ظاہر ہے اس وقت سے لے کر اب تک اس سمت میں لسانی تحقیقی کام کافی تعداد میں ہوئے ہوں گے۔ اس باب میں شامل مضامین:

1۔	اردو زبان کے مطالعہ میں لسانیات کی اہمیت	:	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
2۔	زبان اور تہذیب	:	پروفیسر احتشام حسین
3۔	اردو کے لیے علمی اصطلاحات کا مسئلہ	:	مولانا وحید الدین سلیم
4۔	اردو میں تلفظ کا مسئلہ	:	ڈاکٹر عبدالستار دلوی
5۔	صحت زبان کے لسانیاتی پہلو	:	پروفیسر احتشام حسین

اس کتاب میں جملہ انتیس (29) مضامین شامل ہیں جو مختلف ماہرین کے قلم کا نتیجہ ہیں اور اب منتشر

ونایاب ہیں۔ غالباً زبان وادب کے ایک عام طالب علم کی دسترس سے باہر ہیں۔ اسی لیے انہوں نے ان منتشر مضامین کو یکجا کر کے چھ مختلف ابواب میں تقسیم کیا ہے اور ہر باب کی ابتداء میں ابتدائیہ اس طرح جامعیت کے ساتھ قلم بند کیا ہے کہ وہ پورے باب کے مضامین کا پس منظر بن گیا ہے جس کے مطالعے کے بعد اس باب کے مضامین کو پڑھنا اور سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ اسی لیے یہ کتاب غالباً ہر یونی ورسٹی میں ایم۔اے کی سطح پر پڑھایا جانے والا کورس ''اردو لسانیات'' کے نصاب میں شامل ہے۔ جس کے پیش نظر طلبہ واساتذہ دونوں اس کتاب سے استفادہ کرتے ہیں۔ اسی بات سے اس کتاب کی اہمیت وانفرادیت معلوم ہوتی ہے اسی سیاق وسباق سے متعلق عبدالستار دلوی، ڈاکٹر راشد عزیز کے ایک سوال کا جواب کس طرح دیتے ہیں دیکھیے:

> ''بہت ساری لسانیات پر ترتیب دی ہوئی انگریزی کتابوں کے مطالعے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ اردو میں اس نوعیت کی کتابوں کی عدم دستیابی اور طلبہ واساتذہ کی رہنمائی کے لیے ایک ایسی کتاب مرتب کروں جو اردو لسانیات کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ مختلف یونی ورسٹیوں کے لسانی مطالعے اور درس وتدریس میں معاون بن سکے۔ اردو میں عام طور سے ڈاکٹر محی الدین قادری زور صاحب کی کتاب ''ہندوستانی لسانیات'' بی۔اے اور ایم۔اے کی سطح پر نصاب میں شامل رہتی ہے۔ بعد میں پروفیسر عبدالقادر سروری کی کتاب بھی لسانیات کے پرچے کے لیے نصاب میں شامل کی جانے لگی۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ یہ دونوں کتابیں دقیع ہونے کے باوجود لسانیات کا مجموعی ذہن پیدا نہیں کرسکتیں اور ایک ایسی کتاب کی ضرورت ہے جو جدید لسانیات کے بیشتر موضوعات کو جدید لسانی نقطہ نظر سے پیش کر سکے۔ اس کے پیش نظر میں نے اردو کے قدیم اور جدید سرمائے کا مطالعہ کرنے کے بعد اس کتاب کا منصوبہ بنایا تاکہ میں درس وتدریس کے لیے جدید لسانیاتی نقطہ نظر سے اپنے محسوسات کو پیش کرسکوں......اس کتاب کی ترتیب

میں 'میں' نے روشنی انگریزی کتابوں سے ہی حاصل کی لیکن زاویۂ نظر میرا تھا۔''

(ماہنامہ 'ایوان اردو' مکالمہ: پروفیسر عبدالستار دلوی سے، جون 2011ء، ص:51-50)

اس کتاب کی اہمیت کی وجہ سے اس کی طلب (مانگ) بھی برابر ہوتی رہتی ہے۔ اسی لیے آپ نے اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ''اردو میں لسانی تحقیق'' کے عنوان سے 2015ء میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی سے شائع کروایا ہے جس میں کتاب کی ضخامت کے پیش نظر کوئی ترمیم و اضافہ نہیں کیا گیا ہے۔

کتاب کے پیش لفظ، مقدمے، ابتدائیے اور مضامین کے عنوانات و مضمون نگاران کے ناموں سے واقفیت حاصل کر لینے کے بعد آیئے کتاب ہذا میں شامل ان کے دو مضامین ''اردو میں دخیل آوازیں'' اور ''اردو میں تلفظ کا مسئلہ'' کا تفصیلی مطالعہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

5.1.1۔ اردو میں دخیل آوازیں:

عبدالستار دلوی اپنے مضمون ''اردو میں دخیل آوازیں'' کی تمہید کے بعد اردو سے متعلق لکھتے ہیں کہ ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں میں اردو، نہ صرف زبانوں کے ملاپ سے بنی ہے بلکہ دو تہذیبوں کے ملاپ سے بنی ہے۔ جس کی شکل میں بیرونی زبانوں کے الفاظ کے ساتھ ساتھ اصوات بھی در آئیں ہیں اور اب اردو کے صوتی نظام کا حصہ ہیں۔ انہیں لسانی اصطلاح میں دخیل آوازیں کہا جاتا ہے اور اردو کی دخیل آوازوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

1۔ حروف علت یا مصوتے (Vowels)

2۔ حروف صحیح یا مصمتے (Consonents)

بقول عبدالستار دلوی اردو زبان میں دس مصوتے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

a,α,i, i:, U, U:, e,o,ai,αu

مثالیں:

(i:) ۔ مثال ۔ تمیں

(i) ۔ مثال ۔ اس

(e) ۔ مثال ۔ ریل۔کھیل

(α) ۔ مثال ۔ آم

(o) ۔ مثال ۔ بول

(U) ۔ مثال ۔ کُھل

(U:) ۔ مثال ۔ طول

(a) ۔ مثال ۔ کب

دوہرے مصوتے:

(ai) ۔ مثال ۔ کئی

(au) ۔ مثال ۔ موت

عبدالستار دلوی اپنے اس مضمون میں آگے لکھتے ہیں کہ انگریزوں کے توسط سے انگریزی زبان ہندوستان میں آئی اور اردو کے ساتھ ساتھ دیگر مقامی زبانوں کو متاثر کرتی رہی۔ جس وجہ سے انگریزی کے تین مصوتے اردو میں در آئے۔

عبدالستار دلوی یہ بھی لکھتے ہیں کہ اردو نے ہندوستانی دراوڑی زبانوں سے کوئی ''صوت'' مستعار نہیں لیا ہے لیکن مصمتہ (r) ضرور مستعار لیا ہے۔ جو اردو کے علاوہ دیگر جدید ہند آریائی زبانوں میں بھی مستعمل ہے۔ (ڑ)(r) Flap رگڑ الو سے ہکاری بندشی (ڑھ) Aspirated Flap بن گیا ہے۔

عبدالستار دلوی کے خیال میں صوت (آواز) تقریر یا بول چال میں کم سے کم بے معنی اکائی ہوتی ہے اور

حرف کا تعلق تحریر سے ہوتا ہے اور آگے وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اردو میں عربی و فارسی کی دخیل آوازوں میں ع،ف،ق،غ،ث،ص،ض،ط،ظ اور ح کو پیش کیا جاتا ہے۔اور یہ اصوات ان زبانوں میں جزولا ینفک کا درجہ رکھتے ہیں اوران کو وہی صحیح طور پر ادا کرسکتا ہے جو عربی وفارسی میں تربیت یافتہ ہو جیسے مولوی وغیرہ لیکن کوئی اوران اصوات کو صحیح طور پر ادا کرہی نہیں سکتا۔کیوں کہ ان کے اعضائے متکلم اس کو اجازت ہی نہیں دیتے۔مگر ریاضت اور مشق سے انھیں ادا کیا جاسکتا ہے اور ہم مندرجہ بالا ان اصوات کا مطالعہ دوطرح سے کرسکتے ہیں:

1۔ معرب مفرس اردو

2۔ ہندوستانی اردو

مضمون نگار کے مطابق معرب ومفرس اردو میں یہ تمام اصوات فونیم کا درجہ رکھتے ہیں اور ہندوستان اردو میں صرف ''ف'' کو چھوڑ کر اور کوئی بھی صوت فونیم کا درجہ نہیں رکھتی۔

عبدالستار دلوی نے اپنے مضمون کے آخری مرحلے میں یہ بھی بتایا ہے کہ دنیا کی بہت کم زبانیں تحریری اعتبار سے سائنٹفک ہیں۔مگر انگریزی بین الاقوامی زبان ہونے کے باوجود بھی تحریری اعتبار سے سائنٹفک زبان نہیں ہے کیوں کہ اس میں /k/ اور /c/ایک ہی صوت کی دوعلامتیں ہیں۔بلکہ یہی معاملہ/ ث/ /س/،/ص/، /ط//ت/ اور/ الف// ع/ کا ہے۔لیکن اردو رسم الخط تاریخ اور روایت کو اپنائے ہوئے ہیں۔اور اردو داں/ ق/ اور /ک/ میں کوئی فرق نہیں کرتے۔سوائے عربی کے تربیت یافتہ اشخاص کے۔اتنا ہی نہیں دکن میں/ ق/ اور/ک/ دونوں ہی/ خ/ میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔

لسانی مضمون ''اردو میں دخیل آوازیں'' کے مطالعہ سے جہاں ہمیں اردو کی عربی، فارسی اور انگریزی سے مستعار لی ہوئی آوازوں کا مثالوں کے ساتھ علم ہوتا ہے وہیں اردو نے جو مصمتہ/ ڑ/ دراوڑی زبانوں سے مستعار لیا ہے اسکی بھی پوری تفصیل جامعیت کے ساتھ مل جاتی ہے، جو اپنے لسانی سفر کی ابتداء ہی میں آپ کے گہرے مطالعے کا ثبوت ہے۔

5.1.2۔ اردو میں تلفظ کا مسئلہ:

''اردو میں لسانی تحقیق'' میں شامل آپ کا دوسرا مضمون ''اردو میں تلفظ کا مسئلہ'' ہے۔اس مضمون کی ابتدا میں آپ سوال اٹھاتے ہیں کہ معیاری تلفظ ہے کیا؟ اور ذرا آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ معیار تلفظ کا مسئلہ دراصل قطعیت کی تلاش کا مسئلہ ہےاوراس قسم کے مسائل حل کرنے کے لیے ہمیں جدید لسانی قواعد کے پیش نظر اپنی زبان کا سائنسی تجزیہ کرنا ہوگااوراس کے اصوات کی صحیح تعداد متعین کرنی ہوگی۔ہمیں ہمارے طریقۂ تحریر کی بھی اصلاح کرنی ہوگی تاکہ تلفظ کی غلطیاں کم ہوں۔اوروہ یہ بھی کہتے ہیں کہ طریقۂ تحریر کی اصلاح کی تحریک انجمن ترقی اردو کو چلانی ہوگی۔انہوں نے اس سلسلے میں آگے لکھا ہے کہ موجودہ دور میں اردو زبان نازک حالات سے گزر رہی ہے۔جس کے پیش نظر ہمیں اپنے رویوں میں تبدیلی کرنی پڑے گی۔کیوں کہ تلفظ کے سلسلے میں ہمارے سوچنے سمجھنے کا انداز زیادہ تر جذباتی اورروایتی ہے۔اسی لیے ہمیں اس پر سائنسی طریقے سے فکر کرنے کی ضرورت ہے۔

عبدالستار دلوی کے مطابق اردو زبان مختلف حالات اورمختلف ماحول میں بولیوں میں تقسیم ہوتی رہی ہے لیکن جیسے معیاری مراٹھی پونہ کی مراٹھی ہے۔معیاری گجراتی احمد آباد کی گجراتی ہےاور معیاری انگریزی BBC کی انگریزی ہے۔ایسے میں انہوں نے سوال اٹھایا ہے کہ اردو کی کسی بولی کو ہم معیاری اردو کہیں گےاور جواب کی تلاش میں آگے بڑھتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر ہم دلّی کی زبان اور تلفظ کو معیاری کہیں گے تو دلی کی زبان میں سادات، پنجابیوں، پٹھانوں اور کشمیریوں کی زبان میں اختلاف ملتا ہے۔اور دلی کے مختلف علاقوں کی بولیوں کے اختلافات کی بنا پر ہی انشاء نے اعتراض کرتے ہوئے ان بولیوں کو آدھا کتا اور آدھا ہرن کہاہے ان بولیوں کے تعلق سے یہی غیر روادارانہ برتاؤ ناسخ، بحر، برق، قلق، اور اسیر وغیرہ کے یہاں بھی ملتا ہے۔یہی برتاؤ قدما میں آرزو کی تحریروں کا بھی حصہ ہے۔جنھوں نے عبدالواسع ہانسوی کی ''غرائب اللغات'' کے متعلق اپنی کتاب ''نوادرالالفاظ'' میں ''زبان جہال'' لکھاہے۔اور میر امن نے باغ و بہار کے دیباچے میں دلی کی زبان کو معیاری زبان قرار دیا ہے۔جس پر رجب علی بیگ سرور نے اعتراض کیا ہے کہ ''دلی کے روڑے اٹکائے ہیں۔محاوروں کے ہاتھ پاؤں توڑے ہیں۔''

عبدالستار دلوی تلفظ اور زبان کے اختلافات کی سب سے پہلی وجہ رسم الخط میں حروف علت (Vowels) کی عدم موجودگی کو بتاتے ہیں۔ کیوں کہ اردو کے حروف علت کے قائم مقام زیر، زبر اور پیش ہمیشہ غیر موجود رہتے ہیں جس کی وجہ سے زبان کے طالب علم کو صحیح تلفظ ادا کرنے میں دشواری ہوتی ہے۔ یہی حال فارسی اور عربی کا بھی ہے اسی لیے اعراب کا اہتمام کرنا چاہیے۔

مضمون نگار حروف علت ہی کے سلسلے میں آگے لکھتے یہں کہ کسی بھی زبان میں مصمتوں کے مقابلے میں مصوتوں کو ادا کرنا آسان ہوتا ہے۔ اسی لیے مصمتے اور مصوتے الفاظ کی تشکیل میں ساتھ ساتھ آتے ہیں اور دنیا میں چند ایسی زبانیں موجود ہیں جن میں دو سے پانچ تک مصمتے ایک ساتھ آتے ہیں۔ ایسے ہی موقعوں پر تلفظ کے مسئلے میں پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہے۔ کیوں کہ مصوتوں کے ساتھ مصمتوں کو ادا کرنا آسان ہوتا ہے اور بغیر مصوتوں کے مصمتوں کو ادا کرنا اتنا ہی مشکل۔ انگریزی زبان میں چار چار مصمتوں کے خوشے ملتے ہیں۔ جن کو ہم نے مصمتوں کی مدد سے توڑ کر ''اردو والیا'' ہے۔ اس کے علاوہ اردو، عربی اور فارسی میں دو دو مصمتی خوشے ہی ملتے ہیں۔ مثلاً

د ر = غدر، بدر، قدر

ک ر = فکر، شکر، ذکر

اسی طرح وہ اردو میں تلفظ کے مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے آخر میں اپنی رائے دیتے ہیں کہ ہمیں اپنے تلفظ کے معاملے میں عربی، فارسی، سنسکرت اور انگریزی زبان کے صوتی اصولوں کی پابندی کرنے کے بجائے اردو کے صوتی نظام کی پابندی کرنی چاہیے۔

مختصر یہ کہ عبدالستار دلوی نے اپنے اس مضمون میں اردو کے معیار تلفظ میں حائل ہونے والے مختلف مسائل کا ایک بعد دیگر سائنسی تجزیہ کیا ہے، مثالیں دیں ہیں اور آخر میں تلفظ کا معیار قائم کرنے اپنی قیمتی رائے بھی دی ہے جو اس سیاق وسباق میں مفید و کارآمد ہے۔

پیش نظر کتاب ''اردو میں لسانیاتی تحقیق (اردو میں لسانی تحقیق)'' میں شامل مضامین دوسرے ماہرین

ہی کہ کیوں نہ ہو، پہلے ہی سے مطبوعہ اور مقبول عام کیوں نہ ہو، مگر اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عبدالستار دلوی نے محنت و مشقت اور تلاش و جستجو سے ان مضامین کو یکجا کر کے، اپنے مضامین شامل کر کے چھ مختلف ابواب میں تقسیم کر کے اپنے ابتدائیوں کے ساتھ شائع کیا تو یہ کتاب لسانیات کے سرمایے میں اضافے کا باعث بنی اور چوں کہ یہ ان کی پہلی لسانی کاوش ہے جس کے لیے وہ لائق تحسین ہیں۔

5.2۔ ادبی ولسانی تحقیق اصول وطریق کار:

عبدالستار دلوی نے ''ادبی ولسانی تحقیق اصول وطریق کار'' کو اپنے طویل مقدمے بعنوان ''ادبی ولسانی تحقیق اصول وطریق کار'' کے ساتھ 1984ء میں مرتب کر کے شعبہ اردو، بمبئی یونی ورسٹی سے شائع کیا ہے۔ اس کتاب کا آخری مضمون ''اردو میں لسانی تحقیق کی اہمیت'' بھی آپ ہی کے قلم کا نتیجہ ہے۔ اور کتاب ہذا میں آپ کے مقدمے اور آخری مضمون کے درمیان میں ادبی تحقیق سے متعلق مختلف ماہرین علم وادب کے مضامین ملتے ہیں۔ واضح رہے کہ آپ نے اپنے مقدمے اور آخری مضمون ''اردو میں لسانیاتی تحقیق کی اہمیت'' کی موجودہ دور میں اہمیت اور مانگ کے پیش نظر اپنی نئی کتاب ''ادبی ولسانی تحقیق اور تقابلی ادب اصول وطریق کار'' میں بھی شامل کیا گیا ہے۔ جس میں آپ کے مذکورہ بالا دونوں مضامین کے علاوہ آپ کا ایک نیا، اہم اور منفرد مضمون، تقابلی ادب کیا ہے؟'' شامل ہے۔ آیئے اب ہم اس کتاب میں مشمولہ تینوں مضامین کا لسانی نقطۂ نظر Point of Reference کے تحت جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔

پیش نظر کتاب کا پہلا مضمون ''ادبی ولسانی تحقیق اصول وطریقہ کار'' ہے۔ اور اس پورے مضمون میں ادبی تحقیق کے مختلف پہلوؤں اور مراحل سے متعلق تفصیل انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے جو فن تحقیق کے قلیل سرمایے میں اضافہ بھی کرتا ہے اور مختلف یونی ورسٹیوں کے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے ریسرچ اسکالرس کے لیے حوالہ جاتی حیثیت بھی رکھتا ہے۔

کتاب ہذا کا دوسرا مضمون ''اردو میں لسانیاتی تحقیق کی اہمیت'' ہے جو دراصل آپ کی پہلی لسانی کاوش''

اردو میں لسانیاتی تحقیق،(1971ء) اردو میں لسانی تحقیق (2015)، (دوسرا ایڈیشن) کا مقدمہ ہے۔ اس مضمون کی اہمیت اس بات سے بھی ظاہر ہوجاتی ہے کہ یہ اب تک آپ کی تین مختلف کتابوں میں شامل ہو چکا ہے مثلاً ''اردو میں لسانیاتی تحقیق'' (1971ء) میں مقدمہ کے طور پر ''ادبی ولسانی تحقیق اصول وطریق کار'' 1984 میں کتاب کے آخری مضمون کی حیثیت سے اور اب تیسری بار ''ادبی ولسانی تحقیق اور تقابلی ادب اصول وطریق کار'' میں درمیانی مضمون کی طرح شامل ہے اس مضمون کو ''اردو میں لسانیاتی تحقیق'' کے مقدمے کے طور پر ہم لسانی مطالعہ کرنے کی کوشش کر چکے ہیں تو یہاں دوبارہ یہ کوشش کرنا رائیگاں معلوم ہوتا ہے۔

''ادبی ولسانی تحقیق اور تقابلی ادب اصول وطریقہ کار'' کا تیسرا اور آخری مضمون ''تقابلی ادب کیا ہے؟'' ہے جو تقریباً اکتالیس (41) صفحات پر محیط ہے۔ دراصل تقابلی ادب Comparative Literature دو زبانوں یا دو ادبیات کا تقابلی مطالعہ ہوتا ہے۔ جس میں دو زبانوں یا دو ادبیات کے مشابہ ومتفرق رجحانوں ار اصناف وغیرہ کا تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے اور اس طرح کے مطالعے کے لیے ضروری نہیں کہ دو زبانیں یا ادبیات ایک ہی ملک سے ہو۔ وہ دوالگ الگ ممالک سے بھی ہوسکتے ہیں اردو ادب میں تقابلی مطالعہ پہلی مرتبہ غالباً شبلی نعمانی نے ''موازنہ انیس و دبیر'' میں میر انیس اور مرزا دبیر کا تقابل کیا تھا۔ آیئے اب اس پس منظر میں آپ کے مضمون ''تقابلی ادب کیا ہے'' کا بھی احاطہ کرتے چلیں۔ آپ نے مضمون کی ابتداء مغربی ادب میں تقابلی ادب کی روایت سے کی ہے، جس کے بعد اس کا تعارف، باہمی اثرات اور ادب کا ارتقاء پیش کیا ہے۔ ان کے علاوہ تقابلی مطالعہ بہ حیثیت تحقیقی موضوع، اصناف شعری تقابلی مطالعہ/ادبی تحریکات کا تقابلی مطالعہ اور ان مطالعوں کے طریق کار پر مفصل انداز میں بحث کی ہے۔

مضامین ''ادبی ولسانی تحقیق اصول وطریق کار'' اردو میں لسانی تحقیق کی اہمیت'' دونوں اپنی اپنی اہمیت کے پیش نظر الترتیب دو اور تین بار مختلف کتب میں شائع ہو چکے ہیں اور کتاب کا آخری مضمون ''تقابلی ادب کیا ہے'' اپنے منفرد موضوع اور زبان وادب سے راست تعلق کی بنا پر اہمیت رکھتا ہے۔ اور بہ حیثیت مجموعی یہ کتاب اردو کے

لسانی سرمایے میں اضافے کا باعث ہے۔

5.3. فرہنگ اصطلاحات:

فرہنگ اصطلاحات (انگریزی۔اردو) انگریزی حروف تہجی کے حساب سے لسانی اصطلاحات کا مجموعہ ہے جس کو 1987ء میں ترقی اردو بیورو نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ترقی اردو بیورو نے مختلف علوم سے متعلق اٹھارہ (18) کمیٹیاں قائم کیں۔ جن میں سے لسانی اصطلاح سازی کمیٹی ایک ہے۔ اس کمیٹی کے صدر پروفیسر مسعود حسین خان (سابق صدر شعبہ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) اور اراکین میں پروفیسر عبدالعظیم خان (صدر شعبہ لسانیات AMU) پروفیسر گوپی چند نارنگ، صدر شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، پروفیسر عبدالستار دلوی، صدر شعبہ اردو، بمبئی یونی ورسٹی، پروفیسر عتیق احمد صدیقی (صدر شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی) پروفیسر گیان چند جین (صدر شعبہ اردو حیدرآباد سنٹرل یونی ورسٹی)، ڈاکٹر خلیق انجم (سیکریٹری، انجمن ترقی اردو ہند) ڈاکٹر فہمیدہ بیگم (ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو)، ڈاکٹر عبدالغفار شکیل (ریڈر شعبہ لسانیات، علیگڑھ مسلم یونی ورسٹی ذاکر محمد ذاکر (ریڈر شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) اور ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ (لکچر ر شعبہ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی شامل ہیں۔ اس کمیٹی نے دارالترجمہ میں ہوئے اصطلاح سازی کے کام اور اسی طرح کے دوسرے کاموں کو پیش نظر رکھ کر لسانی اصطلاح سازی کے لیے تیرہ (13) رہنمایانہ اصول وضع کیے جو اس طرح ہیں:

1۔ ایسی اصطلاحوں کو ترجیح دی جانی چاہیے جو مروج یا مقبول ہو چکی ہوں۔ چاہے ان میں کوئی معنوی یا لسانی سقم ہی کیوں نہ ہو۔

2۔ اگر کوئی اصطلاح ایک سے زائد معنوں میں مستعمل ہو تو ایسی صورت میں اس کے مختلف مفاہیم تو علٰحدہ علٰحدہ الفاظ/ اصطلاح سے وضع کیا جانا چاہیے۔

3۔ اصطلاحوں اور عام الفاظ میں فرق کیا جانا چاہیے۔ عام الفاظ کو فرہنگ میں شامل نہیں کیا جانا چاہیے۔

4۔ کون سا لفظ اصطلاح ہے اور کون سا لفظ عام لفظ، اس کا فیصلہ ماہرین کی رائے اور حسب ضرورت معیاری انگریزی لغات کی مدد سے کیا جانا چاہیے۔

5۔ جہاں تک ممکن ہو سکے، ایک اصطلاح کا ایک ہی اردو متبادل دیا جائے بہ شرط کہ وہ اصول نمبر 2 کی ذیل میں نہ آتا ہو۔

6۔ جہاں تک ممکن ہو سکے، اصطلاح ایک لفظی ہی ہونی چاہیے۔ ناگزیر صورتوں میں یہ دولفظی بھی ہو سکتی ہے۔ ایسی اصطلاحیں کم سے کم وضع کی جائیں جو دو سے زائد الفاظ پر مشتمل ہوں۔

7۔ ہندی اصطلاح کے اختیار کرنے کو عربی اصطلاحوں کے اختیار کرنے پر مراجع سمجھا جائے

8۔ اگر کسی اصطلاح کو ایک سے زائد الفاظ کے ذریعہ ادا کرنے کی ضرورت پیش آئے تو حسب ذیل ترکیبات کو نیچے دی ہوئی ترتیب کے اعتبار سے ترجیح دی جائے۔

(1) وہ ترکیبات جن میں اضافت یا حروف ربط و جار کی قسم کے الفاظ و علامات نہ ہوں

(2) (ب) وہ ترکیبات جن میں پائے نسبتی ہو

(3) (ج) وہ ترکیبات جن میں اضافت ہو، بشرطیکہ ان میں ایک سے زائد اضافتیں ہوں تو ان میں کم سے کم ایک کو کا، کے، کی سے بدل دیا جائے۔

(4) (د) وہ ترکیبات جن میں کا، کی، کے۔ وغیرہ استعمال کیے گئے ہوں۔

9۔ اگر کوئی اصطلاح ایک سے زائد علم یا فن میں مشترک ہے اور ان سب علوم وفنون میں ایک ہی مفہوم میں استعمال کی جاتی ہے تو اس اردو متبادل بھی ہر جگہ ایک ہی دکھا جائے گا۔

10۔ الفاظ کو وضع کرنے کے اصولوں میں اتنی کشادہ دلی ہونی چاہیے کہ ہندی، عربی، فارسی اور پراکرت ترکیبات بھی قابل قبول ٹھہریں۔

11۔ اگر کوئی انگریزی اصطلاح مروج ہو، عام فہم، ہوتو اسے برقرار رکھا جائے۔ایسی عام فہم اصطلاحوں کے لیےاردو متبادلات بنانے یا تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

12۔ اعلام کو ایسا ہی لکھا جائے جیسے کہ وہ اردو میں مقبول ہو چکے ہیں۔ البتہ ایسے اعلام جو ابھی مقبول نہں ہوئے ہیں۔ان کو حرف تہجی کے حدود کا لحاظ رکھتے ہوئے ممکن صحت کے ساتھ لکھا جانا چاہیے۔ اگر کوئی علم اصطلاح کا حصہ بن چکا ہے تو اس علم کو اصول نمبر(12) کی روشنی میں اردو میں ترجمہ کیا جانا چاہیے۔

ان تیرہ رہنمایانہ اصولوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے لسانی اصطلاح سازی کمیٹی نے اصطلاح سازی کا کام انجام دیا جیسے ڈاکٹر فہمیدہ بیگم (ڈائریکٹر ترقی اردو بیورو) کے پیش لفظ اور پروفیسر مسعود حسین خان (صدر لسانی اصطلاح سازی کمیٹی) کے تعارف کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔جس کی ضخامت 212 صفحات اور قیمت 20 روپے ہے۔

فرہنگ اصطلاحات (انگریزی۔اردو) کی لسانی اہمیت آفاقی ہے کیوں کہ ہر زمانے میں اصطلاحات کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہوتی ہے اور یہ ایک فرد کا نہیں بلکہ پورے ادارے کا کام ہوتا ہے۔اسی لیے اس طرف توجہ ذرا دیر سے ہی مبذول ہوتی ہے۔ لہٰذا اس فرہنگ اصطلاحات اور لسانی اصطلاح سازی کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے عبدالستار دلوی قابل داد ہیں۔

5.4۔ دکنی اردو:

''دکنی اردو'' عبدالستار دلوی کی مرتبہ دقیع کتاب ہے۔ دراصل انھیں دکنی اردو پر ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہمیشہ سے محسوس ہوتی رہی۔جس کا سبب دکنی اردو سمینار بنا جو 22 تا 24 دسمبر 1985ء کو منعقد ہوا اور اس سمینار کے مقالات اور دیگر اہم مقالات کا مجموعہ پیش نظر کتاب ''دکنی اردو (دکنی اردو کا تہذیبی، ادبی اور لسانی مطالعہ) ہے

''دکنی اردو'' چوں کہ پروفیسر دلوی کی مرتبہ تصنیف ہے اسی لیے اس کتاب میں سب سے پہلے ان کا مقدمہ ملتا ہے۔جس کی ابتدأ میں وہ کہتے ہیں کہ اردو زبان ہندوستان جیسے وسیع ملک کی اہم زبان ہے۔اسی وجہ سے اس کی علاقائی بولیوں کی تعداد بھی دوسری زبانوں سے زیادہ ہے جیسے لکھنو کی اردو، دلی کی اردو اور مدراس کی اردو وغیرہ۔مگر ان بولیوں میں دکنی اردو کو فوقیت حاصل ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے مختلف علاقے ،تہذیبی، ثقافتی، جغرافیائی، تاریخی اور اقتصادی طور پر ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں لہٰذا ان علاقوں میں پروان چڑھنے والی اردو کی مختلف شکلیں بھی اپنی صوری اور معنوی خوبیوں کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس طرح لسانی تنوع کے باوجود ہر علاقے کی اردو اپنی اساس اور روح کے اعتبار سے بالکل یکساں اور ہم رنگ ہے۔

عبدالستار دلوی نے اردو کی قدیم بولی ''دکنی اردو'' کا تعارف تمہید میں کروانے کے بعد اب مقدمے میں ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد، دیسی بدیسی زبانوں کا میل ملاپ ،اردو زبان کی ابتداًاور مختلف نام جیسے اردوئے معلیٰ ، ریختہ، ہندوستانی، زبان دہلوی، زبان ہندوستان، ہندی اور اردو وغیرہ جنوبی ہند میں اردو ہر مختلف زبانوں کے اثرات، نئے اسالیب گجری اور دکنی، دکنی سادھوسنتوں کے اظہار کا وسیلہ،اس وسیلہ زبان پر شمالی ہند کی اردو کے اثرات، قطب شاہی، نظام شاہی اور عادل شاہی سلاطین کے ادوار میں دکنی زبان و ادب کی ترقی ونشونما جیسے موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شمالی ہند کی ریختہ گوئی نے جنوبی ہند کو متاثر کیا اور جنوبی ہند میں وجود میں آ کر نشوونما پانے والی اردو شاعری نے اپنے اثرات شمالی ہند پر مرتسم کیے۔

عبدالستار دلوی مقدمے میں آگے یہ رائے دیتے ہیں کہ دراصل دکنی اردو کی لسانی اور ادبی روایت گجری کی لسانی اور ادبی روایت کی توسیع ہے۔جس کی وضاحت وہ اس طرح کرتے ہیں:

> ''جب شمال کی کھڑی بولی کی روایت نے ریختہ یا اردوئے معلیٰ کے ذریعے
> گجرات کے علاقے میں ورد کیا تو وہاں کی مقامی زبان گجراتی کے اثرات کو قبول

کرنا اس کے لیے ناگزیر تھا۔ چنانچہ اسی اتصال باہمی سے گجرات کے علاقے میں اردو کی ایک نئی شکل نے رواج پایا جو گجری کے نام سے موسوم ہوئی۔ یہی گجراتی اردو بعد میں اپنی شناخت قائم نہ رکھ سکی اور سلطنتوں کے عروج وزوال اور مراکز کی تبدیلی کی وجہ سے دکنی اردو میں ضم ہوگئی۔‘‘

(دکنی اردو، ص:9)

فاضل مقدمہ نگار مقدمے میں اس کے بعد کے مراحل میں لکھتے ہیں کہ زبانیں دراصل اپنے اسالیب اور معیار کے لیے اپنے سیاسی مراکز کی پابندی کرتیں ہیں اور ان کے اردگرد گھومتی ہیں۔ لہٰذا اسی نقطہ نظر کے تحت کہا جاسکتا ہے کہ اگر ادبی دکنی اردو کا مرکز شمالی ہند نہ منتقل ہوا ہوتا تو آج کے ہندوستان کا لسانی نقشہ ہی مختلف ہوتا۔

مقدمہ نگار کے خیال میں اردو اپنی ابتدأ ہی سے ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کی آئینہ دار ہے۔ اور اپنے تشکیلی دور کی ارتقاء کی مختلف منزلوں تک ہندوی، ہندی، ہندوستانی، زبان ہندوستان اور زبان دہلوی کے ناموں سے جانی جاتی رہی ہے۔ اور یہی زبان گجراتی کے زیر اثر گجری اور دکن میں اپنے علاقائی مناسبت سے دکنی کہلاتی ہے۔ مگر شمالی ہندوستان کی لسانی فضا پر برج بھاشا کی حکومت تھی۔ اسی کے ساتھ ہی اودھی، میتھلی اور راجستھانی زبانوں میں بول چال کے علاوہ ترقی یافتہ زبانیں تھیں۔ ان زبانوں میں سورداس، تلسی داس، ملک محمد جائسی، قطببین، مولانا داؤد، کبیر اور میرا اپنی تصانیف کے ذریعہ ان زبانوں کو وقار عطا کر رہے تھے۔ اسی تاریخی ولسانی تناظر میں فورٹ ولیم کالج سے جدید ہندی کا آغاز ہوتا ہے۔ جس نے بھارتیندو ہرش چندر کے زمانے میں ایک تحریک کی شکل اختیار کرلیں۔ اور مختصر مدت میں حیرت انگیز ترقی کرتے ہوئے سیاسی اور ادبی اعتبار سے اپنے لیے راہیں ہموار کرلیں۔ اردو ہندی کے تعلق سے پروفیسر مظفر علی شہ میری یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

’’اگر فورٹ ولیم کالج میں اردو کے ساتھ انگریزوں نے کوئی بددیانتی نہ کی ہوتی تو اردو کو ہندی کا نیا روپ ملتا، نہ اردو ہندی کا جھگڑا کھڑا ہوتا، نہ آج اردو کا نام اتنی

بے دردی سے مٹایا جاتا۔۔۔۔اور وہ کام جو 1800ء کے قریب انگریزں نے
دیوناگری کا شوشہ چھوڑ کر شروع کیا تھا اب، تقریباً آدھی صدی بعد، اسے
استعمال کرنے کا وقت آ پہنچا اب اردو ہندی کے جھگڑے کی بنیاد جڑ پکڑ چکی تھی۔
جیسے جیسے یہ جھگڑا بڑھتا گیا، ویسے ویسے اردو اور ہندی بالترتیب مسلمانوں اور
ہندوؤں کی زبانیں بنتی گئیں‘‘۔

(ششماہی’’ادبی وثقافت‘‘مضمون،اردو کے مسائل: تاریخ کی روشنی میں،ص:128-125)

پروفیسر مظفر شہ میری کے ان خیالات سے جہاں فورٹ ولیم کالج سے ہندی کے آغاز کا پتہ چلتا ہے۔ وہیں ہندی کے آغاز کے پس منظر میں انگریزوں کے کردار پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

عبدالستار دلوی اردو اور ہندی کی مشترکہ و متفرق لسانی خصوصیات گنواتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اردو کی طرح ہندی بھی اپنے طرز فکر اور اسلوب کی وجہ سے پہنچانی جاتی ہے۔جس کی لسانی اور ادبی روایت ہندوستان کی قدیم لسانی وادبی روایت کی توسیع کہلاتی ہے اور سنسکرت کا ذخیرہ الفاظ اور قواعد ساخت اردو ہندی دونوں کا بنیادی ورثہ ہے۔مگر ایرانی لسانی عناصر اور صرفی خصوصیات اردو کی اپنی لسانی خصوصیات کا حصہ ہیں جس کی بنیاد پر وہ ہندی سے مختلف ہو جاتی ہے۔

عبدالستار دلوی کہتے ہیں کہ ہندی زبان کے ماہرین اردو کے قدیم نام ہندی اور ہندوی سے متعلق ادب کو جدید ہندی کا ورثہ سمجھتے ہیں۔اور انہیں قدیم اردو کا سرمایہ ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ بقول عبدالستار دلوی ہندی ماہرین کے’’ان خیالات پر چھاپ‘‘ علم کی کم اور سیاست، کی زیادہ ہے لیکن وہ ماہرین جن کی نظر ہندوستان کے ادبی ولسانی سرمائے پر ہے۔وہ بہ خوبی جانتے ہیں کہ ہندی، اردو ہندوستانی زبان دہلوی وغیرہ سب ایک ہی زبان کے نام ہیں۔جس میں ہندی، ہندوی اس کے قدیم ترین نام ہیں اور اردو جدید ترین جس کی سب سے اچھی مثال مشہور شاعر مرزا غالبؔ کے خطوط کے مجموعے عود ہندی اور اردوئے معلّٰی کے نام ہیں۔عبدالستار دلوی اردو

ہندی (ہندوی) سے متعلق رقم طراز ہیں:

''ہندی اور اردو جو مترادفات کی حیثیت رکھتے ہیں،'' دیوناگری یا سنسکرت لفظوں کی کمی بیشی یا عدم وجود سے نہیں پہچانی جاتی ہے جو زبانوں کی تاریخ میں وسیع المشربی، رواداری اور حب الوطنی کی نادر مثال ہے جس کے صوتی نظام میں دیسی اور بدیسی دونوں آوازیں سموئی ہوئی ہیں جس کے ذخیرہ الفاظ میں دیسی بدیسی شبد ہیں اور جو دیسی بدیسی تہذیبی اور فکری تصورات سے سج دھج کر ہندو مسلم اتحاد اور قومی یکجہتی کی علامت کے طور پر سامنے آئی............اگر انصاف اور ایمانداری سے قدیم اردو جسے اس کے شاعروں اور ادیبوں نے ہندی اور ہندوی کے نام سے یاد کیا ہے، موجودہ ہندی سے مقابلہ کیا جائے تو جسم اور روح، دونوں اعتبار سے ان میں کوئی قدر مشترک نہیں ملے گی اور اگر اس کا اردو سے مقابلہ کیا جائے تو جسم، روح اور مزاج میں آپ کوئی فرق نہیں پائے گی سوائے اس کے کہ وہ بچپن کے دن تھے اور یہ جوانی کا عالم ہے۔لہٰذا یہ بات صحیح نہیں کہ نام کی وجہ سے دکنی کو موجودہ ہندی کے مماثل قرار دے کر اس کے اردو ہونے کی حیثیت سے انکار کیا جائے۔''   (دکنی اردو،ص:12)

عبدالستار دلوی نے ہندی زبان کے ماہرین کی طرف سے قدیم ہندی اور ہندوی کو جدید ہندی سمجھنے کی غلط فہمی سے متعلق جو تفصیلی وضاحت کی ہے وہ اردو کے حق میں ہے اور دلائل سے ثابت بھی ہے

جدید لسانی اصولوں کے تحت ایک اصول یہ بھی ہے کہ زبان اور اس سے متعلقہ بولی میں افہام و تفہیم ضروری ہے۔ بقول عبدالستار دلوی اس اصول کے لحاظ سے دکنی اردو کا رشتہ اردو سے ہے جدید ہندی سے نہیں کیوں کہ جو افہام و تفہیم دکنی اور اردو میں ہے۔ وہ زبان کے ارتقاء کی کسی بھی سطح پر'' جدید ہندی'' سے نہیں رہا۔ دکنی اردو اور اردو میں موضوعات، اصناف مشترک ہیں جیسے غزل، مثنوی، رباعی، قطعہ اور وغیرہ کے علاوہ ارجن و بھیم کے

ساتھ حیدر کرار کعبہ کے ساتھ کاشی و ہردوار، گنگا جمنا کے ساتھ دجلہ وفرات، گل وبلبل کے ساتھ چاند وچکور کی تلمیحیں وعلامتیں دکنی اور اردو دونوں میں مشترک طور پر پائی جاتی ہیں۔لیکن ہندی میں رام اور ارجن تو ہیں مگر عیسیٰ موسیٰ نہیں ملتے۔کرشن کی بانسری ہے تو بلال کی اذان مفقود ہے۔سومنات اور کاشی ہیں مگر کعبہ نہیں ملتا۔گنگا جمنا کی روانی ہے لیکن دجلہ وفرات نہیں ملتے۔لہٰذا اردو زبان اپنے جسم اور روح سے پہچانی جاتی ہے۔اور ہندی کا فرق پس منظر میں ہوتا ہے ناموں سے نہیں۔اور زبان کے اعتبار سے دکنی اردو ہی ہے کیوں جس قدر مماثلتیں دکنی اردو اور اردو میں ہیں اس کا عشرِ عشیر بھی ہندی میں نہیں ملتا۔دکنی کے موضوعات، اصناف، علامتیں اور تلمیحات اور زبان کے اعتبار سے اردو اور جدید ہندی سے مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دکنی اردو، اردو زبان کی ایک بولی ہے ہندی کی نہیں۔اتنا ہی نہیں فارسی لغت، محاوروں اور امثال جو دکنی میں مروج تھیں انھیں اردو سے واقفیت رکھنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ جدید ہندی والے نہیں۔

اس سے قبل بتایا جا چکا ہے کہ پیش نظر کتاب ’’دکنی اردو‘‘ کے موضوع پر سہ روزہ قومی سمینار کے مقالات کا مجموعہ ہے تو اسی مناسبت سے انہوں نے یہ مقدمہ، ’دکنی اردو‘ اردو اور جدید ہندی سے متعلق مختلف پہلوؤں کی وضاحت کے ساتھ لکھا ہے۔جوان کی اس موضوع پر گرفت کو ثابت کرتا ہے۔اور اسی گرفت کا نتیجہ آپ کا مضمون ’’دکنی اردو۔سماجی لسانیات کی روشنی ہے‘‘، جو اسی کتاب کا حصہ ہے۔تو آیئے اب اس مضمون کا لسانی مطالعہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

5.4.1۔ دکنی اردو۔سماجی لسانیات کی روشنی میں:

عبدالستاد لوی کے مضمون ’’دکنی اردو۔سماجی لسانیات کی روشنی میں‘‘ کا تفصیلی مطالعہ کرنے سے پہلے ہم اس مضمون میں بار بار دہرائے جارہے لسانی اصطلاحات کو جان لیں تو سب سے پہلے مضمون کا عنوان ’’دکنی اردو۔سماجی لسانیات کی روشنی میں‘‘ دیکھتے ہی قاری کے ذہن میں سوال ابھرتا ہے کہ آخر سماجی لسانیات ہے کیا؟ تو یہاں واضح کردوں کہ سماجی لسانیات دراصل سماج میں پائے جانے والے مختلف طبقوں کی زبان کے فرق کا مطالعہ

ہے۔ ار جہاں تک پجن Pidgin اور کریول Creale زبانوں کا تعلق ہے۔تو جان لیں کہ جب دومختلف تہذیبوں کا ملاپ ہوتا ہےتو دونوں زبانوں زبانوں کے الفاظ کےمیل جول سے ایک نئ بول چال کی زبان وجود میں آتی ہے جوپجن Pidgin کہلاتی ہے۔اوریہی زبان جب ارتقاء کی اعلیٰ منزلیں طے کرکے اس علاقے کےلوگوں کے لیے مادری زبان کی حیثیت حاصل کرلیتی ہےتووہ کریول Creale کی اصطلاح سےواضح کی جاتی ہے۔

عبدالستاردلوی اپنےمضمون کی ابتداہی میں لکھتے ہیں کہ لسانیات کی رو سے جب کھڑی بولی اردو نے دکن کا رخ کیااور یہاں کےلسانی ماحول میں مقامی زبانوں کےاشتراک سے ایک پجن زبان کی صورت اختیارکرتی گئی اور بعدمیں اس کی بنیادیں مستحکم ہونے کے بعدیہی زبان عوام میں مادری زبان کی حیثیت حاصل کرگئی تو کریول بن گئی۔

مضمون نگار،مضمون میں آگے کہتے ہیں کہ زبانوں کا دائرہ عمل جب بہت وسیع ہوجاتا ہےتو وہ مختلف جغرافیائی بولیوں میں تقسیم ہوجاتی ہیں یا پھرتہذیبی وسیاسی مراکز کی پابند ہوجاتی ہیں۔ جیسے دلی کی اردواورلکھنو کی اردووغیرہ۔لیکن ان دونوں اسالیب زبان کا فرق جغرافیائی بولیوں سے زیادہ دوتہذیبی مراکز کا فرق ہے۔اسی لیے ان کا شمار جغرافیائی بولیوں سے زیادہ دوتہذیبی اسالیب کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ دراصل دلی اورلکھنو اپنی سماجی زندگی کےاعتبارسے اختلافات رکھتے ہیں اور یہ اختلاف کیفیت کا ہےکمیت کانہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان اختلافات کے باوجوددلی اورلکھنوکی اردو بہت حدتک مشترک بھی ہے۔

عبدالستاردلوی کے مطابق جب دکنی اردو نے ایک مخصوص طبقے کے لیےکریول زبان کی حیثیت اختیار کرلی تواس زبان کی پجن والی حیثیت ختم نہیں ہوگئی بلکہ یہ ثانوی زبان کی حیثیت سےان لوگوں میں مستعمل ہوگئی جن کی مادری زبان مراٹھی،کنڑ،تامل یاتلگوتھی جس کا ثبوت وہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

> ’’جب مغلوں اوردکن والوں میں جنگیں ہوتی تھیں تو دکنی سپاہی مغلوں پرحملہ کرتے وقت اگرچہ آپس میں گفتگو کنڑ،تامل اورتلگوہی میں کرتے تھے۔لیکن اپنے حملےکو پراثر بنانے اوراپنے ساتھیوں کو جوش دلانے کے لیے دشمن کوگالیاں

دکنی اردو میں دیتے تھے۔ یہ وہی گالیاں ہوتی تھی جو دکنی اور شمالی اردو میں آج
بھی مستعمل ہیں۔'' (دکنی اردو،ص:360)

عبدالستار دلوی کے پیش کردہ اس ثبوت پر یقین کیا جاسکتا ہے کیوں کہ جنگوں میں عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ یہ کوئی خلاف توقع بات نہیں ہے۔

عبدالستار دلوی کے خیال میں دکنی اردو، صرف اردو کی جغرافیائی بولی نہیں ہے بلکہ اس کی اپنی ایک سماجی حیثیت بھی ہے۔ جو اس علاقے کے رسم ورواج، طریقے زندگی، غور وفکر اور انداز کی غماز ہوتی ہے۔ اور دکنی اردو کے جو مختلف رنگ دکن کے مختلف علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان کا مطالعہ ہم سماجی درجہ بندی Social Stratification کے نقطہ نظر سے بھی کر سکتے ہیں۔ مثلاً حیدرآباد میں بولی جانے والی اردو کا طبقاتی نظام کتنا مختلف ہے۔ دکن کے دوسرے علاقوں کی دکنی کے طبقاتی نظام سے؟ اسی طرح دکنی اردو کے تعلیم یافتہ اور ان پڑھ لوگوں کی بھی بولی کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

عبدالستار دلوی کا یہ مضمون جہاں دکنی اردو کے سرمائے میں اضافہ کرتا ہے وہیں دکنی اردو کو پجن اور کریول زبان کی حیثیت سے سمجھنے میں بڑی مدد کرتا ہے۔

5.4.2۔ دکنی اردو پر مراٹھی کا اثر:

پیش نظر کتاب ''دکنی اردو'' میں شامل آپ کا دوسرا مضمون ''دکنی اردو پر مراٹھی کا اثر'' ہے جس کی ابتداء میں انہوں نے مراٹھی پر فارسی کا اثر، اردو کے دخیل الفاظ، دکنی اردو پر سادھو سنتوں اور صوفیوں کے تبلیغی عمل کے ذریعہ دکنی اردو پر مراٹھی کا اثر اور قطب شاہی و عادل شاہی حکومتوں کے دوران دکنی اردو پر مراٹھی کے اثر، دکنی اردو کی ارتقائی منزلوں پر مراٹھی کا اثر، جدید آریائی زبانوں میں مراٹھی زبان اور معیاری مراٹھی اور اردو مراٹھی رشتے کی دو وجوہات تفصیل سے بیان کی ہیں۔ جس کے بعد دکنی اردو میں دخیل مراٹھی لفظوں جیسے اسماء Nouns، افعال Verbs، صفات Adjectives اور متعلقات فعل Adverbs کی ایک طویل فہرست دی ہے جو آپ کی اردو، دکنی اردو اور مراٹھی سے گہری واقفیت کو ظاہر کرتی ہے۔

اوراب یہاں مضمون کے اس مرحلے میں انہوں نے دکنی میں دخیل مراٹھی لفظوں کا صوتی مطالعہ مختلف طرح سے یوں پیش کیا ہے۔

حروف صحیح (Consonants):

1۔ ہند آریائی کی معروف خصوصیت و/ V / کی ب/ ط/ دولبی بندشی مسموع آواز bilabial voiced stop میں تبدیلی دکنی میں بھی عام ہے۔ مراٹھی کے وہ الفاظ جن میں ابتدائی حالت میں/ و/ آتا ہے۔ دکنی اردو میں وہ/ ب/ میں بدل جاتا ہے۔ مثلاً

مراٹھی	اردو	معنی
وچار	بچار	خیال
وانٹے	بانٹے	حصہ

2۔ مراٹھی کی ہکاری بندشی غیر مسموع (Aspirated Voiceless):

یہ آواز دکنی میں درمیانی حالت میں سادہ Unaspirated بن گئی ہے جیسے/ دھ// د/ بن گیا ہے۔ مثلاً

مراٹھی	اردو	معنی
ادھک	ادک	زیادہ
سادھنا	سادنا	حاصل کرنا

3۔ یہی حال ہکاری بندشی مسموع کا ہے۔ اس میں بھی/ بھ// ب/ میں بدل گیا ہے۔ مثلاً

مراٹھی	اردو	معنی
لابھ	لاب	فائدہ

4۔ ہکاری بندشی رگڑ الو/ڑھ//rh/بھی اردو میں/ڑ//r/ میں بدل گیا ہے۔مثلاً

مراٹھی	اردو	معنی
کاڑھنا	کاڑنا	نکالنا

5۔ انفی(Naselized):

ان آوازوں میں مراٹھی میں کوزی آواز retroflex Nasal،/n/ بھی ہے۔اردو ہمیشہ ہی اس کوزی انفی آواز سے دور رہی ہے۔ چنانچہ ایسے مراٹھی الفاظ جو اس مخصوص صوت کو استعمال کرتے ہیں ان کے اپنانے پر بھی اردو نے انھیں اپنی خراد پر کس کر اپنے مزاج سے ہم آہنگ کرلیا ہے۔ اسی لئے مراٹھی کی/n/اردو میں /n/ہی رہتی ہے۔

مراٹھی	اردو	معنی
بسنے	بسنے	بیٹھنا
دسنے	دسنے	دیکھنے

6۔ مراٹھی لفظ کی دندانی صفیری مسموع صوت/ز/دکنی اردو میں تالوی مسموع/ج/ میں بدل جاتی ہے۔مثلاً:

مراٹھی	اردو	معنی
زناور	جناور	جانور
زالنے	جالنے	جلانے

7۔ تھیکدار کوزی مسموع"retroflex flaped voiced"/ڑ/ دکنی اردو میں /ر/ تالیکا دندانی مسموع"rolled voiced"میں بدل جاتی ہے۔مثلاً

مراٹھی	اردو	معنی
پیلاڑ	پیلار	ندی پار

8۔ /چ/ /c/ مراٹھی کی مخصوص دندانی غیر مسموع سادہ بندشی آواز ہے اردو میں یہ تالوئی بندشی غیر مسموع /c/ میں بدل جاتی ہے۔ مثلاً

مراٹھی	اردو	معنی
کاچ	کاچ	کانچ
چوک	چوک	غلطی

9۔ /ج/ تالوئی بندشی مسموع آواز دکنی میں دندانی مسموع و آواز میں بدل گئی ہے جب کہ اس کے برخلاف مثالیں ملتی ہیں:

مراٹھی	اردو	معنی
جیاست	زیاست	زیادہ

10۔ مراٹھی دندانی صفیری ہکاری غیر مسموع Aspirated voieless dental fricative دکنی میں تالوئی ہکاری بندشی مسموع Palatal aspirated voiced stop /جھ/ میں تبدیل ہو گیا ہے۔ مثلاً

مراٹھی	اردو
زھانپ	جھانپ
زھرتی	جھرتی

11۔ مراٹھی الفاظ کی مسموع دولبی بندشی صوت bilabial stop دکنی اردو میں دولبی غیر مسموع

بندشی صوت bilabbial voiceless stop میں بدل گئی ہے۔ مثلاً

مراٹھی	اردو	معنی
نپتر	نبتر	بیکار

12۔ تالوئی صفیری غیر مسموع آواز palatal unvoiced Fricative /س/ میں بدل گئی ہے مثلاً:

مراٹھی	اردو
شیوٹ	سیوٹ

ہیئت رکنی:

دکنی اردو میں دخیل مراٹھی لفظوں کی رکنی ساخت میں بھی تبدیلی پیدا ہوگئی ہے۔ مثلاً

مراٹھی	دکنی اردو	لفظ	معنی
CVCCV	CVCV	کلی	کنجی
CVCCVCCV	CVCCVC	سنپورن	پورا

عبدالستار دلوی نے اس مطالعہ کے بعد دکنی اردو کے منتخب اشعار میں مراٹھی کے دخیل الفاظ کا مطالعہ پیش کیا ہے جس کے تحت اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کے بارہ اشعار کا انتخاب کیا ہے اور اس میں نشاندہی بھی کی ہے اور سب سے آخر میں دکنی اردو کی چند صرف خصوصیات مثلاً محاورہ اور ضرب الامثال وغیرہ پر مراٹھی کا اثر بتایا ہے جو خالی از دلچسپی نہیں ہے۔

عبدالستار دلوی کا مضمون ''دکنی اردو پر مراٹھی کا اثر'' پُر از معلوماتی مضمون ہے جس کے مطالعہ سے اردو کا ایک عام قاری بھی مراٹھی اور دکنی دو زبانوں کی ارتقائی منزلوں اور صوتیات سے واقف ہوسکتا ہے۔ یہ مضمون لسانی

سرمائے میں ایک اہم اضافہ ہے۔

عبدالستار دلوی نے اپنی مرتبہ کتاب ''دکنی اردو'' کے مقدمے میں دکنی اردو کی مختصر تاریخ کے ساتھ ساتھ جدید ہندی اور ہندی ماہرین کی غلط بیانیوں سے متعلق مدلل انداز اختیار کیا ہے۔اس کے بعد آپ کا پہلا مضمون ''دکنی اردو سماجی لسانیات کی روشنی میں'' ملتا ہے۔جس میں آپ نے دکنی اردو کو پجن زبان کی حیثیت اور کریول زبان کی سطح پر پیش کر کے اس کا سماجی لسانیات کی روشنی میں مطالعہ کیا ہے اور اس کے بعد آپ کا دوسرا مضمون ''دکنی اردو پر مراٹھی کا اثر'' میں آپ نے دکنی اردو کی مختلف ارتقائی منزلوں پر اس پر مراٹھی کے اثر کی نشاندہی کی ہے اور اس کا صوتی مطالعہ بھی کیا ہے جو خاصے کی چیز ہے۔ بہ حیثیت مجموعی یہ مرتبہ کتاب لسانیات کے سرمائے میں دکنی اردو سے متعلق ایک حوالہ جاتی کتاب ہے۔جو پروفیسر عبدالستار دلوی کی دکنی اردو پر بالغ نظری، وسیع الذہنی اور رواداری کا ثبوت ہے۔

5.5۔ اردو زبان اور سماجی سیاق:

عبدالستار دلوی کی کتاب ''اردو زبان اور سماجی سیاق'' دراصل ان کے لسانی مضامین کا مجموعہ ہے جو انہوں نے وقتاً فوقتاً قلم بند کیے تھے اور یہ مجموعہ 1996ء میں قلم پبلی کیشنز سے شائع ہوا ہے اس مجموعے کی اشاعت میں مہاراشٹر اردو اکادمی کی جزوی مالی اعانت شامل ہے اس کی قیمت سو-/100 روپے اور ضخامت 192 صفحات ہیں اور انتساب کتاب انہوں نے اپنے استاد و پرنسپل جناب انصار علی مرحوم اور استاذی محمد بشیر کے نام کیا ہے۔

اس مجموعہ مضامین کا پہلا مضمون ''امیر خسرؔو'' کے عہد کا لسانی اور سماجی پس منظر اور ان کی ہندوی شاعری'' ہے۔جس میں انہوں نے امیر خسرؔو سے پہلے کا لسانی اور سماجی پس منظر نہایت مدلل انداز میں تحریر کیا ہے۔اور جہاں تک امیر خسرؔو کے ہندوی کلام کا تعلق ہے اسے بتانے کے لیے انہوں نے سب سے پہلے امیر خسرو کا ہندوستان سے رشتہ بتایا ہے ان کی شعری و نثری تصانیف کا مکمل احاطہ کیا ہے اور سب سے آخر میں امیر خسرو سے منسوب اشعار، دوہے، غزل، پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں کا مطالعہ کر کے نتیجہ دیا ہے کہ امیر خسرؔو سے منسوب کس کلام کو ان کا مانا جا سکتا ہے اور کس کو نہیں، دلائل سے واضح کیا ہے۔

اس مجموعے کا دوسرا مضمون ''اردو ہندی ۔لسانی تناظر میں'' ہے۔ جو اس سے پہلے ماہنامہ ''کتاب نامہ'' میں مئی 1987ء کے شمارے میں شائع ہو چکا ہے۔ جس میں آپ نے اردو اور ہندی کے جھگڑے، فورٹ ولیم کالج میں انگریزوں کی سیاست، ہندی ادیبوں کی اردو کو قدیم ہندی کہنے کی غلط فہمی، اردو ادیبوں کی طرف سے اردو کو قدیم ہندی ماننا اور آخر میں مختلف ماہرین لسانیات کے خیالات کی روشنی میں دونوں اردو اور ہندی کو دو الگ الگ اور آزاد زبانیں تسلیم کرنے کا تفصیلی بیان کیا ہے۔

اس مجموعے کا تیسرا مضمون ''دکنی اردو ۔سماجی لسانیات کی روشنی میں'' ہے جو دراصل آپ کی کتاب ''دکنی اردو'' میں بھی شامل ہے تو اس کے ذیل میں اس کا تفصیلی مطالعہ کیا جا چکا ہے۔ اسی لیے یہاں اس سے متعلق کچھ لکھنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اس مجموعے کا چوتھا اور پانچواں مضمون الترتیب ''اردو میں دخیل آوازیں'' اور ''اردو میں تلفظ کا مسئلہ'' آپ ہی کی کتاب ''اردو میں لسانیاتی تحقیق'' میں شامل ہیں۔ اور اسی کتاب کے دوران ان مضامین کا لسانی مطالعہ کرنے کی کوشش کی جا چکی ہے۔ اسی لیے یہاں ان پر دوبارہ قلم نہیں اٹھایا گیا ہے۔

اس مجموعے کا چھٹا مضمون ''بچوں کی اردو ۔تحصیل زبان کا مطالعہ'' ہے اس تحصیل زبان کے مطالعے میں انہوں نے سب سے پہلے یہ واضح کر دیا ہے کہ ماں اور باپ کی مادری زبانیں مختلف ہونے کی صورت میں بچے کی مادری زبان کون سی ہوگی؟ اس کے بعد بچوں کا ذخیرہ الفاظ، زبان کی تحصیل کی درجہ بدرجہ ترقی، بچے کی تحصیل کا تدریجی ارتقاء، بچوں کی اردو کے مصوتے، بچوں کی اردو کے مصمتے، نیم مصوتے، بچوں کی اردو میں مصمتی خوشے، مصمتی آوازوں کے جدول کا مثالوں سے سیر حاصل جائزہ لیا ہے۔

اس مجموعے کا ساتواں مضمون ''بمبئی کی اردو ۔ایک لسانی مطالعہ'' ہے۔ جس کی ابتداء میں انہوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں سے بمبئی آ کر آباد ہو جانے والے کی زبان اور مقامی بمبئی والوں کی زبان کا تقابل کیا ہے جس کے بعد انہوں نے بمبئی کی اردو کی صوتی خصوصیات میں تشدید کا رجحان، ہکاریت اور مصمتی خوشے کو

مثالوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔اور اس کے بعد انہوں نے بمبئی کی اردو صرف خصوصیات کے تحت تعداد، تجنیس، ضمیریں، فعل، معاون فعل، علامت فاعل اور علامت مفعول، لغوی Lexical خصوصیات کو آسانی کے ساتھ مدلل انداز میں بتایا ہے۔اور مضمون کے آخر میں انیسویں صدی کی بمبئی کی اردو کی ایک طویل فہرست نمونے کے طور پر دی ہے جس سے بمبئی کی اردو سے مکمل طور پر واقفیت حاصل ہوتی ہے یہ مضمون اس کے بعد ماہنامہ ''اردو دنیا'' میں فروری 2004ء میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

اس مجموعے کا آٹھواں مضمون ''اردو میں لسانی ادب'' ہے جس کی ابتداء میں انہوں نے اردو زبان کے وجود میں آنے، نشو ونما پانے اور دو بدیسی و مقامی زبانوں کے الفاظ کو اپنانے سے متعلق لکھا ہے اور آگے اردو کے شائستہ و غیر شائستہ ضمائر کو مختلف سیاق سباق میں آسان انداز میں مثالوں کے ساتھ واضح کیا ہے۔اس سے قبل یہ مضمون ''ماہنامہ کتاب نما'' میں اگست 1983ء میں شائع ہو چکا ہے۔

اس مجموعے کا نواں مضمون ''اردو اور انگریزی کے دولسانی پہلو'' ہے جس کی ابتداء میں انہوں نے ذو لسانیات bilingualism اور دو زبانوں پر عبور رکھنے والے اشخاص bilingual کی اصطلاحوں کی وضاحت کی ہے۔اس کے بعد انگریزوں کے ہندوستان آنے اور اردو میں انگریزی کی دخیل آوازوں کے شامل ہونے سے متعلق تفصیل پیش کی ہے اور اس کے آگے اردو اور انگریزی الفاظ کا صوتی مطالعہ کیا ہے اور بعد میں اردو میں انگریزی الفاظ کا صرفی مطالعہ کے تحت، جنس، اسم کیفیت، صفت نسبتی کو مثالوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔اور آخر میں اردو انگریزی دولسانات کے چند نمونے بھی دیے ہیں۔جس سے یہ Concept اور بھی واضح ہو گیا ہے۔

اس مجموعے کا دسواں مضمون ''اردو اور لسانی منصوبہ بندی'' ہے جس میں انہوں نے ہمارے ادیبوں اور نقادوں کے تعلق سے لکھا ہے کہ وہ صرف شاعری اور افسانہ کو ہی ادب سمجھنے لگے ہیں۔اور دوسری اصناف کو سرے سے نظر انداز کر رہے ہیں۔لیکن ادب کی ترقی کا اصل مقصد تو ادب کی متعلق تمام اصناف کا صحیح سمت میں ترقی کرنا ہے۔اسی طرح زبان کی ترقی کا مطلب ہے زبان کے مختلف انداز کے مطالعے کرنا، لغت اور گرامر کی اچھی کتابیں تصنیف و تالیف

کرنا، رسم الخط اور املا کو معیار وسائنٹفک بنانا ہے اور اس کام کے لیے مختلف انجمنوں اور ارادوں کو آگے آنا چاہیے۔ یہ مضمون دراصل اردو کی صورت حال کا جائزہ لے کر اس کو مختلف سمتوں میں ترقی دینے سے متعلق لکھا گیا ہے۔

اس مجموعے کا گیارھواں اور آخری مضمون ''اردو کا ہندوستانی رجحان'' ہے۔ جس میں انہوں نے اردو کے تین رجحانوں کی نشاندہی کی ہے جس میں پہلا رجحان ردیف وقوافی یعنی مقفیٰ مسجع اردو کا ہے۔ دوسرا رجحان اردو کا ہندوستانی رجحان ہے اور تیسرا رجحان انگریزی کا ہے اور آگے انہوں نے اردو کے اس ہندوستانی رجحان کو وؔلی، سراؔج اور دوسرے مختلف شعراء کے کلام میں دکھایا ہے۔ انشاء کی رانی کیتکی کی کہانی اور اسی طرح کے دوسرے نثری شہ پاروں میں ہندوستانی رنگ کی اردو پیش کیا ہے۔ اتنا ہی نہیں انہوں نے اس مخصوص رنگ کو موجودہ دور کے ادیبوں اور شعراء میں بھی دکھانے کی سعی کی ہے۔ یہ مضمون اس کتاب کے علاوہ مرزا خلیل احمد بیگ کی کتاب ''اردو کی تاریخ''، میں بھی شامل ہے۔

اس مجموعے کے تمام مضامین سماجی لسانیات سے متعلق ہیں اور جب یہ مجموعہ اردو زبان وادب کے منظرنامے پر آیا تو تمام حلقوں نے اس کی ستائش ک، دادو تحسین دی۔ عبدالستار دلوی ایک انٹرویو میں اسی طرح کے ایک سوال کا جواب دیتے ہیں:

> ''مجھے خوشی ہے کہ اس کتاب کی اردو حلقوں نے بہت پذیرائی کی۔ اس سلسلے میں کئی احباب نے اس کتاب کی خوب خوب دادو تحسین دی لیکن میرے لیے یہ فخر کی بات ہے کہ اردو کے ممتاز ماہر لسانیات اور صاحب فکر ونظر پروفیسر مسعود حسین خان، سابق پروفیسر صدر شعبہ لسانیات علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی نے اس مجموعے مضامین کو خوب خوب سراہتے ہوئے مجھے مشورہ دیا کہ میں اسی طرح کے مضامین لکھتا رہوں کہ یہ اردو زبان وادب کی اور اردو لسانیات کی بڑی خدمت ہوگی۔''

(ماہنامہ ''ایوان اردو'' دہلی، مکالمہ، پروفیسر عبدالستار دلوی سے، مکالمہ نگار، ڈاکٹر راشد عزیز جون، 2011ء، ص:51)

عبدالستاردلوی کی کتاب ''اردوزبان اورسماجی سیاق'' میں منجملہ گیارہ مضامین شامل ہیں۔لیکن ان میں سے چھ مضامین مختلف رسائل وکتب میں شامل ہیں مگراس بات سے ان مضامین کی اہمیت وانفرادیت میں کوئی کمی نہیں ہوتی بلکہ یہ فائدہ ہوتاہے کہ یہ مضامین مختلف رسائل وکتب کے ذریعے زیادہ سے زیاہ قارئین تک پہنچ سکتے ہیں۔اوروہ ان لسانی مضامین سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرسکتے ہیں۔

5.6۔ دوزبانیں،دوادب(اردوہندی کےتناظرمیں):

عبدالستاردلوی کی کتاب ''دوزبانیں دوادب(اردو ہندی کے تناظر میں) دائرۃ الادب،ممبئی سے 2007 میں شائع ہوئی ہے۔اسکی قیمت 300 روپےاورضخامت 238 صفحات ہیں۔اورانتساب کتاب سرتیج بہادرسپرواوران دوستوں کے نام کیا گیاہے جواردوکواپنامشترکہ ناقابل تقسیم تہذیبی سرمایہ سمجھتے ہیں۔درحقیقت یہ کتاب پروفیسر گیان چندجین کی متنازع فیہ کتاب ''ایک بھاشا'' دولکھاوٹ، دو ادب'' کا رد اور جواب Rejoinder ہے۔

پروفیسر گیان چندجین کی کتابوں کی تعدادکہیں زیادہ ہے جیسے اردوکی نثری داستانیں،شمالی ہندکی اردو مثنویاں،حقائق،کھوج اورتحقیق کافن وغیرہ وغیرہ ان کی لسانیات کے میدان میں پہلی کتاب ''عام لسانیات'' ہے اوراب اس ضمن میں دوسری کتاب ''ایک بھاشا'' دولکھاوٹ،دوادب'' ہے جو 2005ء میں ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس سے شائع ہوئی مگرمنظرعام پر 2006ء میں آئی۔اس متنازع فیہ کتاب کواپنے تبصرے سے متعارف کرانے والے اردو کےمشہورنقادشمس الرحمٰن فاروقی تھےاوران کایہ تبصرہ اس طرح اثرانگیز تھاکہ پوری اردودنیامیں ہلچل مچ گئی کہ پروفیسرجین نے تمام عمراردوکی درس وتدریس میں گزارے،انعامات واعزازات کے سلسلےختم ہونے کے بعداورتمام عہدوں سے سبکدوش ہونے کے بعد یہ اردودشمن کتاب آخرکیوں لکھی؟اسی اثنامیں پروفیسرمرزاخلیل احمد بیگ (صدرشعبہ لسانیات،علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی)،پروفیسراسلم پرویز،شمیم حنفی اورعبدالقدیر کےعلاوہ متعدد ادیبوں ودانشوروں نے تبصرےوتاثراتی مضامین لکھے۔ان حالات کے چلتے عبدالستاردلوی کوبھی اس کتاب کومکمل

طور پر پڑھنے کا اشتیاق ہوا مگر ممبئی میں کتاب کہیں نہ ملی تو وہ دلی پہنچ گئے اور کتاب حاصل کی۔ اسی دوران شعبہ اردو، ممبئی یونی ورسٹی نے اس کتاب پر ایک مکالمہ رکھا جس کی صدارت بھی آپ ہی نے کی۔ آپ کے علاوہ اس مکالمے میں پروفیسر اسلم مرزا و دیگر شامل تھے۔ اور مکالمے کے اختتام پر آپ نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا'' میں پروفیسر گیان چند جین کی کتاب ''ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب'' کا مدلل جواب لکھوں گا۔'' تو اس مکالمے کی رپورٹ انگریزی روزنامے Time of India نے شائع کردی۔ جس کے بعد آپ مہمان پروفیسر کی حیثیت سے شعبہ اردو، یونی ورسٹی آف حیدرآباد سے منسلک ہوگئے۔ یہاں آپ کے ذمے کوئی کلاس نہ تھی تو ان پرسکون لمحات میں آپ نے اپنی کتاب ''دو زبانیں دو ادب'' قلم بند کی۔ جو جولائی تا اکٹوبر 2006ء کے درمیانی تین ماہ کی مسلسل جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ اور اس کتاب میں آپ نے پروفیسر جین کے اعتراضات کا مدلل جواب تاریخی و لسانی اعتبار سے اردو ہندی کے تناظر میں دیا ہے۔ اب آیئے اس پس منظر میں آپ کی کتاب ''دو زبانیں دو ادب'' کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

عبدالستار دلوی نے اپنی کتاب ''دو زبانیں، دو ادب'' کو دس ابواب میں تقسیم کیا ہے جو اس طرح ہیں:

1۔ تمہید

2۔ طریق تحقیق

3۔ اردو اور ہندی پر ایک نظر

4۔ زبان اور بولی کے رشتے اور مسائل

5۔ تاریخ، فرقہ واریت اور گیان چند جین

6۔ فرقہ وارانہ سیاست اور اردو ہندی کا مسئلہ

7۔ فارسی اور سنسکرت سے اردو کا لسانی اور ادبی رشتہ

8۔ ایک زبان اور دو رسم الخط: اردو ہندی کے پس منظر میں

9۔ ختم کلام اور ضمیمہ

10۔ اردو ہندی تاریخی ولسانی تناظر میں۔ ماحصل

عبدالستار دلوی اپنے حرف آغاز میں مسلمانوں کی آمد، مسلمانوں کی عربی فارسی اور مقامی زبانوں کے ملاپ اس ملاپ سے بنی نئی بول چال کی زبان Pidgin اور بعد میں کریول Creale کی حیثیت کو بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اردو ہندوستانیت اور اسلامیت کا ملاجلا روپ ہے۔ اور اس مشترکہ لسانی ہندوستانی تہذیب کی علامت ہے، جو زمانہ وسطی میں ترقی پاتی رہی۔ یہ تہذیب نہ ہندو تہذیب ہے نہ اسلامی تہذیب ہے بلکہ صرف ہندوستانی تہذیب ہے۔ وحید الدین سلیم نے اسے ہندوالمانی تہذیب کہا ہے۔ چند زائد الفاظ کے استعمال سے کوئی زبان ہندو یا مسلمان نہیں بنتی بلکہ اس کا مزاج، اس کی فکر اور اس کا خمیر اسے مذہب اور ذاتوں سے وابستہ کرتا ہے۔ لیکن یہ رشتے کبھی کمزور بھی پڑھ جاتے ہیں اور اسی طرح زبانوں میں عالم گیریت کی صورت پیدا ہوتی ہے۔''

(''دو زبانیں۔ دو ادب''، ص:12)

عبدالستا دلوی کے مندرجہ بالا اس بیان کو مختلف ماہرین لسانیات کی اردو سے متعلق آراء سے صحیح ثابت کیا جا سکتا ہے کیوں کہ اردو سے متعلق غیر جانب دار رویہ رکھنے والا ہر ماہر لسان یہی داہرے گا جو انہوں نے کہا ہے۔

عبدالستار دلوی نے حرف آغاز میں اس کتاب کے بنیادی نتائج کے طو پر سات اہم نکات دیے ہیں جو اس طرح ہیں:

1۔ اردو اور ہندی میں توضیحی لسانیات سے مماثلت ہونے کے باوجود ان دونوں میں صوتی، لفظی اور صرفی امتیازات ہیں۔ اسی طرح سماجی لسانیات، اسلوبیات اور لسانی جمالیات کے اعتبار سے یہ دونوں الگ الگ دو زبانیں ہیں۔

2۔ قدامت کے اعتبار سے اردو کو اولیت حاصل ہے۔ جس کا صدیوں سے تاریخی تقاضوں کے تحت فطری ارتقاء ہوا ہے۔ انگریز مستشرقین کے علاوہ سر تیج بہادر سپرو، ڈاکٹر تاراچند، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی اور آخر میں ممتاز عالم اور ماہر لسانیات پروفیسر سینتی کمار چٹر جی اور ہندی کے متعدد عالم اور محقق بھی اردو کو اصل زبان مانتے ہیں۔ ہندی، ہندوی، ریختہ دکنی گجری اور اردو ایک ہی زبان کے مترادفات کے طور پر استعمال ہوتے رہے ہیں۔ غالبؔ کے خطوط اردوئے معلیٰ اور عود ہندی اس کی مثال ہیں۔

3۔ جدید ہندی کا بیج فورٹ ولیم کالج میں بویا گیا اور 1850ء کے بعد اسے ترقی حاصل ہوئی۔ جس کا مقصد سیاسی بھی تھا اور مذہبی بھی۔ اردو کو سنسکرت آمیز کر کے جدید ہندی کی تحریک للولال جی کے بعد بنگال اور پنجاب میں نوین چندر رائے اور دیانند سرسوتی نے شروع کی تھی جس کی بنیاد کٹّر مذہب پرستی تھی۔

4۔ اودھی، برج، میتھلی اور راجستھانی وغیرہ زبانیں آزاد اور ترقی یافتہ ادبی زبانیں ہیں اور ہندی یا اردو سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ پروفیسر گیان چند کے اس سلسلے کے سارے انکشافات محض افسانوی حیثیت رکھتے ہیں اور لسانی استحصال پسندی کی مثال ہیں۔

5۔ کرسٹوفر ڈ کنگ کی کتاب One Language Two Scripts اور پروفیسر جین کی کتاب میں صرف نام مشابہت ہے۔ اور دونوں کا موضوع الگ ہے۔ اگرچہ اس کا نام گمراہ کن ہے۔

6۔ چند مسلم حکمرانوں کے ناروا سلوک کے باوجود عام مسلمان حکمران روادار، انصاف پسند اور غیر متعصب تھے، بابر کی ہمایوں کے نام وصیت کے علاوہ اورنگ زیب کی مذہبی رواداری اور انصاف پسندی بھی بے مثال ہے جس نے ہندو مندروں کی ہی نہیں بلکہ جینی عالموں اور مندروں کی بھی مالی اعانت کی اور انھیں جائیدادوں سے نوازا۔ گیان چند جین صاحب ان تاریخی حقائق کا مطالعہ نہیں کر سکے۔ ہندوؤں کے مذہبی معتقدات کے بارے میں مرزا مظہر جانِ جاناں کے افکار سے صوفیا کے عقائد اور ہندومت کے لیے احترام بھی واضح ہو جاتا ہے گیان چند جین اس مثبت فکر کا مطالعہ نہیں کر سکے۔

7۔ اہل اردو نے مذہب کی تخصیص کے بغیر سارے اردو ادیبوں اور شاعروں کو عزت واحترام اور اعلیٰ مناصب سے نوازا۔ بیسویں صدی میں پنڈت برج نرائن چکبست، پنڈت درگا پرشاد سرور، پنڈت دتا تریہ کیفی، پریم چند، مالک رام، جگن ناتھ آزاد، تلوک چند محروم، رگھو پتی سہائے فراق گورکھ پوری، آنند نرائن ملا، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، گیان چند جین اور گوپی چند نارنگ وغیرہ کی ایک طویل فہرست ہے۔ جو اردو والوں کی آنکھ کا نور اور دل کے سرور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کالی داس گپتا رضا کے خدمت گزاروں میں ان کے بیشتر شاگرد اور دوست مسلمان ہی تھے۔ پنڈت کنزرو اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ انجمن ترقی اردو (ہند) دلی کے صدر رہ چکے ہیں۔

عبدالستار دلوی اردو ہندی کو ایک بھاشا کہنے کو تنگ نظری اور عصبیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور یہ مندرجہ بالا سات نکات اردو اور ہندی کو دو الگ الگ زبانیں ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔

عبدالستار دلوی ''دو زبانیں، دو ادب'' کے پہلے باب ''تمہید میں ''ایک بھاشا، دو لکھاوٹ، دو ادب'' پر مجموعی نظر ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ پروفیسر گیان چند جین کی کتاب ''ایک بھاشا، دو لکھاوٹ، دو ادب'' کا نام دراصل کرسٹوفر کنگ کی کتاب ''One Language Two Scripts'' سے اخذ کیا گیا ہے مگر دونوں کتابوں کے مواد میں تضاد ہے۔ اس کے بعد مصنف پروفیسر جین کے خیال کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اردو

زبان کے موضوع پر لکھنے والے دونوں فرقوں کے ادیبوں نے اپنے اپنے نقطہ نظر سے اس کی تشریحات کی ہیں اور پروفیسر جین کے خیال میں امرت رائے نے A House Divided لکھ کر بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اور بقول عبدالستار دلوی، پروفیسر جین امرت رائے کے ''مرید'' نظر آتے ہیں۔ جس کے چلتے انہوں نے امرت رائے کی اردو ہندی کے متعلق پیدا کی گئی غلط فہمیوں کی تبلیغ کی ہے اور پروفیسر جین اس تبلیغی سلسلے کا اردو والوں پر سب سے بڑا اعتراض یوں کرتے ہیں:

''کھڑی بولی ہندی (اندازاً 1100 تا 1500) محض ایک واحد زبان نہیں بلکہ شمالی ہند کی مختلف بولیوں اور زبانوں کا وفاق ہے۔ ان بولیوں اور زبانوں کے بولنے والے اپنی خوشی اور رضامندی سے (ہریانی، برج، اودھی، بھوجپوری) خود کو ہندی کی وسیع برادری کا فرد سمجھتے ہیں۔ پھر اردو والے ان کے موقف پر کیوں اعتراض کرتے ہیں۔ مدعی ست، گواہ چست، اسی کو کہتے ہیں۔''

(ایک بھاشا' دولکھاوٹ' دوادب''، ص:15)

عبدالستار دلوی، پروفیسر جین کے اردو والوں پر کیے گئے اس اعتراض کو رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سب سے پہلے تو کھڑی بولی ہندی'' کا فقرہ ہی غلط ہے۔ یہ تو صرف کھڑی بولی ہے۔ جس سے بہت بعد میں ہندی کا ارتقاء ہوا۔ 1000 تا 1500ء کھڑی بولی ہندی تھی ہی نہیں۔ یہ تو ایک زبان کا تشکیلی دور تھا۔ جین صاحب کا یہاں انداز علمی نہیں بلکہ سیاسی ہے ورنہ علمی طور پر ہریانوی، برج، اودھی، بھوجپوری وغیرہ ہندی کی وسیع برادری کی زبانیں نہیں بلکہ آزاد زبانیں اور آزاد ادب ہیں۔ ان زبانوں کے بولنے والوں سے کب کس نے پوچھا کہ ان کی رائے کیا ہے کیا وہ آزادانہ شناخت چاہتے ہیں یا ہندی میں ضم ہونا چاہتے ہیں؟ یہ تو یکطرفہ فیصلہ ہے جو ہندی سامراجیت کی مثال ہے۔''

(دوزبانیں دوادب''ص:33-34)

پروفیسر جین اسی سلسلے میں اردو اور اردو والوں پر ایک اور اعتراض اس طرح کرتے ہیں:

''اردو والے ہمیشہ کہتے آئے ہیں کہ اردو باہر سے آنے والے مسلمان فاتحوں ور مقامی ہندوؤں کے میل جول کا نتیجہ ہے۔ اب لسانیات کے علماء مثلاً ٹکر Tucker، میکس ملر (Max Muller) اور شوکت سبزواری نے قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ دو یا زیادہ زبانوں کے میل جول سے کوئی نئی زبان پیدا نہیں ہوسکتی۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اس غیر لسانی بازاری گپ کو مزید نہ دہرایا جائے۔'' (ایک بھاشا' دولکھاوٹ' دوادب''، ص:15)

عبدالستار دلوی پروفیسر جین کے اس اعتراض کو بھی یوں رد کر دیتے ہیں:

''دو یا زیادہ زبانوں کے میل جول سے کوئی نئی زبان پیدا نہیں ہوسکتی۔ یہ کلیہ نہیں ہے۔ اس میں مستثنیات بھی ہیں۔ اردو انھیں مستثنیات میں سے ایک ہے۔ لسانیات کا علم میکس ملر کے عہد سے بہت آگے پہنچ چکا ہے۔ انیسویں صدی کے مشہور ماہر لسانیات وانریخ نے جس نے ذولسانیات پر گرانقدر تحقیقی کام کیا ہے۔ اپنی معروف کتاب ''Language in Contact'' میں لکھا ہے کہ جب دوزبانیں ایک دوسرے کے ربط میں آتی ہیں تو بعض اوقات اس لسانی ربط کے نتیجے کے طور پر تیسری زبان عالم وجود میں آتی ہے............ کیا وانریخ کو بھی جین صاحب لسانی گپ باز کہیں گے۔'' (دوزبانیں دوادب''ص:35-34)

پروفیسر جین کے پیش نظر دونوں اعتراضات سے اردو اور اردو والوں سے متعلق ان کی تنگ نظری اور اردو دشمنی عیاں ہورہی ہے۔ وہیں عبدالستار دلوی نے جس مدلل انداز میں ان اعتراضات کو رد کیا ہے۔ اس سے ان کی وسیع النظری اور اردو سے محبت ظاہر ہورہی ہے۔

پروفیسر جین آگے پروفیسر مسعود حسین خان اور ترقی اردو بیورو کی فرہنگ اصطلاحات (لسانی) سے متعلق ایک اور اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''کوئی بیس سال پہلے کی بات ہے کہ دلی میں نئے ترقی اردو بیورو کی تشکیل کی گئی۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان (علی گڑھ) اور میں ارکان میں تھے۔ مسعود صاحب نے لسانیات کی اصطلاحوں کے سلسلے میں کچھ سمجھا دیے کہ یہ اصطلاحیں عربی کی مدد سے بنائی جائے۔ میں نے کہا جو اصطلاحیں اردو میں موجود نہیں ہیں لیکن ہندی، گجراتی، مراٹھی اور بنگالی وغیرہ میں مشترکہ استعمال میں ہیں اردو بھی ایک آریائی زبان ہے تو اس رشتے سے وہ بھی کیوں نہ ان اصطلاحوں کو قبول کرلے۔ مگر مسعود صاحب نے کہا، یہ اردو زبان کے مزاج کے خلاف ہے؛ چناں چہ بہت سی مغائرت آمیز اصطلاحیں گھڑ لی گئی۔''
>
> (ایک بھاشا' دو لکھاوٹ' دو ادب''، ص:15)

پروفیسر جین کے مندرجہ بالا اعتراض سے متعلق واضح کرتی چلوں کہ یہ دراصل 1987ء کی بات ہے جب ترقی اردو بیورو نے مختلف علوم کی ضرورتوں کے پیش نظر اٹھارہ (18) کمیٹیاں قائم کیں جنھوں نے اپنے اپنے متعلقہ علوم کی اصطلاحیں مرتب کیں جن میں سے ایک لسانی اصطلاح سازی کمیٹی بھی تھی۔ جس کے صدر پروفیسر مسعود حسین خان اور ارکان میں پروفیر عبدالعظیم خان، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر عبدالستار دلوی، پروفیسر عتیق احمد صدیقی، پروفیسر گیان چند جین، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، ڈاکٹر عبدالغفار شکیل، ڈاکٹر محمد ذاکر اور ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ شامل تھے۔ اس کمیٹی نے جو اصطلاح سازی کی وہ 1987ء ہی میں ڈاکٹر فہمیدہ بیگم ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو، نئی دہلی کے پیش لفظ کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کا عنوان ''فرہنگ'' اصطلاحات (انگریزی۔اردو) لسانیات'' ہے۔ دراصل اپنے پیش لفظ میں ڈاکٹر فہمیدہ بیگم نے یہ وضاحت کی ہے کہ اس لسانی اصطلاح

سازی کے دوران کمیٹی کے پیش نظر تیرہ رہنمایانہ اصول رکھے گئے تھے۔جن کی پابندی ضروری تھی۔متذکرہ تیرہ اصولوں میں سے ایک اصول وہ بھی ہے جس سے پروفیسر جین کا پروفیسر مسعود حسین خان پر کیا گیا اعتراض خود بہ خود رد ہو جاتا ہے:

''الفاظ کو وضع کرنے کے اصولوں میں اتنی کشادہ دلی ہونی چاہیے کہ ہندی،عربی، فارسی یا عرب فارسی یا فارس عربی اور پراکرت ترکیبات بھی قابل قبول ٹھہریں۔'' (فرہنگ اصطلاحات،ص:5)

مختصراً یہی کہا جاسکتا ہے کہ اس اصول میں جس کشادہ دلی کی صفت کا ذکر کیا گیا ہے پروفیسر جین کے یہاں اعتراض کرتے وقت اسی کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔

عبدالستار دلوی، پروفیسر جین کے اردو رسم الخط سے متعلق اعتراضات کو سرے سے رد کرتے ہیں اور ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب کی تمہید کے آخری حصے میں پروفیر جین نے جو استاد اور شاگرد کا مکالمہ دیا ہے اسے پروفیسر دلوی نے فرضی قرار دیا ہے۔

عبدالستار دلوی کی کتاب ''دو زبانیں،دو ادب'' کا دوسرا باب ''طریق تحقیق'' ہے۔واقعہ یہ ہے کہ اس سے متعلق موضوع یعنی ''فن تحقیق پر پروفیسر جین کی کتاب حوالہ جاتی اہمیت رکھتی ہے۔کیوں کہ اس کتاب میں انہوں نے نئے ریسرچ اسکالرس کی رہنمائی کے لیے موضوع کے انتخاب سے لے کر مقالے کو یونی ورسٹی میں داخل کرنے تک کے تمام مراحل کا احاطہ کیا ہے مگر بقول عبدالستار دلوی ''دوسروں کی رہبری و رہنمائی کرنے والے پروفیسر جین خود گمراہی کا شکار ہو گئے ہیں۔اسی وجہ سے انہوں نے امیر خسرو سے متعلق حقیقت کے بجائے غلط فہمیوں کو اپنی تحقیق میں جگہ دے کر تحقیق کے لیے لازمی شرط،سچائی،ایمانداری اور حق گوئی کی عدم تعمیل کی ہے۔

پیش نظر کتاب کا تیسر باب ''اردو ہندی پر ایک نظر'' ہے جس میں انہوں نے وہابی تحریک ''شاہ ولی اللہ تحریک،علی گڑھ تحریک اور خود سر سید سے متعلق پروفیسر جین کے تمام اعتراضات کو مدلل انداز میں رد کیا ہے۔

''دوزبانیں، دوادب'' کا چوتھا باب ''زبان اور بولی کے رشتے اور مسائل'' کے عنوان سے ہے۔اس باب کا لب لباب یہ ہے کہ پروفیسر جین نے اپنی کتاب کے پانچویں باب ''زبانوں کے ماضی بعید کی تحقیق میں کئی پیچیدگیاں'' میں زبانوں کے ماضی سے بحث کرتے ہوئے اردو والوں سے متعلق تحقیر آمیز رویہ اختیار کیا ہے تو عبدالستار دلوی نے اپنے باب میں پروفیسر جین کے اس رویے کا جواب دلائل سے دیا ہے۔اور کہیں بھی جذباتی نہیں ہوئے ہیں۔جیسا کہ ایک ماہر لسان کے لیے ضروری ہے۔

''دوزبانیں۔دوادب'' کا پانچواں باب ''تاریخ، فرقہ واریت اور گیان چند جین'' ہے جس میں عبدالستار دلوی نے پروفیسر جین کے تحقیقی طریقہ کار سے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے پہلے نتائج اخذ کر لیے ہیں اور بعد میں ان کو غیر تحقیقی ذرائع سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور ایسا کرتے وقت پروفیسر جین خود کے سکھائے ہوئے تحقیقی اصول ''تحقیقی حقائق کی بازیافت ہے اور حقائق دوران تحقیق منظر عام پرآتے ہیں'' کو بھول گئے ہیں۔

''دوزبانیں، دوادب'' کا چھٹا باب ''فرقہ وارانہ سیاست اور اردو ہندی کا مسئلہ ہے۔عبدالستار دلوی نے اس باب کی ابتداء فورٹ ولیم کالج میں انگریزوں کے چھوڑے گئے ہندی کے شوشے سے کی ہے اور آگے بڑھتے ہوئے دیانند سرسوتی اور نوین چندر رائے کی جدید ہندی تحریک جس کی اساس کٹر مذہب پرستی تھی'' کا تفصیلی بیان کیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جدید ہندی کا 1850ء کے بعد ابتداًاور تیزی سے ارتقاء ہوا اور تقسیم ملک کے بعد ہندی سیاست نے زور پکڑا تو ہندی کو ہندوستان کی سرکاری زبان قرار دے دیا گیا۔لیکن اردو کسی کی بھی زبان نہ ہوتے ہوئے بھی سارے ہندوستان کے ربط عامہ کی زبان ہے۔

''دوزبانیں، دوادب'' کا ساتواں باب ''فارسی اور سنسکرت سے اردو کا لسانی وادبی رشتہ'' کے عنوان سے ہے۔اس ضمن میں گفتگو کرتے ہوئے عبدالستار دلوی پروفیسر جین کے اس اعتراض کا کہ میکس ملر ٹکر اور شوکت سبزواری نے قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ دو یا دو سے زیادہ زبانوں کے میل جول سے تیسری زبان وجود میں نہیں آسکتی۔پروفیسر جین کے اس اعتراض کو رد کرتے ہوئے عبدالستار دلوی کہتے ہیں کہ لسانیات کا علم میکس ملر کے عہد

سے بہت آگے پہنچ گیا ہے اور وانریخ کی ''Language in Contact'' کے حوالے سے متعلقہ کلیہ کے مشتنیات کو مدلل طور پر ثابت کیا ہے۔ اور عبدالستار دلوی آخر میں یہ بھی کہتے ہیں کہ پروفیسر جین زبانوں کے لسانی رشتوں پر بحث کرتے ہوئے انتشار کا شکار ہو گئے ہیں۔

''دو زبانیں۔ دو ادب'' کا آٹھواں باب ''ایک زبان اور دو رسم الخط'' کی سرخی کے تحت ہے جس میں عبدالستار دلوی نے ثابت کیا ہے کہ اردو، ہندی کا تعلق کھڑی بولی سے ہے۔ اسی طرح ان کے متعدد مشترکہ عناصر بنگالی اور میتھلی میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ زبانیں ایک زبان کے مختلف اسالیب نہیں بلکہ علحدہ علحدہ زبانیں ہیں۔ بالکل اسی طرح اردو کو ہندی کا ایک اسلوب (شیلی) کہنا بھی تاریخی، تہذیبی اور لسانی تناظر میں غلط فہمی ہے۔ اس کو کسی بھی طرح حقائق سے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اور انہیں حقائق کی روشنی میں پروفیسر جین کے اس سلسلے کے تمام اعتراضات رد ہو جاتے ہیں۔

''دو زبانیں دو ادب'' کا آخری باب ''اردو ہندی: لسانی تناظر میں'' ہے۔ جس میں عبدالستار دلوی نے اردو اور ہندی کی لسانی خصوصیات و امتیازات اور صوتی خدوخال کا جائزہ لیا ہے اور آخر میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ہندی حیرت انگیز طور پر تحریک کی شکل میں ترقی کرتے ہوئے سرکاری زبان بن گئی ہے مگر اب بھی بول چال کے لیے جو زبان رائج ہے وہ اردو ہی ہے۔

''دو زبانیں، دو ادب'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی اس کتاب اور اس کے مصنف عبدالستار دلوی سے متعلق اپنی رائے دیتے ہیں:

> ''کتاب کے بابوں کے عنوانات ہی سے مصنف کی گہری بصیرت ژرف نگاہی اور وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ انھوں نے تحقیق کا پورا پورا حق ادا کر دیا............ یہ گراں قدر اور حد درجہ فاضلانہ کتاب اردو کے بارے میں ایک انسائیکلو پیڈیا اور دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔''

(ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کے تبصرے، مرتبہ، محمد عاف اقبال، ص: 167-164)

''دو زبانیں۔دوادب'' کو پڑھنے اور سمجھنے کے بعد ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کی رائے سے اتفاق کیا جاسکتا ہے۔

عبدالستار دلوی ایک انٹرویو کے دوران ڈاکٹر راشد عزیز کے سوال کے جواب میں ''دوزبانیں۔دوادب'' سے متعلق اس طرح وضاحت کرتے ہیں:

> ''میں نے ''اردو دنیا'' نئی دہلی میں گیان چند صاحب کا ایک خط پڑھا تھا جس میں انہوں نے اطلاع دی تھی کہ وہ اردو ہندی کے حوالے سے ایک کتاب لکھنا چاہتے ہیں کہ اردو ہندی دوزبانیں نہیں بلکہ ایک ہی زبان ہے۔ میں نے ردعمل کے طور پر ایک مکالمہ جوابا ''ہماری زبان'' (دلی) میں لکھا تھا۔ مجھے جین صاحب سے کلیتاً اختلاف تھا اور میں اردو اور ہندی کو ایک نہیں بلکہ دو الگ الگ زبانیں سمجھتا تھا۔ پھر گیان چند جین صاحب کی کتاب ''ایک بھاشا: دو لکھاوٹ اور دو ادب'' آئی تو علمی حلقوں پر اس کتاب کے حوالے سے ایک طوفان آیا۔ اس کتاب کی بیشتر باتیں مجھے نزاعی ہی نہیں بلکہ غلط معلوم ہوئیں۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے اس کتاب کو فرقہ واریت کا رنگ دیا تھا۔ اردو کے بارے میں کبھی سومناتھ کا مندر، کبھی جزیہ اور کبھی اورنگ زیب آئے۔ کبھی اپنے ہی شاگردوں سے اپنی غیر رسمی گفتگو کو اپنے فرقہ وارانہ ذہن کی تائید میں استعمال کیا۔ لہٰذا میں نے ضروری سمجھا کہ ان کی اس زہر آلود کتاب کا متوازن اور علمی جواب دیا جائے تاکہ جین صاحب کی فرقہ وارانہ گفتگو کا جس کا تعلق حقائق سے نہیں تھا رد ہو، اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کی کوششوں پر روک لگائی جاسکے۔ ''دوزبانیں اور دوادب''، رد گیان چند تھا تاکہ اردو اور ہندی کے حوالے سے نئی نسل اور آنے والی

نسلیں گمراہ نہ ہوں۔ میں نے ردگیان چند کے لیے کوشش کی کہ ردمسلم اسکالرس کے حوالوں کے بجائے غیر مسلم اسکالرس کے حوالوں سے ہوتا کہ جانبداری کا بھی الزام عائد نہ ہو۔لسانی مطالعے کے وقت عام طور پر لوگ جملوں کی قواعد ساخت پر اپنی بنیادیں کھڑی کرتے ہیں اور اردو اور ہندی کی اسلوبیات،لسانی جمالیات اور لفظ ومعنی کی اہمیت کو نظر انداز کرتے ہیں اردو اور ہندی کے حوالے سے قواعدی ساخت سے زیادہ میں سماجی لسانیاتی نقطہ نظر، اسلوبیات اور لفظ ومعنی کے رشتوں کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں اور میں نے اسی نقطہ نظر سے ان کو الگ الگ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے پھر کسی بھی زبان کا ادب اس زبان کا داخلی حصہ ہے، علامتیں،تشبیہیں، استعارے بھی زبان کا اہم جز ہوتے ہیں اردو ہندی میں تمام تر قواعدی سطح پر مماثلت کے باوجود الفاظ، علامات، تشبیہات، استعارات اور شعریات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ادبی اعتبار سے بھی یہ دونوں زبانیں اپنی آزادانہ شناخت رکھتی ہیں۔محترم جین صاحب اپنے ہندوتوادی ذہن کے نیچے ایسے دبے کے انہوں نے تاریخ اور علم لسانیات کے دیگر بہت اہم پہلوؤں کو اپنے پہلے سے قائم شدہ نتائج کی بھینٹ چڑھا دیا۔''دو زبانیں اور دو ادب'' اسی تنگ دلی اور تنگ نظری اور فرقہ واریت کا جواب ہے، یہ لسانی اور تاریخی انصاف پسندی کی ضرورت کا نتیجہ ہے۔''

(ماہنامہ''ایوان اردو''(دہلی)'جون 2011ء،ص:55-54)

مختصراً کہا جائے تو ساری عمر اردو کی خدمت میں گزرنے والے پروفیسر جین نے عمر کے آخری حصے میں اردو دشمن کتاب تصنیف کر کے اپنی تنگ نظری اور اردو''و''اردو والوں سے دشمنی کا کھلا اظہار کیا ہے۔وہیں عبدالستار دلوی نے پروفیسر جین کے اردو اور اردو والوں سے متعلق تمام اعتراضات کو رد کر کے جو جوابی کتاب

Rejoinder لکھی ہے اس سے ان کی لسانیات کے خصوصی ماہر ہونے کی دلالت تو ہوتی ہی ہے بلکہ یہ کتاب پروفیسر جین کی کتاب سے گمراہ ہونے والے زبان کے عام قاری کے لیے مشعل راہ ہے۔

5.7۔ متفرق مطبوعہ لسانی مضامین:

عبدالستار دلوی نے ''لسانیات'' سے متعلق دوسرے ماہرین کے مضامین کو مرتب کیا۔ اپنے وقفے وقفے سے لکھے ہوئے مضامین کو مجموعے کی شکل دی، اپنے شعبے میں منعقدہ سمینار کے مقالات کو اپنے جامع مقدمے کے ساتھ ترتیب دیا، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی کی لسانی اصطلاح سازی کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے انگریزی سے اردو میں لسانی اصطلاحات مرتب کیں۔ مگر اس میدان میں آپ کا سب سے اہم وقیع کارنامہ ''دوزبانیں دوادب'' کی شکل میں وجود میں آیا۔ ان تمام لسانی خدمات کے علاوہ آپ نے لسانی موضوعات پر کئی مضامین قلم بند کیے ہیں۔ لیکن آپ کے گیارہ مضامین کا ایک مجموعہ ''اردو زبان اور سماجی سیاق'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ تو اب ہم یہاں ان گیارہ مضامین کے علاوہ دوسرے مضامین کا مطالعہ کرنے کی کوشش کریں گے۔

5.7.1۔ کربل کتھا کا لسانی مطالعہ (تبصرہ):

کربل کتھا دراصل روضۃ الشہداء (فارسی) کا اردو ترجمہ ہے جس کے مترجم فضل علی خان فضلی ہیں اور یہ ترجمہ 1722ء یا 1723ء میں کیا گیا ہے۔ لیکن فضلی نے 1747ء میں اس پر نظر ثانی بھی کی ہے۔ اور اسے سب سے پہلے ڈاکٹر اسپرنگر نے دہلی سے 1850 میں شائع کیا۔ دوسری بار 1965ء میں مختار الدین احمد اور مالک رام نے ادارہ تحقیقات اردو، پٹنہ سے شائع کیا ہے اور ''کربل کتھا کا لسانی مطالعہ'' ڈاکٹر خلیق انجم و گوپی چند نارنگ کی تصنیف ہے جو 1970ء میں مکتبہ شاہراہ، دہلی سے شائع ہوئی تو عبدالستار دلوی نے اس پر تبصرہ کیا جو سہ ماہی ''نوائے ادب'' جلد:2، شمارہ:3 اور تاریخ اشاعت 15 / جولائی 1971ء میں شائع ہوا ہے۔ جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ کربل کتھا کی اہمیت ادبی سے زیادہ لسانی ہے اور یہ سب رس کے بعد قدیم نثری کتابوں میں سب سے

اہم ہے۔انہوں نے'' کربل کتھا کا لسانی مطالعہ'' پر تبصرہ کرتے ہوئے بہ حیثیت مجموعی اس طرح اپنی رائے دی ہے:

'' کربل کتھا کا لسانی مطالعہ'' کے مرتبین جدید لسانیات کی سمت و رفتار سے واقف ہیں اسی لیے انہوں نے زبان کی لسانی ساخت میں صوت،صرفی ونحوی،لفظی اور املائی خصوصیات کو توصیفی لسانیات کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کی ہے۔''

(مذکورہ مضمون،ص:77)

چوں کہ کربل کتھا کی اہمیت ادبی سے زیادہ لسانی ہے۔اسی لیے ڈاکٹر خلیق انجم اور گوپی چند نارنگ نے جہاں اس کا لسانی مطالعہ کرکے اس کی اہمیت بڑھادی ہے وہیں توضیعی لسانیات کے سرمائے میں اضافہ بھی کیا ہے اور عبدالستار دلوی نے اس پر تبصرہ کرکے عام قارئین کے لیے اسے سمجھنے میں آسانی مہیا کردی ہے۔

5.7.2۔ لسانی ترسیل اور قومی یکجہتی:

عبدالستار دلوی کا مضمون '' لسانی ترسیل اور قومی یکجہتی'' ماہنامہ '' کتاب نما'' میں جلد۔28،شمارہ۔4، اپریل 1988ء میں شائع ہوا ہے۔اس مضمون کا مرکزی خیال یہ ہے کہ ہندوستان ایک کثیر لسانی ملک ہے۔اس کی سرکاری زبان ہندی ہے مگر دستور ہند میں چودہ زبانوں کو جگہ دی گئی ہے اس کے علاوہ ہر علاقے کی اپنی اپنی علاحدہ زبانیں موجود ہیں۔کہیں کہیں تو ایک ہی علاقے میں ایک سے زائد زبانیں بھی بولی اور سمجھی جاتیں ہیں اور ایک زبان دوسری زبانوں کے ادبیات کو بھی متاثر کرتی ہے،جس کی مثال انہوں نے بنگالی زبان وادب سے دی ہے۔ بنگالی ادب سے تین شخصیتیں،رابندر ناتھ ٹیگور،شرت چندر اور سنتی کمار چٹرجی مقبول خاص و عام ہیں۔ان میں سے ٹیگور نے اردو شاعری پر اثر ڈالا تو شرت چندر نے صنف افسانہ کو متاثر کیا اور سنتی کمار چٹرجی نے اردو لسانیات پر گہرے اثرات مرتسم کیے ہیں۔اسی طرح دوسری زبانوں کے بھی معاملات ہیں اور یہی ہماری لسانی ترسیل میں قومی

یکجہتی کا ثبوت ہے مضمون ''لسانی ترسیل اور قومی یکجہتی'' اپنے موضوع کے اعتبار سے منفرد ہے اور لسانیات کے ایک عام طالب علم کے لیے پُر از معلوماتی ہے۔

5.7.3۔ مہاراشٹر میں اردو اور لسانی منصوبہ بندی:

عبدالستار دلوی کا مضمون ''مہاراشٹر میں اردو اور لسانی منصوبہ بندی'' آپ ہی کی مرتبہ تصنیف ''جنوبی ہند میں اردو زبان و ادب کی تدریس کے مسائل'' میں شامل ہے۔ اور آپ اس مضمون کی ابتدا ہی میں لکھتے ہیں کہ مہاراشٹر میں عہد خسرو کے بعد ادبی مورخین قطب شاہی دور تک ڈھائی سو سال کی تاریخ میں خلا یا کنھچا کا ذکر کرتے ہیں مگر بقول عبدالستار دلوی زبان یا ادب ڈھائی سو سال خلا میں سفر نہیں کر سکتا اور یہ بات خالص علمی نقطہ نظر سے بھی قابل یقین نہیں ہے۔ وہ آگے اپنی اس رائے کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں کہ اردو اس وقت اپنے ارتقائی مراحل سے گزر رہی تھی اور رابط عامہ کی زبان تھی اسی لیے جو جس رسم الخط سے واقف تھا اس نے اردو کو اسی رسم الخط میں محفوظ کیا اور ہمارے ادبی مورخین کو ان گمشدہ کڑیوں کو دیوناگری رسم الخط میں تلاش کرنا ہوگا۔ لیکن ہمارے مورخین نے صرف اردو رسم الخط میں محفوظ ماخذات تک ہی اپنے آپ کو محدود کر رکھا ہے۔ عبدالستار دلوی نے جسٹس راناڈے کی کتاب ''مراٹھوں کا عروج'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ مراٹھی کے سنت شاعر مراٹھی کے ساتھ ساتھ اردو کے بھی شاعر تھے۔

عبدالستار دلوی اس کے بعد مہاراشٹر میں نصابی کتابوں کا ذکر کرتے ہوئے محمد ابراہیم مقبہ، مولوی عبدالفتاح گلشن آبادی اور محمد حسین آزاد کی درسی نصابی کتابوں کو اولیت کا درجہ دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ مہاراشٹر میں نجی اداروں اور حکومت کی طرف سے قائم کیے جانے والے اردو اسکولس کی تعداد اور صورت حال پر تفصیلی گفتگو کرتے ہیں۔ اور آگے ''اردو کی تعلیم میں درسی کتابوں کا رول'' اردو کی تعلیم اور علاقائی زبانیں اور اردو کی ترویج واشاعت اور لسانی منصوبہ بندی جیسے ذیلی موضوعات کو اپنے مضمون میں جگہ دیتے ہیں۔

عبدالستار دلوی کا یہ مضمون دراصل مہاراشٹرا میں اردو ماضی، حال اور مستقبل کو سمجھنے میں ممد و معاون ثابت

ہوتا ہے کیوں کہ اس میں عہد امیر خسرو، محمد ابراہیم مقبہ، مولوی عبدالفتاح گلشن آبادی اور محمد حسین آزاد کی تفصیلات ماضی سے متعلق ہیں تو موجودہ اردو اسکولس کی تعداد اور صورت حال، حال کا پتہ دیتی ہے۔ وہیں ان کی پیش کردہ تجاویز اور لائحہ عمل مستقبل کے امکانات کو روشن کرتا ہے۔

5.7.4۔ بمبئی میں اردو کو مادری زبان کی حیثیت سے پڑھانے کا مسئلہ:

عبدالستار دلوی کا یہ مضمون بھی آپ کی مرتبہ کتاب ''جنوبی ہند میں اردو زبان و ادب کی تدریس کے مسائل'' میں شامل ہے۔اس مضمون میں آپ نے شہر بمبئی میں اردو زبان کو مادری زبان کی حیثیت سے پڑھانے کے مختلف مسائل گنوائے ہیں جو اس طرح ہیں:

1۔ اردو دیگر ریاستوں میں بول چال کی زبان کی حیثیت اختیار کر گئی ہے تو وہاں اس کے بولنے والے اس کے معیاری اسلوب پر قادر نہیں ہیں' ان کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اردو کے معیاری اور ادبی اسلوب کو سیکھیں تا کہ اس کی ادبی نزاکتوں سے آشنا ہو سکیں۔

2۔ اردو کے مخصوص علاقے کی حدود سے باہر اردو کو ایک مادری زبان کی حیثیت سے پڑھانے کے مسئلے کو اس پہلو سے دیکھنا چاہیے کہ وہ ان لوگوں کو جن کی مادری زبان بولی کی شکل رکھنے والی اردو ہے تو انھیں شمالی ہند کے محاورے سے تقریباً مماثلت رکھنے والی اردو پڑھائے جانے کا مسئلہ ہے۔

3۔ بمبئی اور دیگر علاقوں میں جہاں اردو ایک بولی کی شکل میں مادری زبان کی حیثیت سے بولی جاتی ہے۔زبان کے لکھنے میں ایک دشوار مسئلہ یہ ہے کہ وہاں زبان اردو کے معیار، روزمرہ استعمال اور محاوروں کا فقدان ہوتا ہے

عبدالستار دلوی نے اپنے متذکرہ بالا مضمون میں ان تین مسائل کی نہ صرف نشاندہی کی ہے بلکہ ان سے نمٹنے کی تدابیر بھی تجویز کیں ہیں۔اگر ان تدابیر و تجاویز پر عمل کر لیا جائے تو اردو زبان کو مادری زبان کی حیثیت سے پڑھانا آسان اور عام فہم ہو جائے گا۔

5.7.5۔ جنوب ایشیائی اتحاد اور اردو زبان:

عبدالستار دلوی کا مضمون ''جنوبی ایشیائی اتحاد اور اردو زبان'' ماہنامہ ''کتاب نما'' میں جنوری 2006ء میں شائع ہوا ہے۔ جس کی تمہید میں انہوں نے اردو کو مخلوط حیثیت سے پیش کیا ہے۔ جس میں خاص کر عربی فارسی اور یورپی ذخیرہ صوت و الفاظ کا ذکر کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ ہندوستان میں ہر علاقے کی اپنی ایک علحدہ زبان اور بولی موجود ہے مگر پھر بھی اردو پورے ہندوستان کے ربط عامہ کی زبان ہے۔ لیکن چند وجوہات کی وجہ سے اردو کے علاقوں میں جدید ہندی رائج ہے مگر اردو نے جنوبی ایشیاء میں اپنی نئی بستیاں آباد کر لیں ہیں جیسے نیپال، بھوٹان، انڈونیشیا، بنگلہ دیش وغیرہ ان کے علاوہ عرب ممالک کے ساحلی علاقوں میں بھی اردو Pidgin کی بگڑی ہوئی صورت میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ جس کا ذکر سرسید نے اپنے سفرنامے ''مسافران لندن'' میں بھی کیا ہے اور دبئی، کویت، جدہ اور قطر میں ہندوستانیوں و پاکستانیوں نے مل کر اردو کے لیے ادبی ماحول بھی پیدا کر دیا ہے جس کے تحت یہاں سمینارس و مشاعرے بھی منعقد ہوتے رہتے ہیں اور اردو مصری یونی ورسٹیوں میں بھی پڑھائی جاتی ہے۔ لیکن وہاں ابھی عام بول چال میں نہیں آئی ہے بقول عبدالستار دلوی اردو کی ان نئی بستیوں کے وجود میں آنے والی اصل وجہ Bollywood کی فلمیں اور TV Serials ہیں اور مضمون کے آخری حصے میں وہ پرامید ہیں کہ اردو اپنی ان نئی بستیوں میں بول چال کی زبان Pidgin سے آگے بڑھ کر اسکول میں پڑھائی جائے، گھروں میں روزمرہ کے طور پر استعمال کی جائے تو اردو کے مستقبل سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ عبدالستار دلوی نے یہ مضمون تقریباً دس سال پہلے لکھا تھا۔ لیکن اب دس سال بعد ان نئی بستیوں میں اردو Pidgin زبان کی حیثیت سے آگے بڑھ کر Creale زبان کی حیثیت تک پہنچ گئی ہے۔

5.7.6.۔ جدید تعلیم (عصری ضرورتیں اور اردو):

عبدالستار دلوی کا مضمون ''جدید تعلیم۔ عصری ضرورتیں اور اردو'' ماہنامہ ''اردو دنیا'' میں مارچ 2007ء

میں شائع ہوا ہے۔اس مضمون میں انہوں نے جو بنیادی خیال پیش کیا ہے وہ یہی ہے کہ پہلے ہمارے یہاں روایتی مضامین کی تعلیم روایتی انداز میں دی جاتی تھی پھر انگریزوں کی آمد سے ہمارے نظام تعلیم میں تبدیلیاں آئیں اور گزشتہ نصف صدی سے سائنس اور ٹکنالوجی کی جو ترقی ہوئی ہے اس لحاظ سے ہم موجودہ دور کو سائنس اینڈ ٹکنالوجی سے تعبیر کر سکتے ہیں اور حالیہ دور میں تعلیم کا مقصد صرف اور صرف مالی منفعت رہ گیا ہے جب کہ اس کا مقصد شخصیت سازی ہونا چاہیے۔اس کے علاوہ انہوں نے ایک اور اہم نکتے کی نشاندہی کی ہے وہ یہ کہ موجودہ دور میں ہم کسی ایک ہی شعبے یا میدان میں محدود ہو کر رہنے لگے ہیں اس کے بجائے ہم دوسرے شعبہ جات کا علم رکھیں' ان سے بھی دلچسپی لیں تو ہمارے علم میں وسعت پیدا ہوگی اور ملازمت کے بھی زیادہ سے زیادہ مواقع ملیں گے۔

5.7.7۔ دکنی،قدیم اردو یا بولی:

عبدالستار دلوی کا مضمون ''دکنی قدیم اردو یا بولی'' سہ ماہی ''نوائے ادب'' میں اکٹوبر تا مارچ 2008ء میں شائع ہوا ہے۔اس مضمون میں انہوں نے قبل از اردو (Pre-Urdu) اس کی شاعری کی چند مثالیں، ریختہ، ہندوستانی، ہندی، اور اردوئے قدیم کا بیان کیا ہے۔ اور جب یہی اردوئے قدیم (اردو) گجرات، پہنچتی ہے تو گجراتی سے متاثر ہو کر گجری کہلاتی ہے اور اس دور میں اس میں ادب بھی تخلیق ہوا ہے۔جس کی مثالیں خزائنِ رحمت، جواہر اسرار اللہ اور خوب ترنگ ہیں اور بعد کے زمانے میں یہی گجری اپنی شناخت قائم نہ رکھ سکی اور دکنی اردو میں ضم ہوگئی۔ جہاں دکنی سلاطین نے اسے سرکاری زبان کی حیثیت دی تو اس کی ادبی حیثیت بھی بڑھ گئی۔اس میں شعری ونثری شاہکار تخلیق کیے گئے جن کی لسانیت وادبی اہمیت آج بھی قائم ہے۔مگر دکنی اردو کی شمالی ہند کو منتقلی کے بعد دکنی اردو کی ادبی حیثیت کم ہوتے ہوئے ختم ہی ہوگئی اور موجود دور میں دکنی اردو کی حیثیت صرف بولی کی ہے۔جس میں سرور ڈنڈا، سلیمان خطیب اور حمایت اللہ وغیرہ تفنن طبع کے لیے شاعری تو کرتے ہیں مگر اس کی اہمیت صرف علاقائی حد تک ہے اس کے آگے ایسی تخلیقات کا کوئی معیار اب باقی نہ رہا۔

5.7.8۔ مہاتما گاندھی اردو اور اقبالؔ:

عبدالستار دلوی مضمون ''مہاتما گاندھی اردو اور اقبالؔ سہ ماہی ''نوائے ادب''' میں اپریل تا ستمبر 2008ء میں شائع ہوا ہے۔اس مضمون میں انہوں نے گاندھی جی کی شخصیت کو نمایاں کرتے ہوئے ان کی اردو دانی، اردو مطالعہ اور ان کے لکھے ہوئے خطوط کا تفصیلی مطالعہ کیا ہے۔مثال لیں دی ہیں اور اقبال، ان کا ترانہ ہندی سے گاندھی جی کے جذباتی لگاؤ اور مختلف موقعوں پر ان کا اس سے جذباتی اظہار کا تفصیلی بیان کیا ہے۔دراصل اس مضمون کا بنیادی خیال گاندھی جی کی اردو اور اقبال سے دلی محبت اور ان کا نظریہ ہندوستانی ہے جو اردو اور ہندی کا ملا جلا روپ ہے۔

5.7.9۔ قومی زبان اور مشترکہ تہذیب:

عبدالستار دلوی کا مضمون ''قومی زبان اور مشترکہ تہذیب'' سہ ماہی ''نوائے ادب'' میں اکتوبر تا مارچ 2010ء میں شائع ہوا ہے انہوں نے اس مضمون میں اردو زبان کو ہم ہندوستانیوں کا مشترکہ تہذیبی ورثہ بتایا ہے' یہ زبان جیسے اب خالص مسلمانوں سے جوڑ دیا گیا ہے وہ اصل میں بیرونی فاتحوں اور مقامی ہندوستانی باشندوں کے میل جول سے بنی ہے۔ بقول عبدالستار دلوی یہ ہم ہندوستانیوں کا مشترکہ تہذیبی ورثہ ہے۔اسی لیے اردو زبان کو بھی سرکاری زبان یا قومی زبان بنایا جانا چاہیے۔چوں کہ جدید ہندی ہماری قومی زبان ہے تو ہم دوسری قومی زبان کی حیثیت سے اردو کو بھی اس میں شامل کر سکتے ہیں یا پھر گاندھی جی کے نظریے''ہندوستانی زبان'' ہندی+اردو = ہندوستانی کو بھی قومی زبان کی حیثیت سے رائج کر سکتے ہیں۔

5.7.10۔اردو کی عامیانہ زبان:

عبدالستار دلوی کا مضمون ''اردو کی عامیانہ زبان'' سہ ماہی ''نوائے ادب'' میں اکٹوبر تا مارچ 2014ء میں شائع ہوا ہے اس مضمون کا مطالعہ کرنے کے بعد دو اہم نکات سامنے آتے ہیں جو یہ ہیں:

1۔ پہلے زمانے میں عورتوں اور مردوں کی زبان، الفاظ ومحاورات اور گالیاں وغیرہ مختلف ہوا کرتی تھیں مگر اب یہ فرق ختم ہورہا ہے اسی لیے ہمیں اس فرق سے متعلق لسانی مطالعے کرنے کی ضرورت ہے

2۔ گالیاں مرد اور عورتیں دونوں استعمال کر سکتے ہیں مگر کوسے صرف اور صرف عورتیں استعمال کرتیں ہیں۔مضمون میں انہوں نے گالیاں اور کوسے دونوں کی مثالیں بھی دی ہیں جن سے دونوں میں فرق نمایاں ہوجاتا ہے۔

5.7.11۔ جدید قومی تہذیب میں اردو کی اہمیت:

عبدالستار دلوی کا مضمون ''جدید قومی تہذیب میں اردو کی اہمیت'' جون 2015ء کے سہ ماہی ''فکر ونظر'' میں شائع ہوا ہے۔اس مضمون کے مطالعے سے یہی بنیادی خیالات سامنے آتے ہیں کہ تقسیم ملک کے بعد ہندی کو قومی زبان کا درجہ دیا گیا ہے اور اردو کے ساتھ ناروا سلوک کیا جارہا ہے جب کہ اردو ہی ہماری قومی تہذیب کا ورثہ ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے موجودہ دور کی ہندی پر لکھتے ہوئے رائے دی ہے کہ ہندی جنوبی ہند میں اردو کے سہارے قدم جمانے میں لگی ہوئی ہے اور قومی زبان نہ ہونے کے باوجود اردو پورے ہندوستان کے لیے رابطہ عامہ کی زبان ہے اور اصل میں مشترکہ تہذیبی ورثہ ہونے کی وجہ سے قومی زبان کی حیثیت کی بھی حق دار ہے مگر سیاسی ٹھیکیدار اس کے سخت خلاف ہیں اور اسے ''بدیسی زبان'' اور ''مسلمانوں کی زبان'' کہتے ہیں۔

5.7.12۔ سر تیج بہادر سپرو، اردو اور قومی زبان کا مسئلہ:

عبدالستار دلوی کا مضمون ''سر تیج بہادر سپرو، اردو اور قومی زبان کا مسئلہ'' ششماہی ''ادب وثقافت'' میں ستمبر 2015ء میں شائع ہوا ہے۔اس مضمون میں انہوں نے سر تیج بہادر سپرو کا تعارف خاندانی پس منظر، تعلیم وغیرہ بتاتے ہوئے سپرو کے اردو کو مشترکہ ورثہ ماننے کی تفصیل بیان کی ہے۔جس میں انہوں نے سپرو کے اردو سے متعلق مختلف بیانات، انگریزی اور اردو، دونوں کا مطالعہ کیا ہے، مثالیں پیش کیں ہیں اور آخر میں یہ بھی بتایا ہے کہ سپرو کے خیال میں اردو میں عربی، فارسی وسنسکرت الفاظ واصوات کا ذخیرہ الفاظ ہی اس کا اصل حسن اور مزاج ہے۔

مختصراً کہا جائے تو عبدالستار دلوی نے اپنے زمانے طالب علمی ہی سے لسانیات میں دلچسپی لی ہے اور بعد میں جب اس دلچسپی میں سنجیدگی آئی تو آپ نے اس موضوع سے متعلق سمر اسکول کورسس کیے، لندن یونی ورسٹی سے لسانیات کی اعلیٰ تعلیم پائی اور اتنا ہی نہیں آپ نے لسانیات سے پی ایچ ڈی بھی کیا، جس کے بعد اس سنجیدہ دلچسپی میں گہرائی و گیرائی پیدا ہوئی تو آپ نے ایک طرف انگریزی لسانیات کا گہرا مطالعہ کیا اور دوسری طرف اپنی نظر اردو لسانیات پر مرکوز کی تو آپ نے محسوس کیا کہ اردو لسانیات کا سرمایہ قلیل ہے، اور وہ اضافے کا متقاضی ہے، جس کے پیش نظر آپ نے مختلف ماہرین کے مستند مضامین کو اپنے مبسوط مقدموں کے ساتھ مرتب کیا۔ لسانی اصطلاح سازی کی، اردو کی قدیم بولی دکنی اردو پر اپنے ہی منعقدہ سمینار کے مقالات کو اپنے ہی پرمغز مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ وقتاً فوقتاً سماجی لسانیات سے متعلق اپنے ہی لکھے ہوئے مضامین کو مجموعے کی شکل دی لیکن آپ کے یہاں ان کے علاوہ بھی مطبوعہ لسانی مضامین کی ایک طویل فہرست ملتی ہے مگر لسانیات کے میدان میں آپ کا سب سے دقیع اور اہم کارنامہ آپ کی کتاب ''دوزبانیں، دوادب'' ہے جو ردگیان چند ہے۔ لہٰذا یہاں آپ کی انہی خدمات کا لسانیات کی روشنی میں مطالعہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور اس کوشش سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ عبدالستار دلوی کا لسانی ذوق سنجیدہ اور مطالعہ عمیق ہے اس میدان میں آپ کی نظر خاص زبانوں کے لسانی رشتوں پر ہے جس کا ثبوت آپ کے مختلف مضامین و کتب سے دیا جاسکتا ہے۔

oOo

ماحصل

شہر بمبئی تقریباً تین صدیوں سے اردو زبان وادب کی آبیاری کر رہا ہے۔ جس کے لیے اس شہر کے اردو نواز خاندانوں نے اردو ذریعہ تعلیم کے اسکولس قائم کیے جن میں اردو کے قابل اور باکمال اساتذہ درس دیا کرتے تھے مگر ان میں استاد محمد بشیر، استاد جالب مظہری اور استاد عبدالرزاق قریشی نے طلبہ میں شہرت خاص پائی۔ اسی طرح کالجوں میں اسماعیل یوسف کالج اور الفنسٹن کالج کے اردو کے اساتذہ میں ڈاکٹر نجیب اشرف ندوی، ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی، ڈاکٹر عالی جعفری اور ڈاکٹر عصمت جاوید وغیرہ نے اپنی اردو دانی اور علمی وادبی خدمات سے طلبہ کو بھی علمی وادبی ذوق دیا لیکن بمبئی کے ان اسکولوں اور کالجوں کے علاوہ ادبی منظر نامے پر سجاد ظہیر، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، جاںنثار اختر، مجروح سلطان پوری، ساحر لدھیانوی، کرشن چندر، عصمت چغتائی اور مولانا بشیر مالیر کوٹلوی وغیرہ چھائے ہوئے تھے۔ لہٰذا ان اسکولوں، کالجوں اور ادبی ماحول میں نئی نسل پروان چڑھی اس میں سلام بن رزاق، فضیل جعفری، انور خان، علی امام نقوی اور عبدالستار دلوی کے نام خصوصیت کے حامل ہیں۔

عبدالستار دلوی تقریباً چھ دہائیوں سے اپنا زورِ قلم آزمارہے ہیں جس کا لازمی نتیجہ تھا کہ ادب کے مختلف شعبے جات میں آپ کی نگارشات اردو زبان وادب کا حصہ ہیں۔ ان شعبے جات میں تخلیق کے ذیل میں آپ کی شاعری اور تخلیقی تراجم کو رکھا جاسکتا ہے۔ تحقیق میں آپ کی ادبی ولسانی تحقیق کو جگہ دی جاسکتی ہے۔ اور ''تنقید'' میں آپ کی تنقیدی بصیرت مرتبہ تصانیف، مجموعہ مضامین اور دیگر متنوع مضامین کے حوالے سے ظاہر ہوتی ہے۔

عبدالستار دلوی کا پورا نام عبدالستار محمد اسمعیل دلوی ہے، جو 18 / اگست 1937ء کو گاؤں دابھیل، تعلقہ داپولی، ضلع رتنا گری میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم محمد اسماعیل دلوی مرحوم، والدہ محترمہ خدیجہ دلوی مرحومہ بڑی بہن شریفہ دلوی مرحومہ اور بڑے بھائی محمد قاسم دلوی مرحوم ہیں جن کے لاڈ پیار میں آپ کا بچپن گزرا۔ آپ کی ابتدائی تعلیم لوکل بورڈ مراٹھی میڈیم اسکول میں ہوئی مگر مسلمانوں کے لیے اردو زبان لازمی تھی۔ آپ نے 1954ء

میں احمد سیلر ہائی اسکول سے میٹرک کامیاب کیا اور اسماعیل یوسف کالج سے 1956ء میں انٹرمیڈیٹ اور 1958ء میں بی اے آنرس کی ڈگریاں لیں۔ بمبئی یونی ورسٹی سے 1960ء میں ایم اے اردو، 1962ء میں پی ایچ ڈی اردو اور 1967ء میں پی ایچ ڈی لسانیات کی سند حاصل کیں ہیں۔ آپ کی شادی محترمہ میمونہ علی مقدم مرحومہ سے 10 اکتوبر 1958 کو ہوئی تھی۔ ڈاکٹر میمونہ دلوی نے تینتیس سال درس و تدریس میں گزارے ہیں۔ مگر افسوس کے 20 / ستمبر 2009ء کو آپ نے رحلت پائی۔ آپ دونوں کی تین اولادیں ہوئیں جو سعد دلوی مرحوم، ڈاکٹر معزہ دلوی (صدر شعبہ اردو، بمبئی یونی ورسٹی) اور ڈاکٹر سمیہ دلوی ہیں۔ آپ کی علمی، ادبی و لسانی خدمات کے اعتراف میں ''امتیاز میر ایوارڈ، لسانی اور ادبی ولسانی ایوارڈ، ساہتیہ اکادمی'' غالب ایوارڈ، میکش اکبرآبادی ایوارڈ، شولا پور اردو ادبی کانفرنس ایوارڈ، آرٹ سرکل فاؤنڈیشن ایوارڈ فار ایجوکیشن، اور'' سنت گیانیشور ایوارڈ، سے نوازا گیا ہے۔ اتنا ہی نہیں آپ کی علمی و ادبی شخصیت کو مختلف اوقات میں مختلف اعزازات سے بھی نوازا گیا ہے۔ ایسے ہی اگر آپ کے اسفار کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے تقریباً سولہ بیرون ممالک کے اسفار کیے ہیں، جن میں سات اسفار لندن کے، تین مصر کے، قطر، کویت، سعودی عربیہ، ترکی، ایران اور جنوبی آفریقہ کا ایک ایک سفر شامل ہے۔

عبدالستار دلوی اپنے ظاہری خدوخال سے ایک سنجیدہ مزاج انسان نظر آتے ہیں لیکن اصل میں وہ ایک خوش مزاج انسان ہیں۔ دراصل آپ سادگی پسند انسان ہیں اور یہی سادگی آپ کے زیب تن لباس اور غذا میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ آپ کم گو ہیں مگر کم سے کم الفاظ میں اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کا ہنر آپ کو آتا ہے۔ اسی طرح آپ کا نرم و شائستہ لب ولہجہ بھی آپ کی ایک عمدہ خوبی ہے جو ہر کسی کے حصے میں نہیں آتی مگر آپ کا انداز بیان ایسا ہوتا ہے کہ بات سننے والے کے دل پر اثر کر جاتی ہے۔

عبدالستار دلوی ایک مددگار اور مخلص انسان ہیں ہر کسی کی مدد کرنا آپ اپنا فرض سمجھتے ہیں اور مدد کرنے کے بعد اپنا بڑا پن جتائے بنا اس کی مسرتوں میں شامل ہونا ضروری تصور کرتے ہیں، آپ کا شمار ایسے لوگوں میں ہوتا ہے جو بحث، نکتہ چینی اور نکتہ چینی کا جواب دینا جیسی باتوں کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے اور تو اور سستی شہرت پانے کے لیے

اپنے معیار سے نیچے گرنا بھی آپ کو گوارا نہیں۔اس لیے آپ پس منظر میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔آپ کا حافظہ غیر معمولی تیز ہے کیوں کہ اب تقریباً 80 سال کی عمر میں بھی آپ کے حافظہ کا یہ عالم ہے کہ آپ کو اپنی زندگی میں پیش آئی ہر بات اور ہر وہ انسان یاد ہے جس سے کبھی آپ نے ملاقات کی ہو اور آپ نے جو کچھ پڑھا ہے وہ بھی آپ کے ذہن میں حوالوں کے ساتھ محفوظ ہے۔اسی طرح آپ ایک ہمدرد دل کے مالک ہیں کیوں کہ آپ کی فطرت میں جلن اور حسد کا مادہ نہیں ہے' آپ دوسروں کی کامیابیوں میں خوش ہوتے ہیں' اور کامیاب کو اور کامیاب ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ان سب کے علاوہ آپ کی شخصیت میں صبر وتحمل اور مستقل مزاجی ایسے اوصاف ہیں' جو قابل ذکر بھی ہیں اور قابل تقلید بھی' اور جہاں تک آپ کے تعلقات کا معاملہ ہے، اپنے اہل خانہ سے، دوست واحباب اور شاگردوں سے' وہ خوشگوار ہیں جس کی وجہ آپ کی شخصیت میں موجود متعدد اوصاف ہیں۔

عبدالستار دلوی کی شخصیت میں جہاں دابھیل اور بمبئی کے گھر کے ماحول نے مہمان نوازی اور بھائی چارہ جیسے اوصاف پیدا کیے تو وہیں احمد سیلر ہائی اسکول کا ماحول بہت حد تک مذہبی تھا مگر اسماعیل یوسف کالج کا ماحول صرف اور صرف ادبی تھا جس نے آپ کی شخصیت میں علمی وادبی ذوق وشوق کو ابھارا۔

عبدالستار دلوی کے یہاں جہاں علم کی بہتات ہے وہیں انتظامی صلاحیتیں بھی کثرت سے موجود ہیں جن کو آپ بہ حسن وخوبی بروئے کار لاتے ہیں۔آپ مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر کے تقریباً پندرہ سال (82-1967ء) بانی ڈائرکٹر رہے ہیں اور ان پندرہ سالوں میں آپ نے سنٹر میں ایک نایاب لائبریری قائم کی۔ تقریباً سو سے زیادہ لکچرس وتوسیعی خطبات منعقد کیے اور تحقیق کے ذیل میں سات مستقل کتابوں کے علاوہ مختلف لکچرز بھی کتابی شکل میں شائع کیے ہیں۔

عبدالستار دلوی تقریباً بارہ سال (1987-1975) مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی کے بانی جوائنٹ سیکریٹری رہے ہیں اور دو مرتبہ اکادمی کے چیرمین بھی مقرر ہوئے ہیں،آپ نے اپنی چیرمین شپ میں ریاست کے ہر ضلع میں اردو کی موجودہ صورت حال کو بہتر بنانے کی کوشش کی، پالیسی سازی کی،سمینارس کروائے،

غرض ریاست میں اردو زبان وادب کے لیے راہیں ہموار کیں۔

عبدالستار دلوی بانی صدر شعبہ اردو وکرشن چندر پروفیسر بھی تقریباً پندرہ سال (1997-1982) رہے ہیں اوران پندرہ برسوں میں آپ نے پانچ پی ایچ ڈی اسکالرس اور دو ایم فل اسکالرس کی رہنمائی کی ہے، شعبے میں متعدد لکچرز، سمینار اور توسیعی خطبات کا انعقاد عمل میں لایا ہے اور سات مختلف کتابوں کو'اردو نامہ' اشاعتی پروگرام کے تحت شائع بھی کیا ہے۔

عبدالستار دلوی نے تقریباً دو سال (1996-1994ء) عین شمس یونی ورسٹی کیمپس میں گزارے ہیں جہاں آپ نے اپنی علمی وادبی خدمات سے ڈپارٹمنٹ آف اسلامک لینگو یجس میں اردو سکشن اور اردو لائبریری قائم کی اوراس کی تاسیس کی ہے۔

عبدالستار دلوی 2006ء سے 2008ء تک حضرت مخدوم علی مہائمی میموریل اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے بانی ڈائرکٹر رہے ہیں اس دوران آپ نے ریسرچ سنٹر میں ایک لائبریری بھی قائم کی ہے جس میں ایک سال میں آپ نے چھ ہزار کتابیں بطور عطیہ جمع کیں ہیں۔

عبدالستار دلوی نے اپنے کثرت علم اور انتظامی صلاحیتوں سے مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر اور لائبریری، مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی، شعبہ اردو بمبئ یونی ورسٹی عین شمس یونی ورسٹی کے ڈپارٹمنٹ آف اسلامک لینگو یجس کا اردو سکشن اور حضرت مخدوم علی مہائمی میموریل اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور لائبریری جیسے مہتم بالشان اداروں کی ادارہ سازی کی ہے اوران اداروں میں سے صرف عین شمس یونیورسٹی کا اردو سکشن ایک بیرون ملک قائم کیا گیا ادارہ ہے اس کے علاوہ باقی سب ادارے اندرون ملک بالخصوص شہر ممبئ میں قائم کردہ ادارے ہیں یہ ادارے آج بھی رواں دواں ہیں اور جب تک یہ ادارے متحرک رہیں گے' تب تک عبدالستار دلوی کو ان اداروں کے ادارہ ساز کی حیثیت سے یاد کیا جائے گا۔

عبدالستار دلوی نے 2001 سے 2005ء کے درمیانی عرصے میں بہ حیثیت ڈائرکٹر دکن مسلم ایجوکیشن

اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، پونے میں متعدد سمینارس کا انعقاد کیا ہے۔ تحقیقی کتابیں شائع کی ہیں اور لائبریری کو وسعت بھی دی ہے۔

عبدالستار دلوی جولائی تا دسمبر 2006 شعبہ اردو یونی ورسٹی آف حیدرآباد میں مہمان پروفیسر کے عہدے پر فائز رہے اس دوران آپ نے پروفیسر گیان چند جین کی متنازعہ فیہ کتاب ''ایک بھاشا: دو لکھاوٹ دو ادب'' کا مدلل جواب ''دو زبانیں دو ادب'' کی شکل میں لکھا ہے اور ایک قومی سمینار بعنوان ''پنڈت ستیو مادھوراؤ پگڑی'' مورخ و ادیب'' منعقد کیا جو کامیابی سے ہم کنار رہا۔

عبدالستار دلوی 2007ء سے انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کے منصب پر فائز ہیں جہاں آپ سہ ماہی ''نوائے ادب'' کے مدیر ہیں۔ انجمن اسلام کے پبلیکیشن سے شائع ہونے والی متعدد کتابوں کے مرتب ہیں اور ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں منعقد ہونے والے متعدد لکچرز و سمیناروں کے میزبان ہیں۔

عبدالستار دلوی ذی علم شخصیت کے مالک ہیں آپ نے متعدد اداروں کی ادارہ سازی کر کے جہاں خود کو ادارہ ساز ثابت کر دیا ہے وہیں پہلے سے رواں دواں اداروں و انجمنوں سے منسلک ہو کر اپنی اعلیٰ تعلیم اور انتظامی صلاحیتوں کی وجہ سے ایک عمدہ منتظم کہلائے جاتے ہیں۔

کسی بھی مقدمے کو پرکھنے کے لیے یہ بھی ایک اصول ہے کہ مقدمہ نگار مطالب کتاب میں اضافے کرے۔ جس کے لیے وہ کہیں سوالیہ انداز اختیار کرتا ہے، کہیں رائے دیتا ہے اور کہیں کہیں اس رائے کی وضاحت یا تشریح بھی کر دیتا ہے۔ اور اگر ہم عبدالستار دلوی کے لکھے ہوئے مقدمات کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے تقریباً ہر مقدمے میں مطالب کتاب میں اضافہ کیا ہے جس کے لیے وہ بھی کہیں سوالیہ انداز اختیار کرتے ہیں تو کہیں وضاحت اور کہیں کہیں صرف رائے پر اکتفا کر جاتے ہیں دراصل وہ اپنی بات کہنے کے لیے جو انداز مناسب سمجھتے ہیں وہ انداز اختیار کر لیتے ہیں اسی لیے ان کے مقدمے کتاب پر اضافی حیثیت حاصل کر جاتے ہیں جیسے ''ادبی و لسانی تحقیق اصول و طریق کار'' کا مقدمہ، یہ مقدمہ اپنی اضافی حیثیت کی بنا پر اتنا مقبول ہوا کہ اسے

سندھی زبان میں بھی ترجمہ کیا گیا اور اس ترجمے پر پروفیسر بلدیو متلانی کو 1999ء میں ساہتیہ اکادمی کا ترجمہ ایوارڈ ملا اور اسے پاکستان میں اس قدر سراہا گیا کہ وہاں کی تحقیقی کتاب (مرتبہ) میں بھی شامل کرلیا گیا۔ان دلائل سے اس مقدمے کی کامیابی اور اضافی حیثیت دونوں ظاہر ہورہی ہیں۔

غرض کہ عبدالستار دلوی کے سپرد قلم کئے گئے مقدمات اپنی مختلف نوعیت، اختصار طویل، غیر روادار اور تحقیقی وتنقیدی کے باوجود قاری کے ذہن میں کتاب سے متعلق جستجو بڑھانے کے لیے کافی ہیں۔جس کی بنا پر عبدالستار دلوی بہ حیثیت مرتب ومقدمہ نگار ایک اعلیٰ مقام کے حق دار ہیں۔

''نئی تحریریں'' کے مضامین آپ کے کثرت مطالعہ اور گہری تحقیقی وتنقیدی بصیرت کی وجہ سے حوالہ جاتی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ پونے کے مسلمان'' دراصل پونے کے مسلمانوں کی تاریخی،تہذیبی وادبی روایات کا مطالعہ ہے، جو آپ نے سالوں کی محنت وریاضت اور تحقیق وتنقید کے بعد اردو ادب کو دی ہے۔اس کتاب کی اہمیت موجودہ دور میں تو مسلم ہے ہی مگر مستقبل کی نسلوں کے لیے ہماری تہذیبی وراثت بھی ہے اور عبدالستار دلوی کو ان کی تصنیف ''خان بہادر پروفیسر شیخ عبدالقادر سرفراز (احوال وآثار)'' کے پس منظر میں ایک صبر آزما، غیر جانب دار، دقت پسند اور اکابرین وصالحین کے ساتھ مودبانہ رویہ رکھنے والے محقق کی طرح پیش کیا جاسکتا ہے۔اس کے علاوہ ''بھرتری ہری'' پر آپ کا مقدمہ تحقیق وتنقید دونوں اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔کیوں مقدمہ نگار نے جہاں اس میں محقق کی جستجو اور دقت پسندی کے تحت بھرتری ہری سے متعلق مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔وہیں دوسری طرف بہ حیثیت ناقد قدیم اور عالمانہ شاعر پر لکھتے ہوئے تنقیدی بصیرت کے بہترین نمونے پیش کیے ہیں۔دراصل اردو ادب میں بھرتری ہری سے متاثر شعراء اور بھرتری ہری کے مترجم تو بہت ہیں مگر عبدالستار دلوی سے پہلے غالبًا کسی نے بھی بھرتری ہری کی حیات شخصیت،عہد،تخلیقات،شاعری کے ساتھ ساتھ سنسکرت ادب میں اس کے مقام ومرتبے پر تحقیقی،تنقیدی، مدلل اور تفصیلی اندز میں گفتگو نہیں کی ہے۔اسی لیے بھرتر ہری پر آپ کی یہ کتاب (مقدمہ) بھی حوالہ جاتی درجہ اختیار کر گیا ہے۔ان تصانیف کے علاوہ ''اقبال اور بمبئی'' بھی آپ کی ایک اہم تصنیف ہے، جس

کے مضامین نہ تنقیدی ہیں، نہ تبصراتی ہیں بلکہ یہ تو تحقیقی و دستاویزی ہیں۔ جن سے عبدالستار دلوی کو بہ حیثیت محقق اور بہ حیثیت ماہر اقبالیات دونوں خصوص میں ایک اہم مقام دیا جا سکتا ہے۔ ان مذکورہ تصانیف کے علاوہ ''مہاتما گاندھی، اردو اقبال اور دوسرے مضامین کا شمار بھی آپ کی اہم و مقبول تصانیف میں ہوتا ہے، جو آپ کے کثرت مطالعہ اور فکر کا نتیجہ ہے اور اس میں شامل مضامین متنوع موضوعات پر آپ کی گہری گرفت کو بیان کرتے ہیں۔ ان تصانیف کے علاوہ آپ کے متعدد مضامین بھی آپ کی اعلیٰ تحقیق و تنقید کا نمونہ ہیں۔ لہٰذا متذکرہ بالا تصانیف و مضامین آپ کو ایک اعلیٰ پائے کا محقق اور معتبر نقاد ثابت کرتے ہیں۔

عبدالستار دلوی مختلف زبانوں پر عبور رکھتے ہیں، وہیں انہیں فن ترجمہ سے بھی خصوصی دلچسپی ہے۔ ان دونوں کے اشتراک ہی کا نتیجہ ہے کہ آپ نے مختلف زبانوں سے اردو میں تراجم کیے جو کتابی صورت میں شائع ہوئے تو ایک طرف اردو والے مراٹھی زبان و ادب سے واقف ہوئے اور دوسری طرف اردو زبان و ادب کے ذخیرے میں اضافہ ہوا ہے۔ اور آپ کے تراجم ''مراٹھی سے اردو'' میں ناول، کہانیاں، ڈرامے، نظمیں اور انگریزی سے اردو میں نثر و نظم، سب ہی میں تراجم ہونے کے باوجود اصل کی روح اور تاثر برقرار رہے جس کی وجہ سے آپ کو ایک کامیاب مترجم مانا جا سکتا ہے۔

عبدالستار دلوی نے وقفے وقفے اور مختلف موقعوں پر چند نظمیں کہی ہیں، جن کی کمیت کم ہی سہی مگر معیار اعلیٰ ہے اور ان نظموں کی وساطت سے آپ کو اعلیٰ پائے کا شاعر تو نہیں کہا جا سکتا مگر آپ کے شعری ذوق اور فنی رموز سے گہری دلچسپی کی داد دینی پڑتی ہے۔

عبدالستار دلوی نے بہ حیثیت مدیر ماہنامہ ''نقش کوکن''، ''ہندوستانی زبان''، ''امکان'' اور سہ ماہی ''نوائے ادب'' کی ترتیب و تزئین کی ہے۔ جس میں ''نقش کوکن'' کا معیار نیم ادبی سہی ''امکان'' کے شماروں کی تعداد کم ہی سہی، ''ہندوستانی زبان میں زبان ہندوستانی کے پیش نظر معیاری و خالص اردو سے پرہیز کے باوجود، ان تینوں رسالوں میں آپ نے بہ حیثیت مدیر ادبیت قائم رکھنے کی کامیاب کوشش کی، رسالوں کے معیار کو بلند کیا علاوہ

ازیں ان رسالوں کے اجزا میں جو مقاصد پیش نظر تھے‘ان کی بھی تکمیل کی اور جہاں تک سہ ماہی ’’نوائے ادب‘‘ کا تعلق ہے۔آپ نے پچھلے دس سالوں میں بہ حیثیت مدیر اس کے کھوئے ہوئے معیار کو حاصل کیا وہیں دوسری طرف نئی روایات کا اہتمام کر کے اس رسالے کو اردو رسالوں کی فہرست میں ایک نمایاں مقام دلایا ہے جس بنا پر عبدالستار دلوی کو ایک کامیاب مدیر و ادبی صحافی کہا جا سکتا ہے۔

عبدالستار دلوی نے اپنے ادبی سفر میں متعدد سمینارس، لکچرز و توسیعی خطبات دیے ہیں ان سے طلبہ کے ساتھ ساتھ قابل اساتذہ نے بھی استفادے کا اعتراف کیا ہے کیوں کہ یہ سمینارس لکچرز و توسیعی خطبات مختلف موضوعات سے متعلق ہونے کے باوجود کامیابی سے ہم کنار ہوئے اور حوالہ جاتی بن گئے ہیں۔

عبدالستار دلوی نے متعدد کتابوں پر پیش لفظ لکھے ہیں ان پیش لفظوں کی سب سے بڑی خصوصیت اختصار و جامعیت ہے کیوں انہوں نے اکثر دو سے تین صفحات میں موضوع سے متعلق تقریباً تمام پہلوؤں کا احاطہ کر دیا ہے۔ان تحریروں کی دوسری خصوصیت متنوع موضوعات ہیں‘ دراصل یہ موضوعات مذہب، زبان اور ادب وغیرہ وغیرہ مختلف میدانوں سے متعلق ہونے کے باوجود آپ نے ان پر لکھتے وقت جس ایمانداری اور ہنر مندی کا مظاہرہ کیا ہے وہ آپ کے وسیع مطالعہ اور بالغ نظری کا ثبوت ہے۔اور ان تحریروں کی تیسری اور اہم خصوصیت غیر روادار اور غیر جانب دار ہے‘ کیوں کہ اگر آپ غیر روادار و غیر جانب دارانہ ہوتے تو اپنے کم و بیش ساٹھ سالہ علمی، ادبی و لسانی سفر میں آپ کے قلم زد پیش لفظ کی فہرست طویل ہوتی۔

عبدالستار دلوی کے میدان اور موضوعات میں تنوع ہے مگر پھر بھی بعض موضوعات ایسے تھے جن پر قلم اٹھانے کے لیے آپ اپنے آپ کو نامناسب سمجھتے‘ ایسے میں آپ نے مناسب شخصیتوں کا انتخاب کر کے، ان سے ان موضوعات پر کتابیں تصنیف تالیف و ترجمہ کروائیں تو وہ مصنفین و مترجمین اپنے انہی کارناموں کے لیے مقبول خاص و عام ہو گئے ہیں۔

عبدالستار دلوی نے اپنے زمانے طالب علمی ہی سے لسانیات سے دلچسپی لی ہے اور بعد میں جب اس

دلچسپی میں سنجیدگی آئی تو آپ نے اس موضوع سے متعلق سمر اسکول کورسس کیے،لندن یونی ورسٹی سے لسانیات کی اعلیٰ تعلیم پائی اور اتنا ہی نہیں آپ نے لسانیات سے پی ایچ ڈی بھی کیا۔جس کے بعد اس دلچسپی میں گہرائی و گیرائی پیدا ہوئی تو آپ نے ایک طرف انگریزی لسانیات کا گہرا مطالعہ کیا اور دوسری طرف اپنی نظر اردو لسانیات پر مرکوز کی تو آپ نے محسوس کیا کہ اردو لسانیات کا سرمایہ قلیل ہے اور وہ اضافے کا متقاضی ہے، جس کے پیشِ نظر آپ نے مختلف ماہرین کے مستند مضامین کو اپنے مبسوط مقدموں کے ساتھ مرتب کیا۔لسانی اصطلاح سازی کی، دکنی اردو پر اپنے منعقدہ سمینار کے مقالات اور اضافی مقالات کو اپنے ہی پر مغز مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ وقتاً فوقتاً سماجی لسانیات سے متعلق اپنے ہی لکھے مضامین کو مجموعے کی شکل دی، لیکن آپ کے یہاں ان کے علاوہ بھی مطبوعہ لسانی مضامین کی ایک طویل فہرست ملتی ہے۔مگر لسانیات کے میدان میں آپ کا سب سے دقیع اور اہم کارنامہ آپ کی کتاب، دوزبانیں، دوادب ہے جو ردگیان چندجین ہے۔لہٰذا آپ کی ان ہی لسانی خدمات کو علم لسانیات کی روشنی میں تحقیقی وتنقیدی مطالعہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ عبدالستار دلوی کا لسانی ذوق سنجیدہ اور لسانی مطالعہ عمیق ہے اور اس میں آپ کی نظر خاص زبانوں کے لسانی رشتوں پر ہے، جس کا ثبوت آپ کے مختلف مضامین و کتب سے دیا جاسکتا ہے۔

oOo

مطالعہ جاتی کتب

سلسلہ نمبر	مصنف	کتاب کا نام	مقام اشاعت	سنہ
1	آل احمد سرور	تنقید کیا ہے اور دوسرے مضامین	مکتبہ جامعہ نئی دہلی	1977ء
2	آل احمد سرور	اردو تحریک	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	1999ء
3	آمنہ صدیقی	افکار عبدالحق	اردو اکادمی سندھ کراچی	1962ء
4	اشفاق حسین	تھوڑی سی فضا اور سہی	عالمی اردو ٹرسٹ دہلی	2012ء
5	افضال احمد ڈاکٹر	چکبست (حیات اور ادبی خدمات)	سرفراز قومی پریس، لکھنؤ	1975ء
6	اقتدار حسین خان ڈاکٹر	لسانیات کے بنیادی اصول	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	1985ء

7	اکبر علی بیگ مرزا ڈاکٹر محمد علی اثر ڈاکٹر (مرتبین)	نظیر شناسی	ادارۂ شعر و حکمت حیدر آباد	1988ء
8	اکبر علی بیگ مرزا پروفیسر	نفوس گرامی	ادارۂ شعر و حکمت حیدر آباد	دسمبر 2003ء
9	بدیع الزماں خاورؔ	خوشبو	نقش کوکن پبلی کیشن ٹرسٹ ممبئی	اگست 1974ء
10	بدیع الزماں خاورؔ	مراٹھی رنگ	موڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی	اپریل 1985ء
11	پرویز باغی (مرتب)	کوکن کا مغنی	موڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی	1984ء
12	ٹی۔آر۔رینا ڈاکٹر	ادبی اور تحقیقی مضامین	اردو بک ریویو۔دہلی	مارچ 2013ء
13	ٹی۔آر۔رینا ڈاکٹر (مرتب)	رشید حسن خان کے خطوط (جلد دوم)	اپلائڈ بکس دہلی	نومبر 2015ء
14	ٹی۔آر۔رینا ڈاکٹر (مرتب)	رشید احمد خان محقق اور مدون	اپلائڈ بکس دہلی	نومبر 2015ء

15	جمیل جالبی ڈاکٹر	تاریخ ادب اردو (جلد سوم)	اپلائڈ بکس دہلی	ایڈیشن سوم 2014ء
16	حبیب خان ایم	انشاءاللہ خان انشآء	ساہتیہ اکادمی دہلی	دوسرا ایڈیشن 1996ء
17	حبیب نثار ڈاکٹر	پنڈت سیتو مادھوراؤ پگڑی مورخ وادیب	شعبہ اردو یونی ورسٹی آف حیدر آباد	فروری 2007ء
18	خلیل احمد بیگ مرزا ڈاکٹر (مرتب)	نذرِ مسعود	بیکن بکس گلگشت، ملتان	1990ء
19	خلیل احمد بیگ مرزا پروفیسر (مرتب)	اردو زبان کی تاریخ	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	ایڈیشن دوم 2000ء
20	خلیل احمد بیگ مرزا پروفیسر	ایک بھاشا جو مسترد کر دی گئی	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	2007ء
21	داؤد غازی	وقت کی صدیاں	کوکن اردو رائٹرز گلڈ	1970ء
22	ڈیوڈ کرسٹل	لسانیات کیا ہے؟	ترقی اردو بیورو، دہلی	1988ء
23	رام لعل نابھوی	چکبست	ترقی اردو بیورو، دہلی	2000ء
24	رفعت سروش	ادب شناسی	رضا لائبریری، رامپور پٹنہ	2007ء

25	رفعت سروش	حرف حرف بمبئی	رضا لائبریری، رامپور پٹنہ	2008ء
26	رفیق عابد زاہدی	نہہ سپہر (ترجمہ)	مکتبہ جامعہ نئی دہلی	1979ء
27	ریاست علی تاج	سید نجیب اشرف ندوی شخصیت اور کارنامے	مکتبہ شعر و حکمت حیدر آباد	1981ء
28	سرسوتی سرن کیف	چکبست	ساہتیہ اکادمی، دہلی	دوسرا ایڈیشن 1994ء
29	سید سلیمان حسین (مرتب)	رانی کیتکی کی کہانی	نظامی پریس، لکھنؤ	1975ء
30	سید عبداللہ ڈاکٹر	ولی سے اقبال تک	چمن بک ڈپو	1958ء
31	سید عبداللہ ڈاکٹر	مباحث	مجلس ترقی ادب، لاہور	1965ء
32	سیدہ جعفر ڈاکٹر	من سمجھاون	انتخاب پریس حیدر آباد	1963ء
33	سیدہ وارثی ڈاکٹر	مطالعہ مثنویات مصحفی	تخلیق کار پبلیشرز، دہلی	1995ء
34	شاہد عمادی	نقوشِ رفتہ	میسرس امپریشن پرنٹ ہاؤس، لکھنؤ	2011ء
35	شاہد عمادی	سرودِ رفتہ	نعمانی آفسیٹ پریس، لکھنؤ	2017ء
36	شمس الرحمٰن فاروقی	صورت و معنیِ سخن	ایم آر پبلی کیشنز دہلی	2010ء

37	شمیم جہاں۔حسینی شاہد ڈاکٹر (مرتبین)	نذرِ حبیب	انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش	2001ء
38	شوکت سبزواری	اردو لسانیات	ایجوکیشنل پبلیشنگ ،علی گڑھ	2010ء
39	صاحب علی پروفیسر	ممبئی کے ساہتیہ اکادمی انعام یافتگان شاعر،ادیب اور مترجم	ممبئی یونی ورسٹی،ممبئی	2013ء
40	عابد پیشاوری	انشاءاللہ خان انشاء	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ	1985ء
41	عارف اقبال محمد (مرتب)	ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کے تبصرے	اپلائڈ بکس،دہلی	2011ء
42	عبادت بریلوی	مقدمات عبدالحق	اعتقاد پبلیشنگ ہاؤس دہلی	1975ء
43	عبدالحق مولوی، امتیاز علی عرشی،سید قدرت نقوی (مرتبین)	کہانی رانی کیتکی اور کنوار اودے بھان کی	انجمن ترقی اردو۔پاکستان	تیسرا ایڈیشن 1975ء
44	عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی مولانا	شاہ وجیہ الدین علوی، گجراتی احوال و آثار	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ،ممبئی	2015ء

45	عبدالستاردلوی	انتخاب کلام مصحفی (مرتبہ)	جدید کتاب گھر۔دہلی	1960ء
46	عبدالستاردلوی	انتخاب کلامِ چکبست (مرتبہ)	عارف پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	1960ء
47	عبدالستاردلوی	من سمجھاون (مرتبہ)	اردومرکز،ممبئ	1965ء
48	عبدالستاردلوی	اردو میں لسانیاتی تحقیق (مرتبہ)	کوکل اینڈ کمپنی،ممبئ	1971ء
49	عبدالستاردلوی	رانی کیتکی کی کہانی (مرتبہ)	مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹراور لائبریری	1974ء
50	عبدالستاردلوی	امرت بانی (مرتبہ)	مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹراور لائبریری	1975ء
51	عبدالستاردلوی	گھر آنگن (مرتبہ)	مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹراور لائبریری	1976ء
52	عبدالستاردلوی	ادبی ولسانی تحقیق اصول اور طریق کار (مرتبہ)	ممبئ یونی ورسٹی،ممبئ	1984ء
53	عبدالستاردلوی	ساوتری (ترجمہ)	ممبئ یونی ورسٹی،ممبئ	1986ء

54	عبدالستار دلوی	نئی تحریریں	موڈرن پبلی شنگ ہاؤس دہلی	1986ء
55	عبدالستار دلوی	رن آنگن (ترجمہ)	ممبئی یونی ورسٹی، ممبئی	1987ء
56	عبدالستار دلوی	دکنی اردو (مرتبہ)	ممبئی یونی ورسٹی، ممبئی	1987ء
57	عبدالستار دلوی	اولوکتا (ترجمہ)	ممبئی یونی ورسٹی، ممبئی	1988ء
58	عبدالستار دلوی	تصحیح اور تحقیق متن	ممبئی یونی ورسٹی، ممبئی	1988ء
59	عبدالستار دلوی	اردو زبان اور سماجی سیاق	قلم پبلی کیشنز، ممبئی	1992ء
60	عبدالستار دلوی	کرشن چندر۔شخص اور ادیب (مرتبہ)	ممبئی یونی ورسٹی، ممبئی	1993ء
61	عبدالستار دلوی	اقبال شاعر اور سیاست داں (ترجمہ)	انجمن ترقی اردو ہند، دہلی	1995ء
62	عبدالستار دلوی	ذکرِ ایڈنبرا (ترجمہ)	قلم پبلی کیشنز ممبئی	1998ء
63	عبدالستار دلوی	پونے کے مسلمان (تاریخی، تہذیبی اور ادبی مطالعہ)	حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ، پونے	2001ء

64	عبدالستار دلوی	علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)	حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ، پونے	2002ء
65	عبدالستار دلوی	جنوبی ہند میں اردو زبان وادب کی تدریس کے مسائل	دکن مسلم ایجوکیشن اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، پونے	2004ء
66	عبدالستار دلوی	اسماعیل یوسف کالج، ممبئی اور ہندوستان میں مشرقی علوم۔۔۔	دائرۃ الادب، ممبئی	2004ء
67	عبدالستار دلوی	کوکن، کوکنی مسلمان اور اردو	غزالی ٹائپ سٹرس اینڈ پرنٹرس	2004ء
68	عبدالستار دلوی	اقبال کا ایک ممدوح عظیم سنسکرت شاعر اور مفکر بھرتری ہری	دائرۃ الادب، ممبئی	2004ء
69	عبدالستار دلوی	حضرت مخدوم علی مہائمی (مرتبہ)	پیر مخدوم صاحب چیریٹیبل ٹرسٹ ماہم، ممبئی	2007ء

70	عبدالستاردلوی	اقبال اور بمبئی	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی	2012ء
71	عبدالستاردلوی	مقالات پروفیسر نجیب اشرف ندوی (مرتبہ)	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی	2013ء
72	عبدالستاردلوی	مہاتما گاندھی، اردو اقبال اور دوسرے مضامین	ہندوستانی پرچار سبھا، ممبئی	2013ء
73	عبدالستاردلوی	مقالات پروفیسر محمد ابراہیم ڈار (مرتبہ)	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی	2014ء
74	عبدالستاردلوی	مبادیاتِ تحقیق (مرتبہ)	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی	2014ء
75	عبدالستاردلوی	اردو میں لسانی تحقیق (دوسرا ایڈیشن) (مرتبہ)	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	2015ء
76	عبدالستاردلوی	مولانا ابوالکلام آزاد: ایک مطالعہ	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	2015ء
77	عبدالسلام خورشید	فن صحافت	مکتبہ کارواں۔لاہور	1966ء

78	عبدالقادر سروری پروفیسر	زبان اور علم زبان	مجلس تحقیقات اردو، حیدر آباد	1970ء
79	عزیز جنگ ولاؔ	تاریخ النوائط	ولا اکیڈمی حیدر آباد	دوسرا ایڈیشن 1976ء
80	عسکری صفدر	دکنی ادب کے محققین ومحسنین	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی	2012ء
81	علی رفاد فتیحی	اردو لسانیات	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	2013ء
82	فراق گورکھپوری	انداز ے	ادارہ انیس اردو، آلہ آباد	1959ء
83	قاضی عبدالقادر ڈاکٹر	تصنیف وتحقیق کے اصول	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	1992ء
84	قمر رئیس ڈاکٹر	ترجمہ کا فن اور روایت (مرتبہ)	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	دوسرا ایڈیشن 2004ء
85	گیان چند جین پروفیسر	ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	2007ء
86	محمد احسن فاروقی ڈاکٹر	فریب نظر	مکتبہ اسلوب، کراچی	1963ء

87	محمد ایوب واقف	جگن ناتھ آزاد۔ایک مطالعہ (مرتبہ)	ثمر آفسیٹ پرنٹرس۔دہلی	1988ء
88	محمد علی اثر ڈاکٹر	دکن میں اردو شاعری وؔلی سے پہلے	ادارے ادبیات اردو، حیدر آباد	2004ء
89	محمد علی اثر ڈاکٹر	تحقیقاتِ اثر	نشاط پبلیشر ز،حیدر آباد	2005ء
90	محی الدین قادرزور	ہندوستانی لسانیات	ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ	2011ء
91	مزمل سرکھوت ڈاکٹر	آغا حشر کاشمیری اور ممبئ کا پارسی اردو تھیٹر	شاہد پبلی کیشنز، دہلی	2015ء
92	مسعود حسین خان پروفیسر	مقدمہ تاریخ زبان اردو	ایجوکیشنل پبلی شنگ ہاوس دہلی	بارھویں ایڈیشن 2008ء
93	مظہر مہدی ڈاکٹر	اعتراف	ایجوکیشنل پبلی شنگ ہاوس دہلی	1998ء
94	معزہ قاضی دلوی ڈاکٹر	ڈاکٹر میمونہ دلوی:اعتراف خدمات اور منتخب مضامین	اردو چینل پبلی کیشنز ممبئ	2011ء

95	میمونہ دلوی ڈاکٹر	بمبئی میں اردو 1914ء تک	آج پریس، جیراج بھائی لین، بمبئی	1970ء
96	یحییٰ نشیط ڈاکٹر	اردو مراٹھی کے باہمی روابط	یونیٹی پرنٹرس، ممبئی	2004ء
97	یعقوب راہی	مراٹھی شاعری کے اردو تراجم	تکمیل پبلی کیشنز، ممبئی	2004ء
98	یعقوب عامر ڈاکٹر	اردو کے ادبی معرکے انشاء سے غالب تک	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	2002ء
99	یونس اگاسکر	مراٹھی ادب کا مطالعہ	نقش کوکن پبلی کیشن ٹرسٹ، ممبئی	1976ء
100		فرہنگ اصطلاحات لسانی (انگریزی سے اردو)	ترقی اردو بیورو، نئی دہلی	1987ء

رسائل

سلسلہ نمبر	رسالہ	ماہ وسال	مضمون اور مضمون نگار
1	آج کل	یکم اپریل۔1949ء	سر تیج بہادر سپرو از خواجہ احمد فاروقی
2	آج کل	اگست۔1985ء	پسائندان، مترجم: عبدالستار دلوی
3	آج کل	اگست۔1988ء	دکنی اردو (تبصرہ)، مبصر، مرزا خلیل بیگ
4	آج کل	جون۔1999ء	مراٹھی نظمیں، مترجم، عبدالستار دلوی
5	آج کل	دسمبر۔2000ء	دلت ادب: اردو تراجم، از عبدالستار دلوی
6	آج کل	اگست۔2001ء	ہند و مصر کے تعلقات اور اردو، از عبدالستار دلوی
7	آج کل	مئی۔2003ء	رانی کیتکی کی کہانی افعال کی زبانی از ڈاکٹر مولا بخش
8	اثبات	شمارہ۔3,4	اردو ترجمہ: آداب و مسائل۔ایک مکالمہ (مباحثہ)
9	اثبات	شمارہ۔6, 5	تحقیقی تنگ نظری اور توصیف باہمی، از عبدالستار دلوی

10	ادب وثقافت	ستمبر۔2015ء	سر تیج بہادر سپرو، اردو اور قومی زبان کا مسئلہ از: عبدالستار دلوی
11	ادب وثقافت	مارچ۔2018ء	دکنی شاعری میں عشقِ رسولؐ، از عبدا ستار دلوی (Add
12	ادب وثقافت	ستمبر۔2016ء	مولانا آزاد کی فکر کے چند تکثیری زاویے از: عبدالستار دلوی
13	ادب وثقافت	ستمبر۔2016	اردو کے مسائل: تاریخ کی روشنی میں از مظفر شہ میری
14	اردو بک ریویو	اپریل، مئی جون 2014ء	مقالات پروفیسر نجیب اشرف ندوی (تبصرہ) مبصر، ڈاکٹر محمود حسن
15	اردو دنیا	اپریل ۔2000ء	ایک لسانی مرکز کا حصول، مترجم: عبدالستار دلوی
16	اردو دنیا	جنوری۔2001ء	اردو میں اعلیٰ تعلیم مسائل اور حل، از عبدالستار دلوی
17	اردو دنیا	فروری۔2004ء	ممبئی کی اردو۔ ایک لسانی مطالعہ، از عبدالستار دلوی
18	اردو دنیا	مارچ۔2007ء	جدید تعلیم عصری ضرورتیں اور اردو، از عبدالستار دلوی
19	اردو دنیا	فروری۔2012ء	گھر آنگن کا شاعر: جانثار اختر از خدیجہ آئین
20	اردو دنیا	گسٹ۔2013ء	اقبال اور بمبئی (تبصرہ) مبصر پروفیسر ظفر الدین
21	اردو دنیا	ستمبر۔2013ء	عبدالماجد دریا آبادی، از عبدالستار دلوی
22	اردو دنیا	نومبر۔2013ء	اعزاز و اکرام: خبر (نیوز)

عبدالستار دلوی سے ایک ملاقات (مراٹھی۔نندنی آتم سدھ) اردو مترجم: مزمل سرکھوت	نومبر۔2017ء	اردو دنیا	23
اردو آوازیں، از عبدالستار دلوی	جنوری۔1968ء	اردونامہ	24
بیرسٹر، مترجم: عبدالستار دلوی	شمارہ۔20	امکان	25
مہاراشٹر کی تہذیبی زندگی اور اردو شاعری، پریم چند کا قیام ممبئی، از: عبدالستار دلوی	شمارہ۔21	امکان	26
عبدالستار دلوی سے مکالمہ، مکالمہ نگار ڈاکٹر راشد عزیز	جون۔2011ء	ایوان اردو	27
پروفیسر احتشام حسین: یادوں کے نگار، از: عبدالستار دلوی	جولائی۔2012ء	ایوان اردو	28
قمر رئیس لوک ادب اور ترجمے، از: عبدالستار دلوی	دسمبر۔2012ء	ایوان اردو	29
مہاتما گاندھی: سماجی ولسانی انصاف، از: عبدالستار دلوی	مارچ۔2013ء	ایوان اردو	30
مقالات پروفیسر محمد ابراہیم ڈار (تبصرہ)، مبصر حسن مثنیٰ	اکٹوبر۔2014ء	ایوان اردو	31
نظیر اکبرآبادی: ایک روشن فکر عوامی شاعر از: عبدالستار دلوی	نومبر۔2015ء	ایوان اردو	32
دو زبانیں دو ادب (تبصرہ)، مبصر: عبدالاحد ساز	جنوری۔2008ء	تحریرِ نو	33
بنگالی ادب کے اردو تراجم اور ٹیگور شناسی از: عبدالستار دلوی	مئی۔2016ء	تحریرِ نو	34
گھر آنگن کی ہندوستانی عورتیں از: سید عبدالستار	مئی۔1989ء	سب رس	35

36	سب رس	اکتوبر۔1998ء	گوشہ عبدالستار دلوی
37	سب رس	اپریل۔2004ء	پونے کے مسلمان (تبصرہ)، مبصر: سلیمان اطہر جاوید
38	سب رس	اگست۔2004ء	اردو شاعری میں شخصی مرثیوں کی روایت اور جگن ناتھ آزاد از: عبدالستار دلوی
39	سب رس	جنوری۔2006ء	کوکن کا سکتب یا سبکتگین، از: اسلم مرزا
40	سب رس	فروری۔2006ء	عصری دکنی کی چند لسانی خصوصیات، از: ڈاکٹر مظفر شہ میری
41	سب رس	مئی۔2012ء	نورانی باجی، از: عبدالستار دلوی
42	سب رس	نومبر۔2012ء	ڈاکٹر عبدالستار دلوی کی علمی ادبی و فلاحی سرگرمیاں، از: نورالسعید اختر
43	سب رس	مارچ۔2015ء	طالب خوندمیری: اردو طنز و مزاح کا خوش فکر شاعر، از: عبدالستار دلوی
44	سب رس	اپریل۔2015ء	معین احسن جذبی کی ایک غیر مطبوعہ نظم، از: عبدالستار دلوی
45	سب رس	ستمبر۔2017ء	ترجمہ کی لسانی و تہذیبی معنویت، از: عبدالستار دلوی
46	شاعر	گاندھی نمبر۔ 1969ء	ہندوستان کا لسانی مسئلہ اور گاندھی جی
47	شاعر	قومی یکجہتی نمبر۔ 1974ء	ہندوستان کے لیے لسانی یکجہتی کا تصور، از: عبدالستار دلوی

48	شاعر	فروری۔2012ء	گلِ نا آشنا،از:عبدالستار دلوی
49	شعروحکمت	دورِدوم، کتاب۔1	نسیم ایزکیل۔ایک تعارف،ازعبدالستار دلوی
50	شگوفہ	جون۔2004ء	یوسف ناظم کا سفر نامہ امریکہ،ازعبدالستار دلوی
51	شگوفہ	جون۔2004ء	یک نہ شددوشد،از یوسف ناظم
52	شگوفہ	جون۔2017ء	حمایت بھائی حیدرآباد کی رونق
53	فکرونظر	جون۔2014ء	پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی،ازعبدالستار دلوی
54	فکرونظر	دسمبر۔2015ء	جدید قومی تہذیب میں اردو کی اہمیت،ازعبدالستار دلوی
55	فن اور شخصیت	مارچ۔1976ء	گھر آنگن۔ایک مطالعہ، ازعبدالستار دلوی
56	فن اور شخصیت	مارچ۔1976ء	گھر آنگن کا شاعر،از ڈاکٹر نریش
57	قلم	خصوصی کتاب۔ 8-7-6	انتہا(ترجمہ)مترجم،عبدالستار دلوی
58	کتاب نما	اگست۔1983ء	اردو میں لسانی آداب،ازعبدالستار دلوی
59	کتاب نما	فروری 1985ء	سات روپے دس آنے(ترجمہ)،مترجم ،عبدالستار دلوی
60	کتاب نما	ستمبر۔1985ء	تشنگی(ترجمہ)،مترجم،عبدالستار دلوی

61	کتاب نما	مئی ۔1987ء	اردو اور ہندی تاریخی اور لسانی تناظر میں ،از،عبدالستار دلوی
62	کتاب نما	اپریل ۔1988ء	لسانی ترسیل اور قومی یکجہتی ،از،عبدالستار دلوی
63	کتاب نما	اپریل ۔1989ء	ٹھہری نہیں یہ رات ذرا بھی (ترجمہ) مترجم،عبدالستار دلوی
64	کتاب نما	اپریل ۔1989ء	رن آنگن (تبصرہ)،مبصر،سلام بن رزاق
65	کتاب نما	نومبر ۔1994ء	اردو یونی ورسٹی کیوں اور کیسے،از،عبدالستار دلوی
66	کتاب نما	فروری ۔1996ء	پروفیسر نجیب اشرف مرحوم،از،عبدالستار دلوی
67	کتاب نما	جولائی ۔1997ء	ممبئی یونی ورسٹی کی نذر،از،عبدالستار دلوی
68	کتاب نما	نومبر ۔1998ء	ڈاکٹر عالی جعفری ۔ایک عالی مرتبت استاد اور عالم، از, عبدالستار دلوی
69	کتاب نما	جولائی ۔1999ء	نو آبادیاتی ہندوستانی انگریزی ادب ،از،عبدالستار دلوی
70	کتاب نما	فروری ۔2001ء	روز وشب گزر گئے،از،عبدالستار دلوی
71	کتاب نما	نومبر ۔2001ء	اردو یونی ورسٹی،فروغ اور اعلیٰ تعلیم ،از،عبدالستار دلوی
72	کتاب نما	جنوری ۔2003ء	سردار جعفری اور قومی شعور،از،عبدالستار دلوی
73	کتاب نما	جنوری ۔2006ء	جنوب ایشیائی اتحاد اور اردو زبان،از،عبدالستار دلوی

74	کتاب نما	فروری۔2006ء	پروفیسر عبدالستار دلوی (شخصیت اور ادبی کارنامے) خصوصی شمارہ
75	کتاب نما	ستمبر۔2012ء	میرؔ کی غزل: جلال و جمال کی شاعری، از، عبدالستار دلوی
76	کتاب نما	مارچ۔2014ء	اقبال اور بمبئی (تبصرہ)، مبصر، عزیز احمد
77	نوائے ادب	جنوری۔1965ء	مناجاتِ بدرگاہِ قاضی الحاجات در مدح حضرت شاہ عالمؒ، از عبدالستار دلوی
78	نوائے ادب	جولائی۔1971ء	کربل کتھا کا لسانی مطالعہ (تبصرہ)، مبصر، عبدالستار دلوی
79	نوائے ادب	اپریل تا ستمبر 2007ء	دو زبانیں دو ادب (تبصرہ)، مبصر سیدہ جعفر
80	نوائے ادب	اکتوبر تا مارچ 2008ء	دکنی قدیم اردو یا بولی، از، عبدالستار دلوی
81	نوائے ادب	اپریل تا ستمبر۔ 2008ء	مہاتما گاندھی، اردو اور اقبال، از، عبدالستار دلوی
82	نوائے ادب	اکتوبر 2008ء تا مارچ 2009ء	پریم چند اردو یا ہندی ادیب، از، عبدالستار دلوی
83	نوائے ادب	اکتوبر تا مارچ 2011ء	بمبئی کے قدیم کتب خانے اور کریمی لائبریری، از، عبدالستار دلوی
84	نوائے ادب	مارچ۔2014ء	اردو کی عامیانہ زبان، از، عبدالستار دلوی

85	نوائے ادب	اپریل تا ستمبر۔ 2015ء	جدید تعلیم عصری معنویت اردو، اردو میں اعلیٰ تعلیم، احمد سیلر ہائی اسکول کی یادیں، از، عبدالستار دلوی
86	نوائے ادب	اکتوبر 2016 ء تا مارچ 2017ء	مقالاتِ پروفیسر نجیب اشرف ندوی کا تجزیاتی مطالعہ، مبصر، ڈاکٹر ارمان نجمی
87	نئی کتاب	اپریل تا جون۔ 2011ء	امیر خسرؔو، ہندوی اور عوامی شاعری، از، عبدالستار دلوی
88	نئی کتاب	اپریل تا ستمبر۔2012ء	اقبال اور عطیہ بیگم فیضی، از، عبدالستار دلوی
89	نئی کتاب	اکتوبر تا دسمبر۔ 2012ء	مطالعہ اقبال اور عطیہ بیگم فیضی، از، عبدالستار دلوی
90	ہندوستانی زبان	اکتوبر تا دسمبر۔ 2001ء	گاندھی جی کی تعلیمات اور عصری معنویت، از: عبدالستار دلوی

اخبارات

سلسلہ نمبر	اخبار کا نام	مقام	تاریخ اور مہینہ	سال
1	اعتماد	حیدرآباد	22/اکٹوبر	2007ء
2	انقلاب	ممبئی	10/اکٹوبر	1996ء
3	سیاست	حیدرآباد	8/دسمبر	2007ء
4	ممبئی اردو نیوز	ممبئی	23/اپریل	2017ء
5	منصف	حیدرآباد	21/اکٹوبر	2001ء
6	منصف	حیدرآباد	13/جون	2013ء
7	منصف	حیدرآباد	17/مارچ	2016ء
8	ہماری زبان	نئی دہلی	15/اپریل	1994ء

غیر مطبوعہ مقالات، مضامین اور خطوط

سلسلہ نمبر	مصنف	عنوان	
1	عبدالستار دلوی	میری کوکن کی یادیں (مضمون)	
2	عبدالستار دلوی	خاندان ''دلوی'' پر ایک نظر (مضمون)	
3	عبدالستار دلوی	شعبہ اردو بمبئی یونی ورسٹی کے قیام کے دس سال، درس وتدریس اور علم وادب کی خدمت کا ایک دور (مضمون)	
4	محمد انور احمد خان	ڈاکٹر عبدالستار دلوی شخصیت اور ادبی خدمات (مقالہ)	یونی ورسٹی آف حیدرآباد (1997-1999)
5		مشاہیرین کے خطوط بنام پروفیسر عبدالستار دلوی	

پروفیسر عبدالستار دلوی سے شخصی انٹرویو

سلسلہ نمبر	تاریخ، ماہ وسال	مقام	وقت
1	30/جنوری2014 جمعرات	SJB Guest House HCU	11 تا12 بجے صبح
2	27/فروری 2014 منگل	VIP Guest House MANUU	11 تا12 بجے صبح
3	27/مئی2014 منگل	VIP Guest House MANUU	5 تا6 بجے شام
4	20/اکٹوبر2014 پیر	VIP Guest House MANUU	3 تا5 بجے شام
5	10/اپریل2015 جمعہ	VIP Guest House MANUU	10 تا12 بجے صبح
6	15/ستمبر2015 منگل	VIP Guest House MANUU	1 تا2 بجے دوپہر
7	24/جنوری 2016 اتوار	VIP Guest House MANUU	2 تا3 بجے دوپہر
8	6/مارچ2016 اتوار	VIP Guest House MANUU	2 تا3 بجے دوپہر
9	9/مارچ2016 چہارشنبہ	VIP Guest House MANUU	10 تا12 بجے دوپہر

11:30 تا 1 بجے دوپہر	VIP Guest House MANUU	8/نومبر 2016 منگل	10
4 تا 5 بجے شام	VIP Guest House MANUU	6/مارچ 2017 پیر	11
5 تا 6 بجے شام	VIP Guest House MANUU	18 اکتوبر 2017 چہارشنبہ	12
12 تا 2 بجے دوپہر	VIP Guest House MANUU	1/مارچ 2018 جمعرات	13
10 تا 11:30 بجے صبح	VIP Guest House MANUU	7/مئی 2018 پیر	14

ویب سائٹس websites

1-https://www.rekhta.org.

2-https://www.bl.uk>histcitizen>trading>history.

Testimonial

Abdussattar daliv's testimonial given by Setu Madhav Rao Pagdi on dated 27 july 1981.

oOo